کلیاتِ مصحفی

جلد پنجم

مشتمل بر

دیوانِ پنجم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

پروفیسر نور الحسن نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک-۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Mus'hafi, Vol. V
by
Ghulam Hamdani Mus'hafi
Edited by: **Prof. Noorul Hasan Naqvi**

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلا ایڈیشن	:	500
سنہ اشاعت	:	مارچ، 2006 شک 1927
قیمت	:	-/205 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1249

ISBN : 7587-135-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای-میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع:

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کما حقہ، واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں سے لے کر عہد جدید کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہلِ فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الواسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ غلام ہمدانی مصحفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کررہی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ایس۔ موہن
ڈائرکٹر انچارج

فہرست

(غزلیات)

شمار غزل	شمار صفحہ
☆ پیش لفظ	3
☆ فہرست	5
☆ حرف آغاز	13
☆ نگارخانۂ رقصاں (سید حامد) مصحفی کی شاعری پر ایک نظر	19
ردیف الف	
1 لب ہر برگِ گل پھر کیا کرے دعویٰ تکلّم کا	63
2 ہمیں بھی جان سے ہاتھ اپنے اے نازک بدن دھونا	64
3 ہمیں یاں اشکِ گرم اپنے سے رخسار و ذقن دھونا	64
4 جا کر کنویں میں کس دن میں خستہ حال ڈوبا	65
5 نون کی جانہ اس نے کیوں واو و قاف رکھ دیا	65
6 غوغا ترانہ مرغِ گرفتار کم ہوا	66
7 اک حیا دار پہ میں عشق حیا دار کیا	66
8 شمع کی گرمی سے لگن جل گیا	67
9 ہم نے شبِ فراق میں چاہا سو کر لیا	67
10 بنیاد سپہر میں خلل تھا	68
11 پانی میں جر سے جیسے کہ برسات کا کیڑا	69
12 یا ترے وصل کے لائق یہ گنہگار نہ تھا	69
13 ابرو ہے یا کنارا، میں کچھ نہیں سمجھتا	70
14 پردہ تو کوئی سازِ خیالی کا بجاتا	70

شمار غزل	شمار صفحہ
15 وہ مجنب دبے دماغی اور وہ تکبر اس کا	71
16 کر رہ گزر میں تری ہو کے لخت لخت گرا	71
17 گل کے پتے گئے جھڑ پر نہ ذرا رنگ گرا	72
18 سر پہ اک ماہ نے بجلی کا دیا سنگ گرا	72
19 بو باس کسی گل کی جاتے ہی اُڑا جاتا	73
20 دو نظروں میں اس کو مار رکھا	73
21 یہ اسیر تازہ اک تازہ الم میں جا پھنسا	74
22 زیر لب پھر اس نگارِ سیم بر نے کیا کہا	75
23 سن مرا احوال پھر اس بے خبر نے کیا کہا	75
24 مصحفی خوب ہوا بد نظری سے چھوٹا	76
25 نگاہِ خشم سے ہوتا ہے زہرہ آب آتش کا	76
26 ہائے رے چشمِ شرمگیں کی ادا	·77
27 محبت میں یہ صدمے ہو دیں گے میں کیا سمجھتا تھا	77
28 جی ہی جاتا ہے چلا تیری ادا پر میرا	78
29 جب خوشۂ انگور بنیں آبلۂ پا	78
30 تب آوے نظر ہمرہی قافلۂ پا	79
31 لے کر میں بوسۂ لب جاناں خجل ہوا	79
32 زندانیِ الفت کا زنداں ہی میں دم نکلا	80
33 کرے ہے شعلے کو جوں خار و خس تہ و بالا	81
34 چپکے ہی چپکے غرض کام کیا عاشق کا	81

35 آخر ہوا مجنوں کا کفن دامنِ صحرا 82
36 رہ دورِ چشمِ تر سے مری، آستیں ذرا 82
37 پھر ہوں نہ طائرانِ خوش آہنگ سے جدا 83
38 ہو کاش مرغِ جاں قفسِ تنگ سے جدا 83
39 کتنے ہیں ہم بھی دانش و فرہنگ سے جدا 84
40 اس دل کے تئیں ہرگز آرام نہیں ہوتا 84
41 یاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ ناکام گم ہوا 85
42 خوش آئی یہ مجنوں کو بن کی فضا 85
43 عاشق کے تکتے ہی وہ بدن سے نکل گیا 86
44 ''من مردم آہ'' میرے دہن سے نکل گیا 86
45 ہم تم کو دکھا دیں گے پھیلاؤ طبیعت کا 87
46 ہم سے یہ بارِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا 87
47 شب دستِ صد تپش میں گریبان برق تھا 88
48 سر پہ مرے تصورِ جولانِ برق تھا 89
49 بیٹھے تمھارے پاس کوئی دم تو کیا ہوا 89
50 خامہ مرے بناں میں پرِ جبرئیل تھا 90
51 دریا کے ہاتھ میں ہے دامانِ چشمِ تر کیا 91
52 یعنی ہے اس سخن سے ہر ایک کو خبر کیا 91
53 ہرگز نہ طبیعت کا تری جائے گا غصا 92
54 درد سخن سے ہو جو نہ بے درد آشنا 92
55 مجنوں سا اور نہ چاک گریباں ہے دوسرا 93
56 ہے طارمِ خضرا میں یہ انگور کا خوشا 93
57 خاک ہوتی ہے غریبوں کی پریشان ہوا 94
58 تو کہاں، خانہ کہاں، ہوگئی جب جان ہوا 94
59 تو نے تو مجھ کو، اے فلک، خاک ہی میں ملا دیا 95
60 یہ وجہ ہے سرما میں جو رخ زرد ہے اپنا 96
61 رہا پھر دیکھ کر اس کو نہ اپنے ہوش میں دریا 96
62 تو قطرہ ہو سما جاوے صدف کے گوش میں دریا 97
63 ہم سے تو غمِ عشق، نہاں ہو نہیں سکتا 98
64 مرغانِ باغ چھوڑ گئے آشیاں کو کیا 98
65 یارانِ رفتہ بھول گئے ہمرہاں کو کیا 99
66 مدام اس بت نے سنگ و خشت ہی پر تیر کو توڑا 99
67 احوال زبوں ہے یاں آپھی دلِ پُر خوں کا 100

ردیف ب

68 پر نہ آنکھوں سے گئی گرمیِ بیداریِ شب 101
69 آشیاں پھینکے گئے ہیں چمن آباد ہیں سب 101
70 شہیدِ تیغ نگہ سب ہوئے بہشت نصیب 102
71 سمجھے ہیں اس کو ہم خطِ تقدیرِ موجِ آب 102
72 خوباں کا خیال تو نہ کر اب 103

ردیف پ

73 تا سحر میں نہ رہا نالہ و فریاد سے چپ 104
74 جز نامِ صنم اور تو کسی نام کو مت جپ 104
75 مانندِ موج کیوں کے نہ ہو بے قرار سانپ 105

ردیف ت

76 کیا نالے کر رہا تھا کوئی دردمند رات 105
77 انجام یہ رکھے ہے جہانِ بلند و پست 106
78 نت اپنا سینہ و سر پر ہی دست ہے دن رات 106
79 منھ پہ منھ رکھنے کے کیا کیا نہ مزے لوٹے رات 107

ردیف ٹ

80 لاشے کو کر دیا ہے مرے اُس نے بارہ باٹ 107
81 مطرب بجے آتا ہے نظر تو مجھے نت کھٹ 108
82 اور زلف نے سوادِ حبش کی زمیں اُلٹ 108
83 ہر دم نہ میرے قتل کو تو آستیں اُلٹ 109

ردیف ث

84 میں بھی تا صبح رکھی بلبلِ گلزار سے بحث 109
85 کیوں ہاتھ میں پھر اس کے تلوار ہے کیا باعث 110

ردیف ج

86 کہ سیلِ خون ہے آنکھوں سے میری جاری آج 111
87 ٘ر چلتا ہے یہ موذی نت بسانِ مارِ کج 111
88 پھر میں ہے ساز دلوا آہ ہوا زمزمہ سنج 112
89 ہم گرد ہیں فشاندۂ دامانِ تخت و تاج 112

ردیف چ

90 جو دخترِ رز تیرے تئیں کہتے ہیں سب پانچ 113
91 آگ تلووں سے لگی سرو کے گلزار کے بیچ 113
92 رکھنے دیا نہ پانوں ادب نے گلشن کے بیچ 114

ردیف ح

93 اُس نے جلا دیا ہے مرا آشیاں صریح 114
94 یارب تو شبِ وصل کو زنہار نہ کر صبح 115

ردیف خ

95 وہ نخل خشک ہوں میں معرا ہے برگ و شاخ 116
96 اس رنگ پر نہیں کسی نخلِ چمن کی شاخ 116
97 کافی ہے قبرِ قیس پہ بس اک ہرن کی شاخ 117
98 ہے ہے جوں دیدۂ کبوتر سرخ 117
99 کرتی ہے برگِ گل کے تئیں جوں بہار سرخ 118

ردیف د

100 ہو نہ یارب یہ ترا خط سیہ فام سپید 118
101 دشمن کے تن سے نکلے ہے نوکِ سناں سپید 119
102 لاتا ہے اس کی نذر کو گل باغباں سپید 119
103 نہ پاوے جب کہ ملا یک بھی آدمی کا بھید 120
104 اور یاں آنکھیں سجائی ہیں کرزاری عید 120
105 ہو کیوں نہ راو لیلیٰ محمل سوار بند 121
106 سنے نہ اس کی کبھی گل کا گوش کر فریاد 122
107 جس کے آگے نہ ہوئی چادرِ مہتاب سپید 122
108 ہاتھ میں گل کے ہو دامانِ صبا میرے بعد 123
109 کیوں نہ ہو نالۂ بلبل سے گلستاں آباد 123

ردیف ذ

110 آگ بن جاوے ہے وہ دیکھ کے رنگیں کاغذ 124

ردیف ر

111 کھینچ دے پاس کوئی اس کے پری کی تصویر 125
112 یہ چشم تر کبھی نہ ہوئی آستیں سے دور 125
113 جوں برق جلوہ پہنچے ہے عرشِ بریں سے دور 126
114 مشکل ہے یہ ملال ہو طبعِ حزیں سے دور 126
115 خط بھی لکھا جو اس کو تو ہیہات مختصر 127
116 نہ تم ہو بدگماں ہم پر نہ ہم ہوں بدگماں تم پر 127
117 لگے نہ تیری کیوں دل میں اس کماں کی مر 128
118 سو جاوے ہے وہ خاک کو تن نذر پکڑ کر 128
119 بنتا گلِ عارض کو چمن نذر پکڑ کر 129
120 مر ہی جاؤں گا گلا کاٹ کے اک دن تجھ پر 129
121 لعنت ہے اس آہِ بے اثر پر 130
122 پانو میں اس غزال کے زنجیرِ وصل کر 130
123 جیسے فردِ تخلی کی ہووے پیشانی پہ مہر 131
124 متصل جوں ہوں پرِ طاؤسِ بستانی پہ مہر 132
125 عنقا ہو بھلا کیونکہ نہ تسخیر ہوا پر 132
126 ابرو جو ہلے، چل گئی شمشیر ہوا پر 133
127 جولا کھ گلے تھے تہِ شمشیر ہوا پر 133
128 دامن کا کسی سرو کی ہے گھیر ہوا پر 134
129 ہے آج کیا یہ لطف و نوازش غلام پر 134
130 کہ یاں رنگِ حنائے عیش ہے نایاب ناخن پر 135
131 چشم بینا ہو تو البتہ بہار آئے نظر 136
132 شانہ سوار ہے تری چوٹی کے ناگ پر 136
133 کب آوے ہے کوئی ہاں سچ ہے یہ فقیر کے گھر 137
134 وہ کام نہ کر ہووے جو مقدور سے باہر 137
135 بیٹھ کر کشتی میں ہم تم ہوں قدح زن آب پر 138
136 چھٹ گئی جو قطرہ افشانی کی چلمن آب پر 138
137 کافی ہے تجھ کو زلف کا اک دام دوش پر 139
138 یہ لے چلا چمن سے رو انجام دوش پر 140
139 شاخِ گل کھاوے ہے گل شعر کی رنگینی پر 140
140 ہووے یارب دلِ بیمار کا انجام بخیر 141
141 اس کو کیا غم ہوئے آزردہ اگر دل دو چار 141
142 اک طرف کھینچتے ہیں حسرتِ قاتل دو چار 142

ردیف ڑ

143 تو بھی اے آہ نہ طاقت دلِ سوزاں میں چھوڑ 142
144 سب کو چمن چمن قفسِ مرغِ خوش الحان نہیں چھوڑ 143

145 دیتا ہے گالیاں مجھے ہر لحظہ تان چھوڑ 144
146 ہم خاکیوں کا کچھ تو زمیں پر نشان چھوڑ 144

ردیف ز

147 سرمۂ تیرہ دروں کیونکہ ہوا محرم راز 145

ردیف س

148 چاہیے ہووے تو انا ناتوانوں کا لباس 145
149 تجمل کمال ہوئے جی میں آ کے میرے پاس 146
150 ہے بر میں مرے تنگ قبائے پر طاؤس 147
151 برسات کے موسم میں صفائے پر طاؤس 147

ردیف ش

152 جلاوے پھر نہ مجھ کو کیونکر آتش 148
153 چلکیں ہوئی جس سے چمنِ لالہ آتش 148
154 دی جس نے لگا لالۂ گلزار کو آتش 149
155 جاتا ہے آج ناقہ لیے سارباں خموش 150

ردیف ص

156 بالوں میں ان کے ہووے ہے مکنول کا خواص 150
157 جوں باغ میں کرتی ہے نسیمِ سحری رقص 151

ردیف ض

158 پھر ہووے کس طرح سے پذیرا کسی کی عرض 151
159 واں گرچہ روز لگتی ہے حور و پری کی عرض 152
160 کرتا ہے مسیحا کوئی بیمار سے اعراض 152

ردیف ط

161 کیا کر سکے بافسادِ اخلاط 153
162 طاق پہ شکر رکھا طرز شفیعا کا خط 153

ردیف ظ

163 گو سے وساقی ہوں حاضر ہاں میں حظ نے اس میں حظ 154

ردیف ع

164 دیکھا نہ خواب میں بھی کبھی ہم نے روئے شمع 155
165 جلے آتش میں تجھ سا نازنیں شمع 155
166 کیونکر نہ کہوں میں اسے تصویر مرقع 156

ردیف غ

167 مصحفی جو صاحب تقدیر ہیں عالی دماغ 157

ردیف ف

168 کیوں کے میں دیوانہ جاؤں پھر گلستاں کی طرف 157
169 فزوں کر دیا ہم نے سودائے یوسف 158

ردیف ق

170 لکھنے سے بھی آخر نہیں ہوتی رقمِ شوق 159
171 سر پہ میرے رہیو یارب سایۂ دیوارِ عشق 159

ردیف ک

172 یوں ہے کشتوں کے استخواں کی چمک 160
173 داغ دے جاتی ہے ہر سال بہار ایک نہ ایک 161
174 زلفوں کے ترے بال ہیں سنبل سے بھی نازک 161

ردیف گ

175 سچ جو پوچھے کوئی یہ تینوں ہیں آگ 162
176 یکبار رنگ اٹھی وہیں سرو و سمن کو آگ 162

ردیف ل

177 قاسمِ رزق چلے کیونکہ نہ شطرنج کی چال 163
178 رکھے ہے پاس ادب اے ستیزہ خو بسمل 163

ردیف م

179 جوں تنور اپنے مکاں کی در و دیوار ہے گرم 164
180 جیسے سنبل پہ پڑی ہووے چمن میں شبنم 165
181 تا ہوں چمنِ دہر میں خرم گل و شبنم 165
182 قابل ہے رفو کے تو نہ شائستۂ مرہم 166
183 ٹک آنکھ جھپکتے ہی پھر آئے نہ نظر ہم 167
184 بسمل تڑپ تڑپ کے ہوئے پیش و پس تمام 167
185 غرض دامِ وفا کے صید ہیں ہم 168

186 کچھ درد نہ تھا پر یونہی بیمار رہے ہم 168
187 آزاد ہیں پہ ہیں ترے زندانیوں میں ہم 169

ردیف ن

188 ہم لوگ وحشی خبطی دیوانے باولے ہیں 170
189 خاک کوچے کی ترے، اشک بہا دیتے ہیں 170
190 پہلے اغیار کو پہلو سے اُٹھا دیتے ہیں 171
191 ہوا پروانہ آخر جان سے مایوں شیشے میں 171
192 کہ پرچھائیں سی کچھ ہونے لگی محسوس شیشے میں 172
193 کرے ہے جس کی سرخی کا شفق پابوس شیشے میں 173
194 جس عضو سے گنہ ہوا اس کو جلا نہ دوں 174
195 معشوق تصور سے یکجائی ہے اور میں ہوں 174
196 نظر آتا ہے ہمیں سروِ چمن آئینے میں 175
197 یہاں سے ہم کو لے جا کر خدا جانے کہاں پھینکیں 175
198 کوچۂ یار کی آئی نہ ہوا راس ہمیں 176
199 جب اس کے شکل و شمائل سے بات کرتا ہوں 177
200 کہ تارِ قلم نے زبانیں نکالیں 177
201 یوں ہی عاشق کی ہے عذاب میں جان 178
202 یہی ہوتے ہیں کوئی دم کو بہ رخسار رواں 178
203 آئینہ ہے دو چار شب و روز ان دنوں 179
204 مرد کو اچھا نہیں رہنا وطن کی قید میں 180
205 عشق نے شکلیں یہ سب دکھلائیاں 180
206 غمزہ ہے جس کی چشم کا قاتل کارواں 181
207 ہم پیشِ کارواں ہیں نہ دنبالِ کارواں 181
208 وہ نور دیکھتا ہوں میں سنگ و سفال میں 182
209 کانٹوں سے کیونکہ مانگوں میں داماں کی دھجیاں 182
210 شب کن خرابیوں سے سحر کی ہے کیا کہوں 183
211 یارب اسی سودے میں نکل جاوے کہیں جان 183
212 ہم کو تو بس ڈبو گئیں نیل کے کنڑے والیاں 184
213 دیتا ہے زہر سو وہ ملا جام میں ہمیں 185
214 کاہے کو مارتا ہے تو لاتیں بہشت میں 185
215 کس گل نے دیا ہے اسے پیمانہ چمن میں 186
216 جو عکسِ مہ ہے صورتِ کف گیر آب میں 186
217 ہے بے قرار موج کی زنجیر آب میں 187
218 جو تشنہ اس کے خوں کی ہیں کانٹوں کی سولیاں 187
219 کتنوں کی تیغِ رشک سے کٹتی ہیں پوریاں 188
220 خود نقش چین کرنے لگیں نکتہ چینیاں 188
221 گر ہمدموں کے ساتھ نہ ہوں ہم نشینیاں 189
222 مستوں کی اس کے آپ ہیں آنکھیں تشلیاں 189
223 پھر لعل کو سمجھے نہ وہ کیوں حنکِ فلاخن 190
224 اپنا ہی دم بھرے جو پری پر نظر کریں 190
225 یک چند ہم اسیر قفس میں بسر کریں 191
226 نقصانِ مال و جاہ ہوا ان کی چاہ میں 191
227 ابرو کو نظر کر کے شمشیر اسے کہتے ہیں 192
228 بے دام پھنسا رکھا زنجیر اسے کہتے ہیں 192
229 کدورتیں بہت اس روزگار میں آئیں 193
230 کیوں کے سلجھے دل سودا زدہ حیراں ہوں میں 193
231 جوں پھول کھلے ہوں کسی گلشن میں ہزاروں 194
232 یعنی بجز غذائے ہُما مجھ میں کچھ نہیں 195

ردیف و

233 آہ سے نالے کے زرِ سل نہ چلے خشک تو ہو 195
234 یہ بھی بس ہے کہ ذرا دامنِ مژگاں تر ہو 196
235 ہوگئی غیر سے شاید کہ محبت تم کو 196
236 ہے دشمنِ جاں خلق کا انسان تو دیکھو 197
237 کیا جانیے کیا لاگ ہے مجھ ساتھ کسی کو 198
238 ٹک آنکھ دکھاتے ہی ترے مر گئے ہم تو 198
239 یا اس شبِ فراق کا قصہ تمام ہوا 199
240 جاؤ کسی کو ڈھونڈ لو اور ہی آشنا کرو 199
241 نزدیک مرے خامۂ تحریر نہ لاؤ 200
242 رو رو کے اپنی چشم کا تو تو تیا نہ کھو 200
243 یارب نہ کف و بازوئے قاتل کا بُرا ہو 201

ردیف ہ

244 دستِ جنوں تو میرے گریباں سے دور دہ 201

245 جاے ادب ہے منظرِ شاہاں سے دور رہ 202
246 لب بخوں تشنہ ور خسار بہار آلودہ 202
247 دست دخنجر تو نہ ہوا اس کا غبار آلودہ 203
248 ویسی ہی بڑی ابرو تو ویسی ہی بڑی آنکھ 203
249 مرتا ہے یہ نیم جاں اِدھر دیکھ 204
250 ہے نالہ بہ چرخ متصل آہ 204
251 فتراک زیں سے ووں ہی لے آیا شکار باندھ 205
252 عمر کٹی ذلت و خواری کے ساتھ 205
253 پہلے تو اس تفنگِ اجل کی تو چوٹ باندھ 206
254 کہ باز دید کے قابل نہیں ہمارا منھ 206

ردیف ی، ے

255 شوخی سے نہیں خالی یہ ناز و ادا والے 207
256 باندھے پھریں ہیں اس پہ کمر تیغ زن کئی 208
257 گریے سے میرے غرق بخوں ہیں چمن کئی 208
258 ساتھ اس کے مرہ ہو دیں ہیں خنجر اُلٹ جائے 209
259 شاید کہ خوشی سے کوئی دم زیست کا کٹ جائے 209
260 چہرہ وہ پری جس کو پری دیکھ کے کٹ جائے 210
261 تو لختِ خوں بُنِ مژگاں سے متصل لپٹے 210
262 رو یہ اے قیس کہ ہر خارِ بیاباں ڈوبے 211
263 یہ سلامت رہے اور آب میں یوناں ڈوبے 212
264 کچھ ہم کو اس سے جاے شکایت نہیں رہی 212
265 خطا پایے گا کہیں پانے کھانے 213
266 واں مگر سلسلہ برپا مجرِ تاک اُگے 213
267 دو گھڑی دل تو کہیں بیٹھ کے خالی کیجے 214
268 سب گنہگاروں سے فریاد کیجے 214
269 اور جو آوے بھی تو کیا بات بناوے کوئی 215
270 اک پری تختِ سلیماں پر مسلط ہو گئی 215
271 تھی پہ زاغ اپنی گر مژگاں پہ بلا ہو گئی 216
272 نہ کیوں کے برق بہ قربانِ دور داسن جائے 216
273 کیا کہیے کہ کن کن سے ہمیں کام پڑا ہے 217
274 گر آئے بھی تو وہ بیٹھے بدن چرائے ہوئے 217
275 ناگفتہ ہی یہ ہیں جو الم ہم نے اُٹھائے 218
276 خود اپنے قتل پر یہ گنہگار گرم ہے 219
277 عشق نے مجھ پہ نئے سر سے مصیبت ڈالی 219
278 تو ٹھنڈی سانس نہ کیونکر نسیم باغ بھرے 220
279 نہ باہم کی ملاقاتیں رہیں گی 221
280 اس کو برگ بید بھی شمشیر ہے 221
281 اب تک تو میں دیکھی نہیں تاب کرا ایسی 222
282 دریغا داغِ حرمانِ جدائی 222
283 مضمونِ تازہ طبعِ موزوں تلک نہ پہنچے 223
284 ہر اک زخم کو خوں بہا جانتا ہے 223
285 کیا جانے ہوا کس پہ وہ مائل کئی دن سے 224
286 پھر جان پہ کھیلا ہے مرا دل کئی دن سے 225
287 مجھے آج اپنے گھر مہمان رکھ لے 225
288 دلِ خونیں کے دسوں، باعثِ تسکین ہوئے 226
289 خواب میں بھی نہ مرے باعثِ تسکین ہوئے 226
290 ہم دے نہیں جو ہم سے حسرت نظری ہو گی 227
291 یا ہاتھ ہی پہنچے گا گریباں میں اس کے 228
292 لائی نہ تم کو بر سرِ انصاف دوستی 228
293 جی رات کے مزے میں اب تک بہک رہا ہے 229
294 زنداں میں آج تو کچھ نوحے کی سی صدا ہے 229
295 تم میں الفت کچھ اگر ہوتی تو تم آتے ہی 230
296 میں دل کو کیا زلفِ معنبر کے حوالے 230
297 یاں ساعدِ گل خوردہ ہے نشتر کے حوالے 231
298 دور ہی رکھیو تو یارب مجھے ان باتوں سے 231
299 نہ سنبھلے دل تو بھلا کس طرح سنبھالے کوئی 232
300 رہوں خموش تو ہو پُر ملال اس میں بھی 232
301 ہم نہ سمجھے تھے محبت میں وفا ہوتی ہے 233
302 کیا کرے گی نہیں معلوم یہ الفت تیری 233
303 پھر تازہ دوستی کی اُس سے بنا رکھی ہے 234
304 ہم کو پیامِ مرگ بھی آوے تو خوب ہے 234
305 مسلماں دیکھ کر مسجد کو جیسے شاد ہوتا ہے 235

306 جھگڑا ہی چکے جان جو اک بار نکل جائے 236
307 مارڈالا دل بے تاب کی بے تابی نے 236
308 وہ کام تو کر کھاوے ہے جس کام کی روٹی 236
309 بسانِ شمع جلا سر، قدم کو آگ لگی 237
310 رہے ضعف کے مارے جو گھر میں...... 238
311 یہ ڈر ہے کہ خاطر تری رنجیدہ نہ ہووے 238
312 آرزوے دلِ شیدائی بری لگتی ہے 239
313 تو بدن ہی سمجھ اس کو جو سخن رہ جاوے 240
314 ہووے جو شخص کہ عاشق وہی محروم رہے 240
315 دو باتیں اس سے کرلیں گو اس میں جان جاوے 241
316 غم عشق کا بھی ہے تو جینے پہ حرف ہے 241
317 تحریرِ رنگِ پان سے مینے پہ حرف ہے 242
318 قرص حباب سے بھی نگینے پہ حرف ہے 243
319 ہووے گی جو رسوائی جاوید تو ہووے 243
320 رسم منازعت نہ ملاقات میں رکھی 244
321 دکھائے زور مرے شب کی آہ و زاری نے 244
322 دامنِ افشاں کی بھی چھینٹیں مقرر دھویئے 245
323 اچھے بچھے دل کو میرے غم لگا جاتے رہے 245
324 رکھ دو گے ہاتھ سے جو کمانِ ستمگری 246
325 ہاتھوں سے جو بلائیں لیں تو ہاتھوں کو تعذیر ملی 246
326 یارب میں پڑا کس بت بے رحم کے پالے 247
327 سایہ حق میں ہے توگل سایۂ دیوار میں ہے 247
328 دھیان اس کا ہے وہیں کہ کہ وہ گلزار میں ہے 248
329 کوچے گلی میں الکھتے تھے کیسے ہی زرداروں کے 249
330 بادِ صبا کسی کا پیغام لاتی ہوگی 249
331 اگر جانے تو اس کو ساکنِ بیت الحزن جانے 250
332 ڈکھ دے رہی ہے تس پہ شب انتظار بھی 250

☆☆☆☆

دیگر اصنافِ سخن

1 قطعۂ تہنیت 255
2 رباعیات 255
3 مثنوی گلزارِ شہادت 260
4 مثنوی مرغ نامہ مرزا تقی 273
5 مثنوی بحر المحبت 277
6 مثنوی جذبۂ عشق 295
7 مثنوی در ہجو قوم شیخ 307
8 سلام 309
9 تروتج 324
10 مرثیہ 325

☆☆☆☆

حرفِ آغاز

غلام ہمدانی مصحفی میر و غالب اور انیس و اقبال کے ہم پلّہ نہ سہی مگر اہلِ نظر انھیں ہماری زبان کے بڑے شاعروں میں بہرحال شمار کرتے ہیں۔ اُس عہد تک غزل میں میر کے بعد، قصیدے میں سودا کے بعد اور مثنوی میں میر حسن کے بعد کسی شاعر پر نظر ٹھہرتی ہے تو وہ مصحفی ہی ہیں۔

بسیار گوئی اور زود نویسی نے مصحفی کے فن کو بلاشبہ نقصان پہنچایا۔ اس الزام کو کہ مصحفی اپنے شعر فروخت کرتے تھے صاحبِ آب حیات مولانا محمد حسین آزاد کی داستاں طرازی کہہ کر یک قلم مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ بالفرض یہ بیان بے بنیاد ہو بھی تو یہ حقیقت تو ہمارے سامنے ہے ہی کہ مصحفی نے اردو میں چالیس ہزار سے زیادہ شعر کہے اور شاعری کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا جس میں خذف ریزے زیادہ سہی مگر بے شمار دمکتے ہوئے ہیرے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ پارکھوں کی نظروں سے پوشیدہ رہے تو اس لیے کہ عرصۂ دراز تک نو دواوین پر مشتمل مصحفی کا کلیات شائع کرنے کا کوئی ادارہ حوصلہ نہ کر سکا۔ کلام ہی دستیاب نہ تھا تو انتخاب کی ذمہ داری کون قبول کرتا اور مصحفی کے شاعرانہ مرتبے کا تعین ہوتا تو کس طرح؟ اس کے باوجود سخن شناس ان کی وسعتِ مطالعہ، تنقیدی بصیرت، فنِ شعر کے اسرار و رموز سے آگاہی اور قادر الکلامی کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔

اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ کسی شاعر کی بسیار گوئی یا کم گوئی شاعری میں اس کے مقام و مرتبے کے تعین میں مددگار ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی نے بہت کم شعر کہے ہوں

مگر ان میں دو ایک شعر بھی اچھے نہ ہوں اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے ضخیم کلیات چھوڑا ہو اور اس میں عمدہ اشعار خاصی تعداد میں موجود ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ کسی شاعر کے کلیات سے اگر سو صفحات کا ایسا انتخاب تیار کیا جا سکے جو قابلِ توجہ ہو تو وہ زندہ رہنے والا شاعر ہے۔ مصحفی اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے نو دواوین کا انتخاب خدا بخش لائبریری پٹنہ کے جنرل میں اور بعد کو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے اور پسند کیا گیا ہے۔ افسوس اس انتخاب کی اشاعت اس پیمانے پر نہ ہو سکی جس کی ضرورت تھی۔

اردو شاعری کی دنیا میں مصحفی بلند تر مقام پر فائز ہوتے اگر وہ قلم روک کر لکھتے، غور و فکر سے زیادہ کام لیتے اور اپنے شعروں پر خونِ جگر صرف کرتے یعنی بار بار اپنے شعروں کو سنوارتے اور نوک پلک درست کرتے۔ مگر انھوں نے کبھی مُڑ کر اپنے کلام کی طرف دیکھا ہی نہیں، نظر ثانی کی زحمت کبھی اُٹھائی ہی نہیں۔ خود فرماتے ہیں:

آں فرصتم کجاست کہ اے مصحفی دگر بینم بہ چشمِ خویش غزلہائے گفتہ را

مصحفی شاعری میں "جنسِ خوش قماش" کی اہمیت کے قائل ہیں اور تلاش و تجسس کے بغیر زباں وا کرنے کو دوں ہمتی خیال کرتے ہیں۔

میں کیا وہ ہوں جو زباں وا کروں تلاش بغیر کہ اپنی نبھتی نہیں جنسِ خوش قماش بغیر

انھیں اس کا بھی احساس ہے کہ بسیار گوئی اور کثرتِ اشعار کلامِ دلکش کے لیے مہلک ہے۔ چنانچہ وہ اس سے دور رہنا چاہتے ہیں۔

تجھ کو کیا بسیار گوئی سے ہے کام اے نغز گو مصحفی موقوف کر اس کثرتِ اشعار کو

عقدِ ثریا میں انجب کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پُر گوئی نے کلام میں رطب و یابس پیدا کر دیا تھا۔ اسی طرح کے بیانات ان کے تذکروں میں متعدد جگہ نظر آتے ہیں۔ گویا وہ پُر گوئی کے مضر و مہلک نتائج سے پوری طرح باخبر ہیں مگر زندگی کے کسی دَور میں اس سے دامن نہیں بچاتے۔ یہ عذر ملاحظہ ہو:

قافیوں کی بندش کا مصحفی ہے ہم کو شوق　　ہم غزل اسی باعث مختصر نہیں کہتے

اور یہ تاسف بھی دیدنی ہے کہ:

بکواس لگ گئی ہے تجھے کیسی مصحفی　　شعر و غزل ہیں اب کے ترے بے حساب سے

انھوں نے بے حساب شعر نہ کہے ہوتے تو ان کا مقام اور بلند ہوتا۔

چند برس پہلے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نے کلیات مصحفی کی ترتیب و تصحیح کا کام پروفیسر نثار احمد فاروقی کو سونپا۔ وہ چار دیوان ترتیب دے پائے تھے کہ ہم سے رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ اور پرنسپل پبلیکشن آفیسر ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ نے اس کام کی تکمیل کے لیے راقم کا انتخاب کیا۔ اسے بھی اپنا سفرِ آخرت بہت دور نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے کہ یہ کام مکمل ہوجائے۔ پانچواں دیوان ترتیب دیا جاچکا ہے اور میں نے جناب ضیاء الدین انصاری جو اس پروجیکٹ کے لٹریری اسسٹنٹ تھے، انھیں کو کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کا کام کروانے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ انھوں نے اس کام کو بخوبی انجام دیا۔ یہ امر باعث طمانیت ہے کہ وہ عربی زبان کے عالم ہیں اور فارسی، عربی الفاظ پر ان کی گہری نظر ہے اور چھٹا دیوان زیرِ ترتیب ہے۔

دیوانِ پنجم کا زمانہ تصنیف 1218 ہجری کے آس پاس ہے۔ دیوانِ چہارم 1210ھ کے چار پانچ سال بعد مکمل ہوا۔ اس میں آصف الدولہ کی فتح پر کہا گیا قطعہ موجود ہے۔ ''فتح آصف کی ہوئی ــــ دشمن بے دیں بھاگا''۔ اس سے 1209ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اپنی خادمہ بی بولن کی وفات پر کہا ہے ''داغ کیسا یہ دے گئی کلّو'' (1211)۔ آصف الدولہ کا انتقال 1212ھ میں ہوا۔ دیوانِ چہارم کا ایک شعر ہے:

رونق تھی لکھنؤ میں تو آصف سے مصحفی　　اب کیا کرے گا رہ کے کوئی اس دیار میں

دیوانِ پنجم میں ایک قطعۂ تاریخ شامل ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:

کہ اس مصرعے میں ہیں تاریخ دو

''مظفر علی خاں کے بیٹا ہوا''

دو چنداں عدد ہیں تو ہے اور خوب

دو چنداں ہے اس ماہ کا مرتبا

دوسرے مصرعے سے 2436 برآمد ہوتے ہیں۔ انھیں دو سے تقسیم کیا جائے تو 1218 حاصل ہوتے ہیں۔ گویا مظفر علی خاں کا بیٹا 1218ھ میں تولّد ہوا۔

مصحفی کا سالِ ولادت 1161ھ ہے۔ دیوانِ پنجم میں اپنی عمر ساٹھ برس بتاتے ہیں۔ 1221ھ میں ان کی عمر ساٹھ سال ہو جاتی ہے۔ مصحفی ہر دیوان میں اپنی عمر بتاتے چلتے ہیں لیکن ٹھیک ٹھیک نہیں بلکہ تقریباً یا کم و بیش وغیرہ۔ بہرحال اس حساب سے بھی دیوانِ پنجم کا سالِ تصنیف 1220ھ کے قریب طے پاتا ہے۔ دیوانِ پنجم کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہوئی بہ رنج و محن میری شصت سال کی عمر لگے نہ تیری کیوں دل میں اس کمال کی عمر

اور دیگر.....

کھایا ہے جوشِ شہد بلاغت میں شصت سال معجون عقل آئی ہے تب کچھ قوام پر

دیوانِ ششم کے ایک نسخے میں دیباچہ شامل ہے اور اس میں 1224ھ سنِ تصنیف بتایا گیا ہے۔ اس دیوان میں جراءت کی تاریخِ وفات (ہوگئی کیا بلبلِ نالاں خموش) شامل ہے، اس سے 1224ھ اس طرح برآمد ہوتے ہیں کہ ہوگئی میں ''ی'' کے عدد دو بار جوڑے جائیں۔ اسی دیوان میں میر کی وفات کا قطعۂ تاریخ بھی شامل ہے:

از سرِ درد مصحفی نے کہا حق میں اس کے ''موانظیری آج''

4 1225=4+1221

اس دیوان میں اپنی عمر ساٹھ سال بتائی ہے:

مصحفی ساٹھ برس تک یہیں پاپڑ بیلے ہم نے بھی دیکھے زمانے کے چلن کیا کیا کچھ

اس دیوان کی تکمیل میں پانچ سات برس ضرور لگے ہوں گے۔ اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ دیوانِ پنجم 1218ھ کے آس پاس مکمل ہو چکا ہوگا۔

دیوانِ پنجم کے دو خطی نسخے دستیاب ہیں۔ پہلا اس سیٹ کا حصہ ہے جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے (مکتوبہ 1243ھ) اور نسبتاً معتبر ہے۔ اسی نسخے کو اساس کے طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ حواشی میں اصل سے مراد یہی نسخہ ہے۔ اغلاط سے یہ بھی پاک نہیں۔ دوسرا نسخہ انجمن ترقی اردو دہلی کی ملکیت ہے۔ ہم نے اس نسخے سے اس وقت استفادہ کیا تھا جب انجمن علی گڑھ میں تھی۔ حواشی میں اس کے لیے علامت ''ج'' مقرر کی گئی ہے۔ اس نسخے پر تاریخ کتابت درج نہیں۔ کاتب بے حد غلط نویس ہے۔ جو الفاظ صریحاً غلط ہیں انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لیے یہ نسخہ معتبر نہیں اکثر غلط اختلافات بھی حواشی میں درج کر دیے گئے ہیں اور اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ صریحاً غلط ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کلیاتِ مصحفی میں اختلافِ نُسخ کی کوئی اہمیت نہیں۔ مصحفی کو اسی کی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اپنے کلام پر نظرِ ثانی کرتے اور خود بقول شاعر جہاں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے اسے سہوِ کتابت خیال کرنا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

آں فرصتم کجا ست کہ اے مصحفی، دگر
بینم بہ چشمِ خویش غزلہاے گفتہ را
سہوے اگر بود درو داں تو کہ سہو کاتبش
ورنہ کلامِ مصحفی کزلک و فک و حک نداشت

نسخۂ انجمن میں مثنویات موجود نہیں۔ مثنوی بحر المحبت کا ایک نسخہ مولانا عبد الماجد

دریابادی کے ذخیرے میں موجود تھا۔ ان کے علم میں اس کا کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں تھا۔ انھوں نے بڑی محنت سے اسے ترتیب دے کر شائع کر دیا تھا۔ اس کے اختلافات حواشی میں درج کر دیے گئے ہیں۔ ''م'' سے مولانا کی مرتب کی ہوئی مثنوی مراد ہے۔

مرحوم پروفیسر نثار احمد فاروقی کا ارادہ تھا کہ ہر دیوان میں شعر و ادب کے کسی ایک پارکھ کا مضمون شامل کیا جائے گا۔ تین اہم مضمون تو انھوں نے شامل کر لیے۔ پھر نہ جانے کیوں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اگر ہر دیوان کے ساتھ ایک اہم تنقیدی مضمون شامل ہو جاتا تو وہ مضامین جو منتشر تھے، یکجا ہو جاتے اور مصحفی شناسی میں معاون ہوتے۔ ہماری خواہش ہے کہ اجازت حاصل ہو جائے تو اس دیوان میں سید حامد صاحب کا مضمون مشمولہ نگار خانۂ رقصاں شامل کر لیا جائے گا۔ دیوان ششم میں جناب سید عبداللہ کا مضمون شامل کیا جائے گا۔ دیوان ہفتم کے لیے کئی مضمون پیش نظر ہیں، ان میں سے کوئی ایک انتخاب کر لیا جائے گا۔ دیوان ہشتم مصحفی کا آخری دیوانِ غزلیات ہے جو ان کی وفات کے سبب ناتمام رہا اس لیے بہت مختصر ہے۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے راقم کی درخواست پر ایک افسانہ لکھا تھا۔ اس میں مصحفی کی زندگی اور شاعری پر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس سے تحقیق اور تنقید دونوں کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ فاروقی صاحب نے اجازت دی تو یہ افسانہ آٹھویں دیوان کے ساتھ شامل کر لیا جائے گا۔

ہر دیوان پر مرتب حرف آغاز کے طور پر جو کچھ لکھے گا وہ صرف اسی دیوان سے متعلق ہوگا اور مختصر ہوگا۔ تفصیل سے لکھنے کا موقع اس وقت ملے گا جب مقدمۂ کلیاتِ مصحفی کی اشاعت کا وقت آئے گا۔

پروفیسر نور الحسن نقوی

نگارخانۂ رقصاں

مصحفی کی شاعری پر ایک نظر

مصحفی کی شاعری پہلو دار ہے۔ کسی ایک پہلو کو لیجیے، ستائش انگیز، حیرت خیز انکشافات ہوں گے۔ ہماری تنقید کی روایت پرستی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ابھی تک مصحفی کو اس کا حق نہیں ملا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، صاحبِ تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں:

"مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہ متقدمین کے پیرو تھے اور نہایت زُود گو اور پُر گو تھے، مختلف اصنافِ سخن پر انھیں کمال حاصل تھا۔ ملکی خصوصیات ان کے یہاں جراءت سے زیادہ اور انشا سے کم ہیں۔ نہ تخیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں دلکشی ہے۔ الفاظ بعض جگہ ایسے لکھ گئے ہیں جو اَب متروک ہو گئے ہیں۔ زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی ہے گو کہ زمانہ انشا اور جراءت کا پایا تھا۔"

یہ تنقید غیر منصفانہ ہے۔ الفاظ اکثر آگے چل کر متروک ہو گئے تو اس سے شاعر کی منزلت میں کیا کمی آئی۔ لیل و نہار اس قسم کا برتاؤ ہر شاعر کے ساتھ کرتے ہیں۔ کیا متروکات غالب و مومن کے یہاں نہیں ملتیں، حالانکہ یہ دونوں شاعر مصحفی کے بعد آئے۔ مصحفی کی زبان کو زمان کے علاوہ مکان کے اعتبار سے بھی دیکھیے۔ وہ دلّی کے نواح (امروہہ) کے رہنے والے تھے اور ان کا شعور دلّی میں پختہ ہوا، پھر اس بات پر تعجب کیوں

کہ اُن کی زبان پر اکثر میر وسودا کا اثر ملتا ہے، جراءت اور انشا کا نہیں۔ ان دونوں بے باک قلم شعرا کو مصحفی نے کبھی گردانا ہی نہیں۔ جہاں تک ترک الفاظ کا تعلق ہے میں آگے چل کر ذکر کروں گا کہ جسے ہم تہذیب اور تطہیر کا عمل سمجھتے ہیں وہ دراصل افلاس اور کمزوری کا پیش خیمہ تھا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقم طراز ہیں: ''جو شخص بزرگوں اور صوفیوں کی صحبت اٹھا چکا ہو، اس کے یہاں مسکینیت اور متانت کا پایا جانا ممکن نہیں ہے''...... ''مصحفی نیک نہاد اور درویش منش انسان کا یہ انجام ہوا'' آگے چل کر مصایب اور آفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مصحفی کی طبیعت میں تلخی اور زہرنا کی بڑھ گئی''۔ ایک جگہ ''سارے کلام کو یاس انگیز'' بتایا ہے۔''

مصحفی کے ساتھ مسکینیت کا انتساب ڈاکٹر ابواللیث کی اختراع نہیں، لیکن یہ روایت ہے غلط اور مصحفی کی شخصیت کو اس سے جراحت پہنچتی ہے۔ جو شخص غیور ہو اسے مسکین کہنا زیبا نہ ہوگا۔

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی

یہ مصحفی ہی تھے جنھوں نے ممدوح (سلیمان شکوہ) سے کہا تھا۔

جاتے ہیں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں
کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

انگریزی میں ایک لفظ ہے جینٹل (GENTLE)، جو شرافت کے ساتھ نرمی اور کسی قدر مسکینیت کی طرف بھی ذہن کو لے جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے مشہور اور دل پذیر اہلِ قلم چارلس لیمب (CHARLIS LAMB) پر جو اپنی رحم دلی اور شرافت اور لطافتِ احساس کے لیے مشہور تھا، جب اس کے دوست کولرج نے اس لفظ کا اطلاق کیا تو لیمب نے

سختی کے ساتھ احتجاج کیا۔ مصحفی اگر مسکین نہاد ہوتے تو نامساعد حالات اور مخالف ماحول اور آمادۂ عناد معاصرین کا مقابلہ کیسے کرتے اور اپنی انفرادیت اور عزتِ نفس کو کیوں کر بچاتے۔ مصحفی کی شخصیت کا یہ بھی کمال ہے کہ انھوں نے تنگ دستی اور تشنگی کے باوجود اپنے کلام کو تلخی اور زہرناکی سے محفوظ رکھا۔ ان کے اشعار کو یاس انگیز بتاتے ہوئے بھی ڈاکٹر ابواللیث کی سطور سہو کی غمازی کر رہی ہیں۔ مصحفی کے یہاں درد ہے، سوز و گداز ہے، گھلاوٹ ہے، دل برشتگی ہے، حسرت ہے، آرزو ہے، لیکن یاس کا کہیں گزر نہیں۔ ایک مغموم رجائیت، ایک چوٹ کھایا ہوا ذوقِ نشاط، اک پُر درد ابتہاج، ایک شکست ناپذیر تمنا۔ یہ ہے ہمارے اس شاعر کا سرمایۂ مزاج۔

محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں انشا کو مصحفی پر ترجیح دے کر ذوق اور انصاف کا خون کیا ہے۔ لیکن بالآخر زمانہ نے اس ناانصافی کا ایک حد تک اور صرف ایک حد تک ازالہ کیا۔ حسرت موہانی جنہوں نے خود مصحفی اور (ان کی طرح) دوسرے اساتذہ سے بہت کچھ اخذ کیا اور جو داخلی خارجیت اور ادائے حسن میں مصحفی کے ہمنوا ہیں لکھتے ہیں:

> ''مصحفی کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہ کر کے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین سے ہر ایک کے اندازِ سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں کہیں میر کا درد ہے، کہیں سودا کا دبدبہ، کسی مقام پر فغاں کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی۔ کہیں واقعات میں جراءت کی سلاست اور حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہیں ترتیب الفاظ اور اندازِ بیان میں انشا کا طنطنہ اور جبروت صرف ہوا ہے۔ مصحفی کی زبان اگرچہ میر و سودا کی قدیم زبان سے بہت ملتی جلتی ہے لیکن اس درجہ شیریں اور سبک واقع ہوئی ہے کہ اس کے متروک الاستعمال ہونے کا گمان نہ پیدا ہونے دے گی۔ راقم کی نظر میں میر اور مرزا کے بعد کوئی اور استاد

ان کے مقابلہ میں نہیں جچتا۔"

مصحفی کے مذکورہ بالا نشانِ امتیاز یعنی زبان کی صفائی، دلکشی، روانی اور رنگینی اور رعنائی کا اعتراف مرزا علی لطف تذکرۂ گلشنِ ہند میں کر چکے تھے اور بعد میں یہی اعتراف مولانا عبدالسلام ندوی نے شعرالہند میں کیا۔ مصحفی کا مقام بحیثیت شاعر کیا ہے اس کے صحیح تعیین میں حسرت موہانی کے علاوہ مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کے اس تبصرہ کی کہ "مصحفی کی غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے ہیں کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں" گورکھپور کے مذکورہ بالا دونوں فرزندوں نے تصحیح کی ہے۔ مجنوں لکھتے ہیں "مصحفی کے کلام میں ہم کو ایک انفرادی کیفیت محسوس ہوگی جو انھیں کی چیز ہے اور جس کو میں نے ایک اندرونی فضائی کیفیت بتایا ہے۔ مصحفی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے اشعار میں رنگ اور فضا کا انعکاس پیدا کیا اور یہی ان کی سب سے بڑی انفرادی خصوصیت ہے۔" مجنوں نے تنقید کے اس زاویہ کو بھی واضح کیا کہ مصحفی ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ ان کا کلام دلّی کی داخلیت اور لکھنؤ کی خارجیت کا دلکش آمیزہ ہے اور انتخابیت کا ایک دلفریب مرقع۔

فراق نے مصحفی کی داخلی خارجیت کا رشتہ معاملہ بندی سے جوڑتے ہوئے ان کے کلام میں سودا کے رنگ کو فروغ پذیر دیکھا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ میر و مصحفی میں اس فرق کا مشاہدہ کیا ہے "جو دو پہر اور غروب آفتاب کے وقت میں پایا جاتا ہے"...... "جس طرح میر اور سودا کے رنگ کو ایک نرم کسک اور ایک معتدل انداز دے کر مصحفی نے اپنی انفرادیت نمایاں کی ہے اسی طرح وہ جراءت کی معاملہ بندی کو بھی اپنے خاص انداز میں بدل دیتا ہے۔" فراق نے طبعًا توجہ دلائی مصحفی کے کلام میں "معشوق کی اداؤں کی مصوّری" کی طرف اور اس کے ساتھ اس سجاوٹ "رچے ہوئے اندازِ بیان" اور "رنگین بول چال" کی جانب جدھر مصحفی اردو غزل کو لے گئے۔ مصحفی نے بہ قولِ فراق "اردو غزل

کو جو چیز دی ہے وہ ایک مزاج یا رنگِ مزاج ہے۔اس نے ہمارے شاعرانہ کیف واثر کو ایک ایسا پیمانہ دیا ہے جو نہ بلانوشوں کے لیے ہے نہ کم ظرفوں کے لیے۔" فراق کی رائے میں "تقلید وانتخابیت کے باوجود مصحفی مصحفی رہتا ہے۔اس کے بہروپ میں بھی اس کا اصل روپ نظر آتا ہے۔"

مصحفی کی تاریخی اہمیت سب کو تسلیم ہے۔اس کا خاندان بہت وسیع ہے۔ بعد میں آنے والے غزل گو جس حد تک مصحفی سے متاثر ہوئے کسی دوسرے شاعر سے نہیں ہوئے۔ لیکن تاریخی اہمیت سے قطعِ نظر مصحفی ہمارے اکابر شعرا میں ہے۔ اس مضمون میں ان اوصاف سے صَرف نظر کر کے جو بارہا تنقید کی گرفت میں آئے ہیں مصحفِ مصحفی کی ان آیات کی صراحت ہوگی جو ہنوز محتاج تفسیر وتعبیر ہیں۔

پہلی خصوصیت تو وہ ہے جسے میں نے ان سطور کی سرخی بنایا ہے یعنی نگار خانہ رقصاں۔سب سے پہلے فراق نے اس "تصویر خانہ" کا ذکر کیا جو مصحفی کے اشعار سے تشکیل پاتا ہے۔میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ یہ نگار خانہ ساکت نہیں ہے۔ ہر آن حرکت میں ہے،رقصاں ہے۔ مصحفی کے کلام کا لطف اٹھانا ہے تو تصور کو حرکت دینا ہوگی۔ ہر صفحے پر نگار خانے رقص کرتے ہوئے نظر آئیں گے،ان میں تشبیہیں اور تصویریں ناچتی ہوئی ملیں گی۔ انتخاب کیجیے تو رقصاں اور متحرک تصاویر کا ایک ضخیم البم ترتیب پا جائے گا۔اس وصف میں مصحفی منفرد ہے۔ وہ باوجود فقیر منشی کے نہ خود ایک آن چین سے بیٹھتا ہے نہ اپنے اصنامِ خیالی کو بیٹھنے دیتا ہے۔ سینے نہیں دیکھیے،تصور کی نگاہوں سے:

انگڑائی لیکر اپنا مجھ پر خمار ڈالا
کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

ہے ہے ترا سر جھکا کے چلنا
پھر شرم سے مسکرا کے چلنا

کیا فکر کروں چڑھتی ہی جاتی ہے سیاہی
دن رات مرے نامۂ اعمال کے اوپر

دیکھا آپ نے، تخیل مصوّرانہ ہو تو تجریدی کیفیت بھی تصویر کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے جس میں مصوری کے ساتھ ساتھ سودا کا سا زورِ بیان بھی نظر آئے گا:

رکھتے ہیں جو سینے میں سکت زخمِ ستم کی
وہ تیغ تری روکے ہیں کب ڈھال کے اوپر

آپ نے تیغ چلتی ہوئی دیکھ لی، جو نیم نگاہ کی طرح راہ سے ہی لوٹا لی گئی کہ سینہ کا حصہ سپر کو کیوں ملے۔

اب جو شعر نقل کر رہا ہوں اس میں شاعر اپنی بربادی کا نقشہ کھینچ رہا ہے لیکن جو تصویر سامنے آئی وہ فلاخن میں بھر کر پتھر چھوڑنے کی ہے:

چرخِ دوّار نے یوں مجھ کو زمیں پر پٹکا
جُوں فلاخن میں پھرا کر کوئی چھوڑے پتھر

یہی پتّھر جب قریب آتا ہے اور زمین پر گرتا ہے تو آنکھیں کیا دیکھتی ہیں، جسے وہ پتھر سمجھی تھیں اور جسے آسمان نے زمین پر دے پٹکا تھا وہ پتّھر نہیں، خستہ و جراحت زدہ مصحفی ہے۔ ذہن اور باصرہ کا یہ اختلاط مصحفی کا ایک امتیازی وصف ہے جس کی طرف شاید ابھی تک نگاہیں نہیں گئیں۔

یہاں مصحفی کی ایک مانی ہوئی خصوصیت کو بھی دوہرا دیا جائے۔ اس قادر الکلام کے اشہبِ فکر کے پاؤں تلے سنگلاخ زمین پانی ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں پتّھر ردیف تھی۔ غور

کیجیے ساری غزل میں مضمون کو کہیں سنگلاخ ردیف سے گزند پہنچا؟ مصحفی نے بے شمار غزلوں میں سنگلاخ ہفت خواں طے کیے لیکن سمند سخن نے کہیں بھی ٹھوکر نہیں کھائی۔ یہ بھی ہماری کم حوصلگی اور مغرب پرستی ہے کہ کبھی ہم ردیف سے بیزار نظر آتے ہیں، کبھی قافیہ سے اور سنگلاخ زمینوں کو ہم نرمی مشاقی اور مضمون کُشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل کوئی شاعر جب تک وہ سنگلاخ اور دشوار گزار ردیفوں کا مرحلہ طے نہ کرلے ادائے مطلب پر کما حقہٗ قادر نہیں ہوتا۔ مشکل زمینوں کو زیر جیسا کہ مصحفی نے کیا ہے اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ اگر ہے تو ذوق کے یہاں۔

کہنے کو تو میاں مصحفی کہہ گئے کہ:

مصحفی عشق و ہوس میں ہے بڑا فرق میاں
کوئی ہوتی ہے حریفِ نگہ پاک ہوس

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہاں ایک حد تک یہ فرق محض خیالی رہ جاتا ہے، صحت مند عشق جسمانی کشش یا ہوس کو اپنے دامن میں سمیٹے رہتا ہے۔ مصحفی کی محبت ہوس کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ اس اختلاط نے ان کی وقوع گوئی کو چمکا دیا ہے۔

لیجیے ایک اور سکوت نا آشنا تصویر دیکھیے:

بے خودوں کو کششِ زلفِ گرہ گیر ہے شرط
جس طرح پیلِ سیہ مست کو زنجیر ہے شرط

آزادی کو ثبات اور وزن اور حسن، پابندی سے ہی ملتا ہے۔ ''پیل سیہ مست'' کہہ کر شاعر نے بے عنان بے خودی کی تصویر اتاری ہے۔ اسی زمین میں ایک اور شعر سنیے ہر چند کہ اس کی جگہ نگار خانۂ رقصاں میں نہیں۔ اس میں مصحفی کا آنکھ سے اچانک پردہ اٹھا دینے والا وصف بھی جلوہ گر ہے:

آنکھ کھل جائے تو یوسف سے کہوں میں اتنا
خواب بیداری عالم کی بھی تعبیر ہے شرط

آپ نے ندی کے کنارے یا سمندر کے ساحل کو طغیانِ موج سے کٹ کٹ کر گرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ نہ دیکھا ہو تو اب دیکھ لیجیے۔

طغیانِ اشک نے مری پلکیں بھی دیں بہا
سچ ہے کہ ہو نہ موج سے ساحل کی احتیاط

اس شعر کی تصویر پر وجد کیجیے کہ تاثیر کی داد دیجیے:

ہے زیرِ تیغ اپنی جوں شمع زندگانی
سو بار سر کٹے ہے تب رات کاٹتے ہیں

مطلع اس غزل کا مصحفی کی توانائی کے ایک اور مخزن کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

یوں رو رو اس گلی میں دن رات کاٹتے ہیں
رستے میں جوں مسافر برسات کاٹتے ہیں

روزمرّہ کے واقعات اور گرد و پیش کے ماحول سے تصاویر، تشابیہ اور مضامین اخذ کر کے مصحفی نے اپنے اشعار کو ارضیت، جسامت اور توانائی سے بہرہ ور کیا ہے۔ اس شعر میں نشستِ الفاظ ایسی ہے کہ رونے اور برسات میں براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہتا اور مفہوم تصنع اور مبالغہ سے بچ جاتا ہے۔

اب جو چار شعر آ رہے ہیں ان میں ہمارے آذرِ سخن کی پیکر تراشی کے علاوہ، کہیں خارجی رنگ ہے، کہیں داخلی، کہیں محبت امڈ آئی ہے، کہیں خستہ حالی پر درد آمیز طنز ہے اور ان سب پر مستزاد ردیف "لپٹ" جو بظاہر غیر شاعرانہ ہے لیکن مرصّع ساز مصحفی نے جسے نگ کی طرح جڑ دیا ہے:

زلف میں جھمکے ہے یوں اس کے کرن پھول کا رنگ
جیسے گل، جائے کوئی کاکلِ بے جاں سے لپٹ

تیری رعنائی کے ڈھنگ اس میں ہیں جی چاہے ہے
دوڑ کر چاہیے طاؤس گلستاں سے لپٹ

اڈے آنسو تو ہوا آہ کا پھر یہ عالم
جیسے جاتی ہے ہوا شورشِ طوفاں سے لپٹ

مصحفی ہجر کی شب، وصل کا کوئیں ہیں مزہ
بسکہ سو رہتے ہیں ہم حسرت و حرماں سے لپٹ

اس شعر میں حسن کی ایک کیفیت کا نقش کیا خوب بٹھایا ہے، جیسے نگینہ جڑ دیا ہو۔

زلفوں سے اس کی چمکے ہے عارض تو اس کو ہم
کہتے ہیں ہے یہ صبحِ شبِ تار کی نمود

نقطہ ہے انتخاب کا گویا وہ خالِ رخ
جس سے ہوئی ہے اور بھی رخسار کی نمود

دوسرا شعر بتا رہا ہے کہ مصحفی کے یہاں باصرہ کے ساتھ ذہن کا ہی نہیں احساسِ جمال کا ارتباط بھی ہے۔ یہ اشعار صرف وہ شاعر کہہ سکتا ہے جس کا تخیّل حرکت وتصویر بداماں ہو، جو کیفیاتِ حسن کا اداشناس ہو اور جس کے دل میں محبت کی آگ سلگ رہی ہو۔

یوں ہے ڈلک بدن کی، اس پیرہن کی تہ میں
سرخی بدن کی جھلکے جیسے بدن کی تہ میں

''ڈلک بدن کی'' یہ ترکیب اس بات کی تصدیق کر رہی ہے کہ مصحفی تن بدن کی رعنائیوں کا اداشناس اور نغمہ سرا ہے اور اس امتیاز میں اس کا شریک صرف رگھوپتی سہائے فراق ہے۔ ''ڈلک'' کا لفظ فریاد کر رہا ہے کہ میرے جیسے نہ معلوم کتنے حسین پُر احساس اور معنی آفریں الفاظ لطافت اور طہارت کے نشہ میں اُردو شاعری کی زبان سے نکال دیے گئے۔

خالِ عارض کو تری زلف نے یوں گرمایا
تازیانے کے تلے جیسے کہ شبرنگ اُڑے

اس شعر کی کیفیت کا احاطہ نثر میں نہیں ہوسکتا۔ ایک نادر، مؤثر اور متحرک تصویر ہے جس کا حظ نہ باصرہ تک محدود ہے نہ تخیّل تک۔ ایک جاں سوز حسن پرست عاشق کا رُواں رُواں اس کی لطافت اور حرارت اور جمال سے لذت اندوز ہو رہا ہے۔

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے، کبھو آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچہ میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

کروں مو و زلف کا کیا بیاں کہ عجیب قصہ ہے درمیاں
یہ اِدھر کو سینہ پہ آرہے، وہ اُدھر کمر کے چلے گئے

پہلے شعر میں عاشق کی ہیئت اور دلی کیفیت دیکھیے، دوسرے شعر میں معشوق کا ہوشربا سراپا اور حشر انگیز انداز ''عجیب قصہ ہے درمیاں'' کی بے ساختہ و بارنگ اشاریت دامن دل کو کھینچتی ہے۔ آذرِ سخن کی پیکر تراشی بھی دیکھیے اور مسیحا نفسی بھی کہ پیکر میں جان ڈال دی۔

ایک اور مہر انگیز تصویر دیکھیے:

یہ دانتوں تلے زباں دبانا
بے داد ہے قہر ہے ستم ہے

تصویر ساز شاعر موقلم کو خفیف سی جنبش دیتا ہے اور پُرعشوہ آشوب دوراں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مصحفی تصویریں بناتا ہے۔ نگار خانوں کو ترتیب دیتا ہے، رقص میں لاتا ہے۔ یہ وہ تنہا ناظرین سے دور رہ کر نہیں کرتا، نہ کرسکتا ہے۔ وہ محبت کی آنچ سے ناظرین کے دلوں کو پگھلاتا ہے اور ان کی قوتِ متخیلہ کو حرکت میں لاتا ہے۔ یہ حرکت میں آگئی تو شاعر کا کام آسان ہوگیا۔ اس کے تصور نے جو تصویر دیکھی ہے وہ ناظر کے پردۂ تصور پر اتر آتی ہے۔ شاعر اور قاری کی ہمکاری سے ہی یہ نگار خانۂ رقصاں ترتیب پاتا ہے، حرکت میں آتا ہے۔ ہر شاعر قاری سے اشتراکِ عمل کا طالب ہوتا ہے،

مصحفی کچھ زیادہ ہی۔ یہی کیفیت اس شعر کی ہے۔

اس کا مستی میں جو لغزش سے قدم پڑتا ہے
قدِ نازک میں عجب طرح کا خم پڑتا ہے

مصحفی کی توانائی کا بھید ہی یہ ہے کہ اس کے تخیّل کے قدم زمین پر رہتے ہیں اور وہ جو کچھ سوچتا ہے اور محسوس کرتا ہے، اسے دیکھتا ہے، چھوتا ہے، سونگھتا ہے اور کبھی کبھی سن بھی لیتا ہے۔ جس طرح سیّاح زرِ مبادلہ کو مقامی سکّۂ رائج الوقت میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی طرح مصحفی خیالات اور احساسات کے زرِ مبادلہ کو جانے بوجھے دیکھے بھالے پیکروں کی مقامی کرنسی میں بدل کر اپنا کام چلاتا ہے۔ وہ فلسفی نہیں مصوّر ہے، خیال آرا نہیں پیکر تراش ہے۔ فلک رَس نہیں زمیں گیر ہے:

شبِ وصل گر اپنا مقدور ہوتا
لگا دیتے ہم قفل بابِ سحر پر

غیر مرئی کو قالب عطا کرنا مصوّر کا کمال ہے۔

ایک اور متحرک تشبیہ دیکھیے جو تصویر آفریں بھی ہے، اثر انگیز بھی:

اے مصحفی کہیں کیا جوں شمع داغِ غم نے
آخر بٹھا دیا ہے ہم کو گھلا گھلا کر

''بٹھا دیا'' کے کوزہ میں ساری داستان عشق سما گئی ہے۔

اس شعر میں باصرہ اور سامعہ، تصور اور ہوس آمیز محبت باہم دست گریباں نظر آتے ہیں:

اوّل تو یہ دھج اور یہ رفتار غضب ہے
تس پر ترے پازیب کی جھنکار غضب ہے

یہاں تشبیہ مشاہدہ اور حافظہ میں ناتہ جوڑ رہی ہے، قدرت حُسنِ انسانی کو خراج ادا

کر رہی ہے، عشقِ اداشناس کے سایۂ عاطفت میں:

کلائی اس کی جس دم بوجھ سے گجرے کے مڑتی ہے
لچکنا یاد آتا ہے مجھے پھولوں کی ڈالی کا

غالباً طالب آملی کا شعر ہے:

ز غارتِ چمنت بر بہار منّت ہاست
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

باوجود غایت لطافت ومضمون آفرینی کے طالب کا شعر مصحفی کے شعر کا حریف نہ تصویر گری میں ہے نہ عشق انگیزی میں۔

لیکن جس نگار خانہ کی ہم سیر کر رہے ہیں، جو پردۂ سیمیں ہماری نگاہوں کے سامنے ہے وہ سراپائے محبوب کی ہوشربائی تک محدود نہیں ہے، اس میں مصوّر کی خود بنائی اپنی تصویریں(Portraits) بھی نظر آتی ہیں۔

آستانے سے ترے جس شب رکھا طالع نے دور
سجدہ گہہ اس شب میں اپنا کاسۂ زانو کیا

کاسۂ زانو کو سجدہ گاہ کرنے میں فراق شاعر کی اداسی اور حرماں نصیبی کی داستان مصوّر ہوگئی ہے۔ کاسۂ زانو کی بلیغ اور نادر ترکیب پر دھیان دیا جائے یا اسے سجدہ گاہ بنانے کی جگر گداز تصویر کو دیکھا جائے۔ مصحفی کے یہاں ایسی تراکیب اکثر ملتی ہیں جو خواب رُبا ہوتی ہیں اور تصویر بردوش جو چونکا دیتی ہیں اور جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔

یہ تصویر فطرت اور عادت کو آئینہ میں اتار لائی ہے:

جب اس نے چلائی تیغ ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

ساکت کو حرکت میں لانے کی ایک اور مثال

ہے آج کچھ وہ ابروئے خمار بے طرح
چلتی ہے آپ ہی آپ یہ تلوار بے طرح

اس تصویر محل میں محبوب کی چھب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور عاشق کی خاموشی خود تصویر درد بنی ہوئی ہے:

دامن کی اک جھپک نے مدہوش کر دیا ہے
مثلِ چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے

نگار خانہ میں دو اور تصویریں رقصاں نظر آ رہی ہیں۔ چلیے انھیں بھی دیکھتے چلیں:

سحر ہے رخ پر ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح
سیکھے تجھ سے کوئی پیارے، دل کو لے جانے کی طرح

کل جو وہ رستہ میں ناگہ مل گیا، تھی دیدنی
میرے رَہ جانے کی وضع اور اس کے رُک جانے کی طرح

کسی نے کچھ نہ کہا اور سارا قصہ دہرا دیا گیا۔ یہی وہ خاموشیاں ہیں جو نطق سے زیادہ گویا ہیں۔ یہ وہ اضطراری حرکات ہیں جن کے آئینہ میں جذبات کی تصویریں اتر آئی ہیں۔ ان کی محبت کتنی حسین ہوگی جن کا ایک دوسرے کو دیکھ کر رستہ میں رہ جانا اور رُک جانا ہی سراپا جمال ہے۔

یہ نگار خانۂ رقصاں بے حد جاذبِ نگاہ ہے بلکہ جاذبِ حواس۔ اسی لیے میں اس میں اتنی دیر ٹھہر گیا، لیکن اس کے دریچوں سے ناظرین نے قصرِ مصحفی کے دوسرے ایوانوں میں بھی جھانک لیا ہوگا۔ اس مضمون کا عنوان نگار خانۂ رقصاں، رکھنے میں رقص کے عشقیہ اور جنسی مضمرات بھی کسی حد تک مدِّ نظر تھے۔ مصحفی محبت کا شاعر ہے۔ شدید، بے محابا، بے حجاب، ہمہ گیر، دل گداز، نشاط انگیز محبت کا شاعر:

انداز محبت کے کوئی سیکھ لے ہم سے
کہتے ہیں جسے عشق وہی فن ہے ہمارا

محبت، دل برشتہ، پُر گداز محبت...

وہ جو ملتا نہیں، ہم اس کی گلی میں، دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

نے اُنس کے خواہاں ہیں نے پیار کے بھوکے ہیں
ہم لوگ ہیں بازاری، دیدار کے بھوکے ہیں

لیکن شاعر یہ رَو میں کہہ گیا۔ میاں مصحفی اُنس کے بھوکے ہیں پیار کے بھوکے ہیں اور پیار بھی ماورائی نہیں ارضی، مصحفی کی محبت میں صرف روح کی تشنگی نہیں بدن کی پیاس بھی ہے۔ اردو غزل میں حواسی لذّتیت کو دو ترجمان ملے: ایک مصحفی دوسرا فراق۔ حُسن کے انداز وغمزہ، ناز وتبختر کی ادا شناسی اور جسمانی جمالیات کی نکتہ رسی اور عشق ومستی کے شواہد اوراقِ مصحفی میں بکھرے ہوئے ہیں:

جی میں آتا ہے کہ بوسہ کفِ پا کا لے لوں
رنگ ہونٹوں پہ تری تازہ حنا کا لے لوں

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

کس حُسن سے باہم یہ اشارات ہیں ان کی
ٹک دیکھ تو تو مجلس خوباں کا تماشا

میاں مصحفی لیلام میں کل ہم بھی گئے تھے
کر آئے ہیں اک طرفہ فرنگن کا نظارا

آخری تینوں شعروں میں بوالہوسی اور حُسن پرستی کی آمیزش ہے۔ جگر مرادآبادی کو اس شعر پر ناز تھا۔

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی ان کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالمِ پُر آب ان کا

جگر کو شاید خبر بھی نہ ہو کہ ان کے (موجودہ) ضلع کا سب سے بڑا شاعر حسن کے التہابِ ناز کو پہلے ہی آئینہ دکھا چکا ہے:

گرمیٔ حسن کی تاثیر سے کچھ آپ ہی آپ
پھول سا چہرہ ترا غرقِ عرق ہونے لگا

مصحفی کے مشربِ عشق کا ترجمان یہ شعر ہے:

میں نگاہِ پاک سے دیکھے تھا ترے حُسن پاک کو اس پہ بھی
مرے جی میں خواہشِ وصل تھی، مرے دل میں بوس و کنار تھا

اے مصحفی افسوس کہاں تھا تو دِوانے
کل اس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

معشوقِ تصوّر نے مجھے سامنے اپنے
تا صبح دو زانو شبِ ہجراں میں بٹھایا

جو شاعر تنہائی سے اس حد تک نفور ہو اور اس قدر ڈرامائی اور بہم آمیز فطرت لایا ہو کہ تصوّر کو معشوق بنا کر اس کے سامنے رات بھر بیٹھا رہے وہ خود کو روبرو بٹھا کر بات کرنے سے کب چوکے گا۔ چنانچہ شاعر جا بجا مصحفی سے اس انداز سے خطاب کرتا ہے گویا میاں مصحفی اس کے یارِ غار ہیں۔

اس تصویر کی پُر تاثیر، سحر اندوز لطافت سے حظ اٹھایئے:

لطف اس گورے بدن کا کیا کہوں میں وقتِ غسل
پڑتے ہی پانی کے قطرے اس پہ گوہر ہو گئے

مصحفی کا اندازِ نظر اور پیرایۂ بیان ڈرامائی ہے۔ جذبات اور کیفیات، تجربات اور واردات اس کے سامنے مصوّر اور مجسم ہو کر آتے ہیں اور وہ ان کو بے کم و کاست ناظرین کے سامنے پیش کر دیتا ہے:

جب شاہدِ شباب نے عزمِ سفر کیا
رخصت ہو اس کے ساتھ چلا زندگی کا حظ

کل اُس نے عکس کا اپنے جو لے لیا بوسہ
تو جی ہی جی میں ہوئی کیا ہی آرسی محظوظ

مذکورہ بالا شعر میں آپ اس پَری پیکر کو ہی نہیں دیکھ رہے ہیں، بلکہ آئینہ میں اس کے عکس کو بھی اور نظر باز عاشق کو بھی جو چھپ کر اسے محوِ تزئیں اور سرشارِ مئے حُسن دیکھ رہا ہے۔ عکس کا بوسہ لینے میں جوانی سے بھرپور، جذبات سے بے تاب اور جمال سے سرشار محبوب کا چترن चित्रण بھی ہے اور اس ناز و تفاخر کی عکاسی بھی جو مشتاق نگاہوں کی آہٹ نے اس کے دل میں بیدار کر دیا ہے۔ اس تصویر کو آپ (Objective Correlative) یا لازمۂ خارجی قرار دے سکتے ہیں۔ لازمۂ خارجی کا استعمال، کیفیات و جذبات کے اظہار کے لیے مصحفی نے اس انداز سے کیا ہے جس نے اس کی تعیم اور تفہیم دونوں کو محظوظ رکھا۔ ٹی ایس ایلیٹ اور اس کے ہم دبستانِ جدید شعرا کی طرح نہیں جنھوں نے اس کے زیرِ سایہ اشعار کو غیر الفہم بنا دیا ہے اور ان کی اپیل کو محدود کر دیا ہے۔ لیکن فراق سے یہ سمجھنے میں سہو ضرور ہوا کہ مصحفی کے دواوین میں جو پیکر تراشی ہے وہ (Objective Correlative) کی آلۂ کار ہے۔ ایسا صرف کہیں کہیں ہوا ہے۔ اس جملۂ معترضہ کو چھوڑ کر پھر نگار خانہ کی طرف چلتے ہیں:

میں تجھ سے اور تو کیا چاہتا ہوں اے گلِ تر
کرے ہے مجھ کو تری خشک آشتی محظوظ

گلِ تر کی شامۂ نواز، باصرہ افروز تشبیہی تصویر سے قطعِ نظر، خشک آشتی، کی ترکیب ملاحظہ ہو۔ فارسی شاعر نے کہا تھا:

بہ دور گردی من از غرور می خندد
حریفِ سخت کمانے کہ در کمیں دارم

دور گردی کی ترکیب اپنے دوش پر ایک تصویر بھی لائی ہے اور جہانِ معانی بھی، یہی حال خشک آشتی کا ہے۔ مصحفی کی ترکیب ندرت، جامعیت اور آداب شناسی اور ادادانی اور اطوار کشی میں "دور گردی" کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ مصحفی کے یہاں اختراعِ تراکیب کا عمل حیرت خیز دلکشی رکھتا ہے اور یہ جبھی ہوتا ہے جب محبت کی آنچ الفاظ کو پگھلا کر نئے سانچے تیار کرتی ہے۔

ڈرتا ہوں بادِ دامن خوباں سے بجھ نہ جائے
یہ دل کہ بن رہا ہے سرِ راہ کا چراغ

دیکھا تھا اک دن تری طرزِ خرام کو
موجِ نسیم صبح سنبھلتی ہے اب تلک

موجِ نسیم صبح کے سنبھلنے میں حُسن تعلیل تصویر بداماں ہے۔
مرہونِ مشاہدہ مضمون آفرینی میں صورت گری کے انداز دیکھیے:

لختِ جگر کا اشک رواں میں یہ رنگ ہے
دریا میں جیسے جائے ہے مُردہ بہا ہوا

یہ نظارہ مصحفی نے گنگا، جمنا اور گومتی میں دیکھا ہوگا۔ اس نوع کی تشابیہ اُفق کو اچانک وسیع کر دیتی ہیں

ایک رقصاں تصویر دیکھیے جس میں سامعہ، باصرہ، لامسہ تینوں کی ضیافت کا سامان ہے:

ہے ایک تو گھنگھرو میں لچک قہر کمر کی
پھر تس پہ قیامت ہے یہ ہر جنبشِ پا گرم

مصحفی کو حُسن کی ایک ایک ادا کا ادراک تھا۔ "رمزِ تبسم" کا ادا فہم وہی دل باختہ اہلِ نظر ہو سکتا ہے جو مزاجِ حسن کی نزاکتوں اور عشوۂ نازِ حسن کی بلاغتوں کا محرم ہو:

ہیں ترے رمزِ تبسم کے ادا فہم جو شخص
جنبشِ لعلِ فسوں ساز میں مرجاتے ہیں

کشورِ ادا کی ایک اور متحرک تصویر نظر کے سامنے آتی ہے:

توسنِ ناز کو چھینکے ہے وہ جس دم سرپٹ
لوگ کیا کیا نہ تگ و تاز میں مرجاتے ہیں

اب جو شعر آرہا ہے اس میں ڈرامائی انداز ہے اور وہ صنعت جسے انگریزی علم بدیع میں Personification کہتے ہیں۔ ترجمہ جس کا تجسیم، تمثیل یا تشخص ہوگا۔ اس صنعت کے تحت شاعر کسی غیر مادّی وصف یا اعضائے جسم کو شخصیت عطا کرتا ہے:

جلد آ جلد کہ اعضا میں نہیں کچھ باقی
ان کی صحبت ہی ہوئی جاتی ہے برہم تجھ بن

غم رسیدہ سپردگی کے نقوش اس شعر میں درخورِ اعتناء ہیں:

کس نے ستایا ہے یہ ہم کو جو ہم آگے ہر اک کے
منھ سے کریں ہیں غم کا بیاں اور آنسو بہتے جاتے ہیں

کیفیتِ دُو عالم سوز و گداز سے قطع نظر، زبان کی سبک شیرینی کی طرف دھیان دیجیے۔

شمس و قمر نے دیکھ لیا ہے اس کے گورے مکھڑے کو
کوٹھے پر دن رات پڑے جو چیل سے وہ منڈلاتے ہیں

دیکھیے نگار خانہ پیہم رقص میں ہے۔ تشبیہ لطیف نہیں لیکن روز مرّہ کے مشاہدہ پر مبنی ہے اور محبوب کے گورے مکھڑے کے مقابلہ میں شمس و قمر کی تحقیر پر مشتمل ہے۔

گوشۂ چشم سے جب اس کی نگاہیں نکلیں
راست و چپ تھے جو کھڑے ان سے بھی آہیں نکلیں

میں یہ سمجھا تھا کہ میں ہی تجھے چاہوں ہوں فقط
ایک عالم کی میاں تجھ پہ تو چاہیں نکلیں

دوسرے شعر میں چاہ کی جمع چاہیں کتنی بھلی لگتی ہے۔ مصحفی کے دیوان میں ایسے بہت سے خوبصورت، مختصر اور مضمون بردوش الفاظ ہیں جنھیں بعد میں فارسیت کے نازیبا جوش، نام نہاد لطافت کی جستجو اور ذوق کی رداءت نے خارج کر دیا۔

حُسنِ تجسیم کی کیفیت ان دو اشعار میں ملے گی جنھیں بقول آزاد، میر تقی میر کی بلندی معیار نے لائق اعتناء سمجھا تھا:

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کو چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

اب نیاز و ناز کے اطوارِ نشست دیکھیے اور اس کے ساتھ پیرایۂ بیان کی صورت گری اور دلآویزی:

رہا تھا بیٹھ میں مدت سے سر بہ زانوئے غم
تری ہی تیغ نے پھر سر فراز کی گردن

تو میرے سامنے بیٹھا ہے، آہ تس پر بھی
پھری ہوئی ہے تری احتراز کی گردن

اس نگار خانہ میں انسانوں کا سراپا ہی نہیں قدرت کے مرقعے بھی ہیں جن سے فضا میں وسعت آتی ہے، آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے:

دیکھنے جاؤں ہوں جب لالۂ خود رَو کی بہار
کوسوں آتا ہے نظر دامنِ صحرا رنگین

ہر چند ''جاؤں ہوں'' متروک ہے اس کی نرمی اور اس کا صوتی حسن فردوسِ گوش ثابت ہو رہا ہے۔

دیکھیے تصویر کی تصویر ہے، کیفیت کی کیفیت:

پیری سے ہوگیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا
جس طرح صبح ہوتے کردیں چراغ ٹھنڈا

اس نادر اور دلآویز تشبیہ پر نظر کیجیے۔ تصویر جاذب نظر ہے لیکن ترتیب الفاظ میں تعقید ہے:

نتھ کے موتی یوں ہیں اُس کی، مہ کے ہالے کے قریب
اک ستارے کے قریں ہو، جوں ستارہ دوسرا

مصحفی نے اکثر اس طرز کو استعمال کیا ہے جسے مغربی عروض میں Enjambement یا Run-on کہتے ہیں۔ یعنی نحو مصرع کی تحدید قبول نہیں کرتی۔ یہ ترکیب عروضی بندشوں کو بیان کے حق میں ڈھیلا کر دیتی ہے۔ اردو عروض میں اسے نامحمود سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ اوقاف Punctuation کے استعمال کے بعد اس کا شمار محاسن میں ہونا چاہیے تھا۔

وہ دیکھیے نگار خانہ کے ایک گوشہ میں دو نازک سی تصویریں ایک دوسرے کو آئینہ دکھا رہی ہیں:

موتی سے جنبش اس کے بنا گوش کو نہ تھی
شبنم کے ساتھ برگِ سمن رعشہ دار تھا

اس شعر میں بھی دو تصویریں رو برو ہیں، مفہوم کے لحاظ سے بہم پیوست، خد و خال کے لحاظ سے علاحدہ:

مثلِ خورشید لبِ بام ہوں پل کا مہماں
شام کے ہوتے تو میں منھ ہی چھپا جاؤں گا

سامنے جو تصویر ٹنگی ہوئی ہے اس میں حُسن کو ہولی کھیلتے ہوئے دکھا کر ہولی کے حُسن کا مرقع کھینچا ہے:

ملا جو منھ پہ بھبھوت اس نے اپنے ہولی میں
اک آئینہ تھا کہ وہ ہو گیا غبار آلود

حصول اہلِ تردد کو کیا ہے دُنیا سے
مگر یہ ہوتے ہیں جوں آسیا غبار آلود

تشبیہ معنی خیز ہے اور نادر اور ''اہلِ تردد'' کی ترکیب ایک پوری نفسیاتی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ وجہ شبہ پر غور کیجیے۔

اس جگمگاتی ہوئی تشبیہ سے نگاہیں خیرہ ہوئی جارہی ہیں۔ غم کو یہ تابانی، یہ تنویر، یہ چراغاں سامانی پہلے کاہے کو ملی ہوگی:

لختِ لختِ دل میں ہے عکسِ فروغِ داغِ عشق
کیوں نہ میں اس کو کہوں آئینہ خانے کا چراغ

امیر کے قلعہ کا جگمگاتا ہوا، روشنی بکھیرتا ہوا شیش محل آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔
ایک تصویر میں اور حرکت ہوئی:

عشق کی راہ میں یوں ہوتے ہیں فرسودہ درست
جیسے گھس گھس کے بنیں بانٹ کے روڑے پتھر

اہلِ ذوق چیں بہ جبیں ہوں گے کہ غزل میں بانٹ روڑے پتھر کا کیا محل۔ یہ تو غزل کے آبگینہ کو چکنا چور کردیں گے۔ لیکن یہ اس شعر کی دلکشی اور غیر مترقبہ معنویت کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ مفہوم یہ ہے کہ محبت شخصیت کی انانیت اور کجی اور اس کے ٹیڑھے اور ترچھے زاویوں کو ہموار کرکے رکھ دیتی ہے۔ پہاڑی ندی اپنی قیامت کی چال میں چٹانوں کو توڑتی ہوئی اپنے ساتھ بہالاتی ہے۔ راستہ بھر وہ پتھر ایک دوسرے سے اور ساحل سے

ٹکراتے چلے آتے ہیں، موجوں کے طمانچے الگ کھاتے ہیں۔ نوکیں ٹوٹ جاتی ہیں، زاویے گھس جاتے ہیں، ناہمواریاں باقی نہیں رہتیں۔ محبت کی ندی افراد کے ساتھ یہی برتاؤ کرتی ہے۔

تصویر خانہ کے اس گوشہ کی طرف نگاہ کیجیے، ایک دہقان سر پر گٹھری لیے چلا جا رہا ہے، قریب آیا تو تماشائی چونک اُٹھے نہ یہ دہقان ہے نہ یہ گٹھری، میاں مصحفی کی طرح ایک عام انسان ہے، بلکہ ہر انسان Every man ہے۔ یہ زندگی جس پر وہ نازاں ہے، جس پر وہ پھولا نہیں سماتا، ہوا کا کھیل ہے، سانس پر قائم ہے۔ جیوں ہی سانس کا تار ٹوٹا غفلت اور گھمنڈ کا یہ کھیل ختم ہوا۔

اے مصحفی سمجھ تو، ناداں کہاں چلا ہے
سر پر پَون کی گٹھری مثلِ حباب لے کر

پھول سب جھونک میں دامن کی بجھے جاتے ہیں
باغباں قہر خدا کا ہے یہ رفتار نہیں

رفتار کیا ہے، نخوت خراماں ہے۔ ''جھونک'' کے ایک چھوٹے سے لفظ نے ایک کیفیت کو اسیر کرلیا، ایک سماں باندھ دیا، ایک متحرک تصویر ملکۂ حُسن و ناز کی کھینچ کر رکھ دی۔ ''جھونک'' کی بلاغت اور پَون کی گٹھری، کی موزونیت بتا رہی ہے کہ بہت سے ہندی الفاظ کو ترک کر کے اُردو نے اپنا دامن ناحق تہی کیا۔

غالب کے شعر:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کی ہئیت اولی مصحفی کے اس شعر میں دیکھیے :

زندگی کو مصحفی لازم پڑا ہے سوزِ عشق
بن بجھے ہرگز نہیں آرام پانے کا چراغ

غالب نے زبان کو سنوار دیا لیکن مصحفی کے دعوے کے بطن میں بدیہی دلیل موجود ہے۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں دیکھیے کہ سامنے اس محفل میں کیا ہو رہا ہے۔ ایک پری رُو مسند آرا ہے، اس کے حضور میں یہ کون بزرگ ہیں جو کورنش پر کورنش کیے جا رہے ہیں، وہاں نخوت اور تمکنت کا یہ عالم کہ زبان یا ہاتھ سے جواب در کنار گردن کے اشارہ سے بھی سلام قبول نہیں کیا جا رہا:

ہر چند میں جھک جھک کے کیے سیکڑوں مُجرے
پر خم نہ ہوئی اس بُتِ مغرور کی گردن

ایک اور تصویر پر نگاہ جاتی ہے جس میں سنگ تراش نے نیاز اور ناز کے پیکر بنا دیے ہیں:

خنجر کی آب جس کو پلا کر چلے ہو تم
اک دم تو اس کی تشنہ لبی پھر کے دیکھ لو

ظاہر ہے کہ وہ پیکر ناز پھر کے دیکھنے والا نہیں لیکن تصویر گر شاعر کا کمال یہ ہے کہ آپ اس پیکر ناز کو مڑ کر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری مصوری سے بازی لے جاتی ہے۔ شاعر قاری کی تخیّل کے ہاتھ میں موقلم دے دیتا ہے۔

یہ شعر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا، بلکہ مکالمہ کو مُصوّر کر کے:

تم سے اے آنسوؤ مجھ کو یہ گلہ ہے کہ کبھی
اس کے رخسار تلک بھی نہ نظر جانے دو

محبوب کی حشر سامانی کا یہ ڈرامائی مرقّع دیدنی ہے:

فتنہ سے یوں کہے ہے تری شوخیٔ خرام
میں سیر کو چلوں مرا دامن سنبھال تو

یہاں بھی سامعہ باصرہ کو حرکت میں لاتا ہے۔ ایک محوِ خرام ملکۂ حسن کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے جس کے فرشی غرارہ کے سرے کو ایک طفل اُٹھائے ہوئے ہے۔

اُدھر دیکھیے وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر رکھے ہیں:

کر پیشہ تو کرم کہ برائے دعائے خیر
اُٹھتے ہیں ہاتھ سیکڑوں دستِ کرم کے ساتھ

کن انکھیوں سے دیکھیے ناز و نیاز کے اس سین کو:

اس نے جو رکھا اک انداز سے رخسار پہ ہاتھ
رہ گیا محو میں رکھ اپنے دلِ زار پہ ہاتھ

میری اور اس کی عجب ڈھب کی کنایت ہوئی کل
میں جو گھورا تو رکھا اس نے بھی تلوار پہ ہاتھ

سامنے گلی میں راستہ ٹٹولتا ہوا یہ کون جا رہا ہے۔ نابینا ہے بے چارہ:

کوچۂ زلف میں دل بھٹکے ہے یوں جوں شبِ تار
کوٗر رکھتا ہوا جاوے کہیں دیوار پہ ہاتھ

تشبیہ کی ندرت اور تصویرِ خراماں کی معنویت پر غور کیجیے:

ایک ہاتھ سے دستار کو سنبھالے ہوئے آسمان کی طرف یہ کون دیکھ رہا ہے۔ یہ تو خورشید نکلا ہے:

مصحفی بس کہ سلیماں کا نشیمن ہے بلند
رکھ کہ دیکھے ہے اسے مہر بھی دستار پہ ہاتھ

مصحفی کے مصوّرانہ تخیل اور ان کی طرف سے تیغِ قاتل کی پُر جوش پذیرائی کے شواہد اس شعر میں شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں:

کھولتی کیوں نہیں آ کر مری چھاتی کے کواڑ
میں تو کچھ بند نہیں کی تری تلوار کی راہ

اندازِ بیاں پُر تصنّع ہونے کے باوجود پُر اثر ہے۔
کہیں آگ لگی ہے کیا؟ دھواں کیوں اُٹھ رہا ہے؟:

کوئی دل سوختہ قیدی ہے مگر زنداں میں
کہ نکلتا ہے دھواں رخنۂ دیوار کی راہ

گویا کہ بول اُٹھے گی ابھی، کلکِ صنع نے
کھینچی ہے اس ادا سے مرے یار کی شبیہ

کلکِ صنع کی طرح موقلم نے بھی جو شبیہ کھینچی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی بول اُٹھے گی۔ یہ شبیہیں متحرک ہیں۔

مانی گلے میں اس کے مرے ہاتھ ڈال دے
اور نام اس شبیہ کا رکھ پیار کی شبیہ

مانی بے چارے کو عمرِ خضر درکار ہو گی اگر وہ مصحفی کے نگار خانۂ رقصاں کو صفحۂ قرطاس پر ساکت کرنے چلا۔

یہ بچوں کی ٹولی کیا کر رہی ہے۔ ایک بلبل ہاتھ آ گئی۔ سب اس کا پیچھا کیے ہوئے ہیں:

پکڑ بلبل کو کیسے لگ پڑے ہیں کودکاں ہے ہے
کوئی پاؤں میں ڈوری ڈالے ہے، باندھے ہے پر کوئی

یہ تو بلبل کا حال تھا، خود مصحفی کی ہیئت کذائی دیکھیے۔ یہ بھی منجملہ ان بے شمار اشعار کے ہے۔ جن میں کیفیات اور تاثرات کو شاعر نے مرئی شکل دی ہے:

نہیں میں اس کے کوچے کی طرف کچھ آپ سے جاتا
ادھر کھینچے کوئی رسّی گلے میں باندھ لے جاتا

تشبیہ سادہ اور بے ساختہ ہے یہی مصحفی کا رنگ ہے، یہی اس کی تاثیر کا راز اور یہی

ہے اس کی تازگی، ندرت اور شگفتگی کی بنیاد۔

یوں ہاتھ اس ابرو کا ہے خم چشم پہ تیری
جس طرح کسی مست کو ہشیار سنبھالے

یہاں بھی تشبیہ مرکّب اور متحرک ہے اور اس لیے دلنواز اور حیرت خیز۔

اشک یوں لختِ جگر لے کے چلا، جوں گھر سے
گٹھری کاندھے سے لگائے سفری نکلے ہے

مصحفی مشاہدہ کا شاعر ہے۔ اس کے تخیل کو مشاہدہ سے غذا ملتی ہے۔ اِن تشابیہ اور تصاویر نے جو روزمرّہ کے مشاہدات و تجربات سے ماخوذ ہیں مصحفی کی شاعری کے افق کو وسیع اور اس کے شگوفہ ہائے شعر کو شگفتہ کر دیا ہے۔

مصحفی کی تخئیل کا محبوب مشغلہ ہے بے جان اشیا و صفات اور اعضا و جوارح کو افراد کے روپ میں دیکھنا:

کرتے نہ ورم پانو جو دیوانے کے تیرے
آغوش نہ یوں حلقۂ زنجیر کی بھرتی

اس اپنے غمزۂ چالاک کو ابھی اے شوخ
سمندِ ناز پہ یوں ہی سوار رہنے دے

کیا کیا نہ سرکشوں کی یہ عیّار آسماں
پگڑی اتار لیوے ہے دستِ ستم بڑھا

دیکھیے سادہ سا مضمون تھا کہ قدرت سربلندوں کی آبرو ریزی کرتی ہے۔ اس مضمون کو شاعر نے پردۂ سیمیں کے حوالے کر دیا۔ مصحفی کی اپیل کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ غیر مرئی کو مرئی روپ دے کر ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ اسی وضع کا ایک اور شعر سنیے:

مصحفی خوب ہوا یہ کہ کشاکش میں بہم
رشتۂ الفت یاران دو رو ٹوٹ گیا

''دورو'' کتنی چھوٹی سی خوبصورت اور پُر معنی ترکیب ہے۔

ہے قیس کے ساتھ فوجِ طفلاں
دیوانے کی شان دیکھیو ٹک

ٹک صفحۂ زمیں کے خاکے پہ غور کر لو
صانع نے اس پہ کیا کیا شکلیں اتاریاں ہیں

قدرت کے مظاہر اور اس کی طاقتوں کو یہ تمثیل نگار شاعر اپنا ہمجولی سمجھتا ہے:

ضعف اتنا ہے کہ پہنچوں نہ میں گلزار تلک
ہاتھ میں ہاتھ نہ تا بادِ صبا کا لے لوں

ڈرتا ہوں کہ اودھر کو اکیلا یہ گیا ہے
گھر جائے نہ دل ناز و کرشمہ کی سپہ میں

محبوب کی اداؤں کو مجسم کرتے ہوئے شاعر نے نہتے دل پر یورش کی تصویر کھینچ دی۔
وہ دیکھیے محبوب کے بانکپن کے جیتے جاگتے نقوش ڈرامائی انداز میں بروئے کار آرہے ہیں:

کس پر ہے یہ تلوار بجی، پھر کے تو دیکھو
کس پر ہے یہ ابرو کی کجی، پھر کے تو دیکھو

آنکھوں میں لگایا ہے دھواں دھار جو کاجل
منظور ہے کیا اس سے اجی، پھر کے تو دیکھو

کیا پیٹھ دیے بیٹھے ہو بیمار سے اپنے
ہے اس کا ادھر آنکھوں میں جی، پھر کے تو دیکھو

''پیٹھ دیے بیٹھے'' کا ٹکڑا ہی نہ جانے کتنے اوراق مصور کا طالب ہوگا اور پھر یہ زبان صاف کہہ رہی ہے کہ میں لکھنؤ کی دین ہوں۔

آنکھوں میں اس کی میں نے جو تصویر کھینچ لی
سرمہ نے اس کی چشم کے شمشیر کھینچ لی

مذکورہ بالا دو مصرعوں میں نیاز و ناز کی ساری داستان اپنے تمام ڈرامائی امکانات کو بروئے کار لے آئی ہے۔

نگار خانہ میں ایک طرف ہنگامہ برپا ہے، ایک چور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے:

بالوں کی اس کے نکہت گلشن کو لے چلی تھی
رستے میں ہم نے پکڑی بادِ صبا کی چوری

آغاز کیا پھر دلِ بدبخت نے رُونا
دیوانے کو کیوں ہم نے گلستاں میں بٹھایا

گویا بدبخت کا مصحفی سے کوئی تعلق ہی نہیں، اس کی بے محل گریہ وزاری نے مصحفی کا لطف کرکرا کردیا اور دوسروں کی نگاہوں میں اسے سُبک کردیا۔

تصویر کشی میں موقلم کی جنبش کا اختصار اور رنگوں کی کفایت دیکھنا ہو تو میاں مصحفی کے سربہ گریباں رہنے کا سماں دیکھیے۔ ایک حرف ''ق'' سے پوری تصویر کھینچ دی ہے:

آٹھوں پہر جو سر بگریباں رہوں ہوں میں
نکلے ہے بیٹھنے میں مرے ''ق'' کی ادا

ایک صنم کو بنتے ہوئے اور ایک آبگینہ کو ٹوٹتے ہوئے دیکھیے اس شعر کے بُخرفہ سے:

سنگ کیا توڑنے کو چاہیے اس شیشہ کے
دلِ نازک جو بہ یک گردشِ رُو ٹوٹ گیا

ثقاہت مانع نہ ہو تو ایک ماہ لقا کو نہاتے دیکھیے، صبر سوز اور ضبط آشام حجابِ اظہار آگیں کے ساتھ:

نہانے میں بھی ہے اس کو حجاب در تہِ آب
رکھے ہے بالوں سے منھ پر نقاب در تہِ آب

ہر ایک موج جو ساحل سے سر پٹکتی ہے
کسی کے دل کو تو ہے پیچ و تاب در تہِ آب

جھلک بدن کی ترے ہے یہ رخت آبی میں
کہ جیسے جلوہ کرے آفتاب در تہِ آب

پہلے اور تیسرے شعر میں وہی حواسی لذّتیت ہے جس کی طرف سب سے پہلے فراق نے دھیان دلایا اور جو لکھنؤ کی معاملہ بندی سے جدا ہے۔

آستیں قاتل نے کب خوں سے ہمارے پاک کی
جب بہت رنگیں ہوئی، کُہنی سے آدھی چاک کی

وہ دیکھیے کالا ناگ کیسے ڈس رہا ہے۔ آنکھیں مل کر غور سے دیکھیے تو دکھائی دے گا کہ یہ سانپ غم ہے جو مصحفی کا لہو پی رہا ہے:

مارِ سیاہِ غم کوئی ہوتا ہے یوں جدا
جب تک نہ میرے جسم کا سارا لہو پیے

لیجیے زُلف آئینہ کی رقیب ہوگئی:

اب دیکھیے آئینہ کی ہو کیونکہ رسائی
زلفوں کو ہوئے ہیں ترے رخسار حوالے

نہ معلوم کب سے مصحفی صورتِ قاف سر بہ زانو ہے سر اُٹھائے تو کیوں کر کہ وہ خیالوں کے ایک پہاڑ کے نیچے دبا ہوا ہے:

رکھ دیا ہے سر پہ اک کوہِ خیال
سر کو زانو سے اٹھاؤں کس طرح

درد کی شدّت سے مملو اور زورِ بیان سے معمور ہے یہ شعر جو ظرف بنا ہے ایک معنی خیز مرکب اور متحرک تشبیہ کا:

مانند پیہ شمع بہ فتوائے سوزِ عشق
سب اشک ہو بہے گا مرے جسم و جاں کا مغز

حمائل عید کی شب جوں کیے اس گل نے ہاتھ اپنے
گلے میں میرے گویا پڑگئی زنجیر مہندی کی

مہ لقا کے حنا بستہ ہاتھوں سے جو شاعر کی گردن میں حمائل ہیں اگر نظر ہٹے تو اندازہ ہو کہ مہندی کی زنجیر کی گرفتاری کی طرف بھی اشارہ کررہی ہے۔

حواسی لذّتیت نکھرتے ہوئے حُسن کو خراج ادا کر رہی ہے:

لطف اس گورے بدن کا کیا کہوں میں وقتِ غسل
پڑتے ہی پانی کے قطرے اس پہ گوہر ہوگئے

لیکن سارے بدن کی عریانی سے زیادہ حشر ساماں بانہوں کی نیم بے حجابی ہے۔ خود تصور کیجیے اور مصحفی کے پُر جمال نقاب برافگن حسیّاتی تصور کی داد دیجیے:

آستیں اس نے جو کُہنی تک چڑھائی وقتِ صبح
آگئی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

بدن کے حُسن کی اداشناسی، نکتہ رسی اور پرستش مصحفی کا حصّہ ہے۔

کھینچا ہے جو اس بُت نے کئی رنگ کا قشقہ
آتا ہے نظر عالمِ نیرنگ جبیں پر

مصحفی کی نگاہِ محبت کی ہوسنا کی سے وہ سمن بر بے خبر نہیں:

کہے ہے دیکھ نگاہوں کو میری وہ بُتِ شوخ
یہ جی میں ہے کہ تم ایسے سے احتراز کرو

والہانہ محبت کی طغیانی کا اندازہ اشعار سے لگایئے:

بالوں کو اس کے دیکھ کے میں مبتلا ہوا
بالوں کا کھولنا مرے حق میں بَلا ہوا

یہ جی میں ہے سراپا لاد دیجے تجھ کو گہنے سے
پھر اس کے بعد تجھ سے عشق بازی اے صنم کیجے

راست پوچھو تو میاں تم پہ ہے ختم
کج روی، کج نگہی، کج کُلہی

مسّی جو لگائی لب جاں بخش پہ اس نے
ہم سمجھے اسے چشمۂ حیواں کی سیاہی

صدقے میں گیا، کتنی بھلی لگتی ہے مجھ کو
ساتھ آنکھوں کی سرخی کے یہ مژگاں کی سیاہی

آخری شعر کی سادہ بے ساختگی دل باختگی کی غماز ہے۔

مصحفی کی آوارہ حسن پرست نگاہ کا محبوب مشغلہ یہی ہے کہ قلم رو جسم کے سحر انگیز خطوط اور طبقات کی سیاحت کرتی رہے:

مہر کو دیجیے رخسار سے اس کے تشبیہ
جس کے تلووں سے ضیا مانگ کے لایا رخِ صبح

چاک پیراہنِ ساقی پہ پڑھوں کیوں نہ دُرود
جس کے سینے کے تلے کچھ نظر آیا رخِ صبح

پڑے بال بھیگے ہوئے جب کمر پر
وہیں برق ہنسنے لگی ابرِ تر پر

صفائے بدن کا کہوں کس سے عالم
ٹھہرتی نہیں آنکھ اس سیم بَر پر

روشن ہوئی ہے شعلۂ فانوس سے یہ بات
چھپتے ہیں اہلِ حسن کوئی پیرہن کے ساتھ

سرِ نیاز رہا زیرِ پائے یار مدام
حنا کی طرح میں قدموں سے کب لگا نہ رہا

بھیگے ہوئے، بکھرے ہوئے بالوں، گورے پیرہن سے جھلکتے ہوئے بدن اور حنا آلود تلووں کے نقوش کئی زاویوں سے کھینچے گئے ہیں اور شاعر نے تشبیہ، استعارہ، رعایت اور جسارت سب کو اسی غرض سے صَرف کیا ہے۔ یہاں محبت ہے، حسن پرستی ہے، نظر بازی ہے اور جسم کا جاگتا ہوا جادو ہے۔

مصحفی کے یہاں ابتذال، عریانی، بھونڈے پن اور ارزاں معاملہ بندی کی مثالیں کوئی کم نہیں۔ انھیں دُہرا کر میں آپ کو بدمزہ نہیں کروں گا۔ ہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ مصحفی یا اردو ادب کا نقصان ہوا کہ مصحفی دلّی چھوڑ کر لکھنؤ کے ہو رہے۔ مجنوں نے مصحفی اور لکھنؤ کے سلسلہ میں مزاج اور ماحول کے تصادم اور کفر ایماں کی کشمکش کی جو بات کی ہے وہ صرف ایک حد تک صحیح ہے۔ مصحفی اگر دلّی میں ہی رہتے تو بھی ان کے مزاج میں جو حُسن پرستی اور نظر بازی اور ان کی رگوں میں خون کی جو گرمی اور تن بدن میں جو پیاس اور ان کے تخیّل کی سرشت میں جو مصوری تھی وہ انھیں اسی راہ پر لے آتی جہاں خواہشِ وصل نگاہِ پاک کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور جہاں دل، خدّ و خال سے زیادہ، قامت کے نشیب وفراز اور صفائے بدن، قد و گیسو اور ادا و ناز اور حشر ساماں نیم بے حجابی پر آتا ہے اور جہاں جسم کا حسن اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ نہ صرف روح بلکہ بدن کے تاروں پر بھی زخمہ زن ہوتا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے ایک شعر دُہرا دوں:

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

توجہ کیجیے ذکر گومتی کا نہیں جمنا کا ہے۔ یعنی تاک جھانک یہ دیدہ دلیری، یہ نظر بازی، یہ آوارہ نگہی، یہ بوالہوسی، یہ جسم شناسی، یہ حسن پرستی لکھنؤ کی دین نہیں ہے۔ مصحفی دلّی سے اسے اپنے ساتھ لائے تھے کہ یہ ان کی سرشت میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ لکھنؤ کی فضا میں یہ رنگ اور شوخ اور گہرا ہو گیا اور معاملہ بندی بھی اس کی رفیقِ راہ بن گئی اور گاہ گاہ

ابتذال سے بھی اس کا دامن نہ بچ سکا۔

جو اشعار میں نے نقل کیے ہیں ان میں شوخی بھی ہے، ہوس بھی ہے، گاہ گاہ عریانی اور بے حجابی اور آوارہ نگاہی بھی ہے لیکن یہ رنگ لکھنؤ کی معاملہ بندی سے مختلف ہے۔ مصحفی کے یہاں لکھنوی معاملہ بندی کے اشعار بھی فراواں ہیں۔ یہ احتیاط اور امتیاز کا تقاضہ ہے اور تنقید کا مطالبہ کہ ایک کو دوسرے سے الگ رکھا جائے۔ جسم کے حجاب کو ساز کا پردہ سمجھ کر شاعر زخمہ زن ہوا ہے۔ اس نے محبت کو قالب عطا کیا ہے، روایتی محبت کی رگوں میں خون دوڑایا ہے، اسے ارضیت بخشی ہے۔ روح کے ساتھ حواس کو حظ اندوز ہونے کا موقع دیا ہے۔ مصحفی نے جسم کے حسن کی نقاب کشائی کی ہے، نغمہ سرائی کی ہے۔ اس وصف میں نہ دلی کا کوئی شاعر اس کا شریک ہے نہ لکھنؤ کا۔ اگر کوئی شریک ہے تو ہمارے دَور کا وہ شاعر جس نے راپتی کا تٹ چھوڑ کر جمنا اور گنگا کے سنگم پر ڈیرہ ڈالا۔ خود مصحفی کا کلام انعکاس واختلاطِ جسم وروح سے گنگا جمنی ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مصحفی کا تخیل، اس کا اندازِ نظر تصویر گر اور پیکر تراش ہے۔ اسی وصف کا ایک رخ ہے پیکرِ حسن سے شاعر کا انہاک، جسم کے جمال سے اس کا شغف، یہ اس کے ضمیر میں ہے۔ ستم ہے اگر ہم اس وصف کا ناتا لکھنؤ کے ماحول سے جوڑیں اور کفِ افسوس ملیں کہ مصحفی نے میر تقی میر کا رنگ کیوں نہیں اپنایا۔ فراق کی شاعری کی طرح ان کی تنقید بھی بلند وپست کے درمیان سفر کرتی ہے۔ فراق نے لکھا ہے ''میر کا سوز وگداز یا تو مصحفی نے پیدا کرنا نہیں چاہا یا ان سے پیدا نہ ہوسکا''۔ کوئی پوچھے سوز وگداز پیدا کب کیا جاتا ہے؟ یہ وصف کیا ریاضت سے حاصل ہوتا ہے؟

رہی متروکات کی بات جو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے حوالے سے آغازِ سخن میں چھیڑی گئی تھی۔ دراصل وقت آ گیا ہے کہ متروکات پر نظرِ ثانی کی جائے۔ بہت سے گراں قدر پُر معنی، پُر احساس اور پُر کیفیت الفاظ کو ترک کر کے کیا ہمارے شعرا نے اپنی زبان کو تہی مایہ

نہیں کر دیا؟ ذخیرہ الفاظ میں کمی بھی گوارا کر لی جاتی، لیکن ترکِ الفاظ کا ایک بے حد ضرر رساں پہلو یہ بھی ہے کہ بہت سے ہندی الاصل الفاظ کے کورانہ اخراج نے اردو کی جڑیں زمین سے نکالنی شروع کر دیں۔ دیسی مواد کم ہوتا گیا دیہی عناصر کو دیس نکالا ملتا گیا مقامی رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ قصرِ اردو کے کئی دریچے تازہ ہوا پر بند کیے جانے لگے۔ فارسیت غالب آتی گئی اور اردو شاعری خصوصاً اردو غزل فطرت سے بیگانہ ہونے لگی اور شہر و دربار میں اسیر ہو چلی۔ جن سے نکلنے کے لیے بعد میں اسے متواتر جتن کرنا پڑے۔ ادبی روایت ہے کہ ناسخ نے زبان کو صاف کیا۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ صفائی کے ساتھ ستھراؤ بھی کر دیا۔ غالب نے خیال بندی، مضمون آفرینی اور موشگافی اور بلند پروازی کے جوہر دکھائے لیکن ان کے یہاں تخیّل اور بیان کی لطافت نے غزل کو اس ارضیت سے محروم کر دیا جو شاعری کی دیرپا صحت کی ضامن ہے۔ یہاں اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے، صراحت ایک علاحدہ سلسلۂ مضامین کی طالب ہوگی۔

ہندی کے بہت سے الفاظ کو، چند مثالیں جن کی نیچے دی جا رہی ہیں، مصحفی نے بے تکلف استعمال کیا۔

> نِت (یعنی ہمیشہ) چِت (بمعنی دل) ٹکوریں، ٹک سَک، ووش (بمعنی الزام) چونا (ٹپکنا) بیندھنا، چک پھریاں، سرکاڈھنا (سرکاڑھنا)، بھگواں، مینھ، تس پہ کاجل کی دھنک، بِدان، کٹاریاں، بسرنا، جمدھر، سَمَاکھ، کوکا، بَچن، بھانت بھانت، لٹ کھٹ، بھبھوکا، مہاوٹ، ٹک، چرن، سانچ، کھوجنا، گھڑنت، جھونک، ڈلک جھپک، کھوٹ، سج، سدھ۔

یہ الفاظ اپنا الگ الگ حظ رکھتے ہیں، معنوی، فکری، صوتی اور مربوط سلسلۂ خیال۔ افسوس کہ فارسیت اور نام نہاد لطافت اور ٹھیٹھ شہریت کے جوش اور تہذیبِ زباں کے زعم نے ناسخ اور غالب اور مومن وغیرہم کو اس طرح کے جاندار اور ارض پیوست اور معنی خیز

الفاظ کے درپئے اخراج کر دیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ زبان کا افلاس اور تصنّع اور ماحول سے بے تعلقی اور فطرت سے دوری۔

مصحفی نے نہ صرف رائج الوقت ہندی الاصل الفاظ کو بے محابا استعمال کیا بلکہ بعض غزلیں ایسی زمینوں میں کہیں جن کی ردیف یا قافیہ ٹھیٹھ ہندی تھے۔ پہلے دیوان میں لپٹ کی ردیف کے ساتھ دو غزلیں۔ اس کے علاوہ ایک غزل کی ردیف ''سمٹ'' ہے، دوسرے کی ''لوٹ''

جب میں دیتا ہوں اسے پائے جنوں سے جھٹکا
موجِ دریا کی طرح جاوے ہے زنجیر سمٹ

خوبانِ سرخ پوش جو آئے تھے سیر کو
کہتے ہیں آج لے گئے سب لالہ زار لوٹ

اب زخمِ سینہ کس سے رفو ہو، کہ لے گیا
دستِ جنوں تمام گریباں کے تار لوٹ

خوباں نے ہم سے شہر میں کی یوں تمرّدی
صحرا میں جوں غریب کو لیویں گنوار لوٹ

پہلے شعر میں سیاسی اشارہ ہے۔ ''خوبانِ سرخ پوش'' سے فرنگیوں کی فوج مراد ہے۔ انگریزوں نے جس طرح ہندستان کو تاراج کیا اور یہاں کی دولت پر اپنی خوش حالی کی عمارت کھڑی کر دی، اس کے کربناک احساس نے مصحفی سے یہ شعر کہلوایا۔ سیاسی اشارے اور سماجی چتر کاری مصحفی کے کلام کا ایک مستقل وصف ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ دوسرے شعر میں شاعر نے ایک فرسودہ مضمون سے ایک نئی راہ نکالی ہے، تیسرے شعر میں تشبیہ کی تازگی مشاہدہ اور تجربہ سے ماخوذ ہے۔

غزل میں مقامی رنگ، فطری مناظر، دیسی مواد، سیاسی اشارے اور سماجی

انعکاسات کارواں در کارواں دیکھنا ہوتو کلیاتِ مصحفی کے اوراق اُلٹیے۔ ذرا سی کاوش کیجیے تو اس عہد کا ایک دلفریب تصویری محل ترتیب پا جائے۔ اس دَور کی سیاست اور معاشرت، تہواروں، تقریبوں، میلوں ٹھیلوں، کوچوں بازاروں کے دلکش باصرہ نواز جلوس آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ جو لوگ اردو شاعری کو غیر ملکی قرار دیتے ہیں ان کا ایک مسکت جواب مصحفی کی کلیات میں بھی ملتا ہے۔ زبان اور ادب کی بدقسمتی تھی کہ مصحفی کی روش کو بعد کے اساتذہ نے ترک کر دیا۔ ایک چمن کے بجائے جہاں گل و خار دست و گریباں تھے، جہاں زمین کہیں زرخیز تھی کہیں پتھریلی، جہاں پھولوں کی خوشبو زمین کی سوندھی مہک کے ساتھ گرمِ اختلاط تھی، انھوں نے پھولوں کا عطر کھینچا اور اسے شیشہ میں بند کر کے رکھ دیا، گویا پری کو شیشہ میں اتارا اور اس عطر کو تغزّل کا نام دیا۔ شدّت میں جو اضافہ ہوا وسعت میں اس سے زیادہ کمی آگئی۔ لطافت کا دامن پکڑا، تازگی ہاتھ سے گئی۔ خیال آفرینی کے درپے ہوئے، بے ساختگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سود و زیاں کا کوئی حساب لگانے بیٹھے تو عجیب انکشافات ہوں، ایسے انکشافات جو طمانیت کو برہم کر دیں۔ طمانیت کو برہم کرنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے جب کبھی تنقید کا رشتہ تقلید سے جُڑ جاتا ہے۔ میں یہاں مصحفی کے چند شعر نقل کروں گا جن کے آئینہ میں فطرت کے مناظر یا سماج کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔

جو تعزیوں میں ملاقات ہو مُحرّم میں
سلامِ دُور تو اس حورزاد کو پہنچے

گیا میں اس کی مجلس میں تو وہ درباں سے یوں بولا
یہ مجلس ہے کہ گزری، جو چلا آتا ہے ہر کوئی

اس سادگی پہ اور بھی ہم ذبح ہوگئے
دس دن دیئے جو اس نے محرم میں پان چھوڑ

پٹّی کے نیچے پایا تعویذوں کا دفینہ
کہتے ہیں کل یہ اس کے اسرار گھر سے نکلا

روئے وطن نہ دیکھا تو نے جو مصحفی پھر
شاید کہ چھینکتے تو اے یار گھر سے نکلا

آخری دونوں اشعار میں عملیات و توہمات کا ذکر ہے۔ اسرار کو مصحفی نے بہ طور واحد استعمال کیا ہے۔ واحد و جمع، تذکیر و تانیث کی بہت سی غلطیاں کلیات میں ملتی ہیں۔ عملیات کا سلسلہ جاری ہے:

ہوا نہ نرم ترا دل اگرچہ میں نے بہت
بہائے آب میں لکھ لکھ کے ہر سحر تعویذ

خدا کرے جو ترا سر دکھے تو مجھ سے کہے
کہ پھونک دے مرے ماتھے پہ کچھ دعا پڑھ کر

کر کے صدقے رکھ دیا دل یوں میں اس کی راہ میں
جیسے چوراہے میں رکھتے ہیں اُتارے کا چراغ

داغ دل سے کیوں نہ تسخیر پری زدیاں کروں
حاضراتِ جن پہ قادر ہے سیانے کا چراغ

گر عاشقی کرو ہو تو اس طرح جل بجھو
یوں ہے بہ سوئے اہلِ نظارہ ستی کی عرض

آؤ جب کرنے پر سفر ناگاہ
تیرہ تیزی نہ تم صفر دیکھو

ان دنوں مت سفر کو جاؤ میاں
ابھی عقرب میں ہے قمر دیکھو

کبھی فندق کبھی چھلّے کبھی تارے بناتا ہے
لگانے میں اسے آتی ہے سو تدبیر مہندی کی

لباس کی کسی نئی قطع کا تذکرہ:

تا بغل سینہ نُما وہ مہِ تاباں نکلا
اس زمانہ میں نیا چاکِ گریباں نکلا

طُرفہ اقلیمِ محبت میں یہ ہے رسم کہ ہائے
چھوٹتا عید کے دن بھی نہیں زندانیِ زلف

لائی ہے نرگسِ شہلا تری آنکھوں کے لیے
اپنی کجلوٹی میں پھولوں کا بسایا کاجل

اے مصحفی دریغ کہ خوبانِ سرخ پوش
آئے چمن میں، آگ لگا کر چلے گئے

''خوبانِ سرخ پوش'' کی جہاں سوزی اور غارت گری کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔
مندرجہ ذیل غزل تمام وکمال سیاسی اشارات سے بھری ہوئی ہے:

تیری بیدادی سے شہر اے فتنہ گر خالی ہوئے
قافلے لاکھوں گئے اور گھر کے گھر خالی ہوئے

اب تو بے کھٹکے چلے آؤ کہ ہے سُنسان شہر
لوگ لشکر کو گئے اور رہ گزر خالی ہوئے

کُشتگاں سے تیرے جب شہر اور نگر خالی ہوئے
تعزیہ داری کو ان کے کتنے گھر خالی ہوئے

لکھنؤ میں سادہ لوح غریب الوطن مصحفی کو مکر اور فریب کا سامنا کرنا پڑا۔

ذرا اے مصحفی ان لکھنؤ والوں سے بچتا رہ
کہ تو ہے بے شر اور یاں دور ہے ناداں شریروں کا

مصحفی نے اکثر تشابیہ مشاہدہ سے اخذ کی ہیں اور یہی راز اُن کی ندرت اور تازگی کا ہے۔

اسباب کیا نکالیں ہوئی ہم کو تب خبر
جب اپنے گھر کی نیو میں سیلاب آچکا

کوچۂ فقر بھی ہے طُرفہ مسافرخانہ
آیا جو اس نے یہاں آتے ہی بستر کھولا

سینہ کیوں کر نہ بنے تختۂ گازُر اپنا
زخم آئے ہیں برابر تری تلواروں کے

اس تشبیہ کو داد دیجیے:

ہنگامِ گریہ تاب و تواں کام آئے گا
یعنی یہ سب ذخیرے ہیں برسات کے لیے

بسانِ طائرِ تصویر تُو تو اے منعم
ہزار حیف گرفتارِ بام و در ہی رہا

مصحفی کو منعموں پر رشک نہیں ترس آتا ہے کہ در و دیوار کے یہ زندانی حُسنِ فطرت سے نا آشنا رہتے ہیں۔ سیر و سفر کا مصحفی شیدائی ہے:

ہر روز ہمیں گھر سے صحرا کو نکل جانا
کھیتوں کا مزا لینا جنگل کی ہوا کھانا

سطح پہ زمیں کی ہے تا حدِّ نظر سبزہ
کیا سیر کا عالم ہے اپنا ہے نہ بیگانہ

بال اس پہ نچوڑے تھے یہ کس بُت نے نہا کر
ہے کانِ گہر دامنِ ساحل کئی دن سے

رنجور جان مجھ کو کرتے ہو قصد میرا
زور آپ کا چلے ہے زخمی شکار ہی پر

یہ تشبیہ دیکھیے جس میں مضمون آفرینی کے علاوہ والہانہ محبت بھی ہے:

سرِ نیاز رہا زیرِ پائے یار مدام
حنا کی طرح میں قدموں سے کب لگا نہ رہا

اور یہ تشبیہ ایک نفسیاتی حقیقت کی حامل ہے:

ہر وقت اُٹھاتا نہیں دل ناز بُتاں کا
ہے کاہ بھی اک وقت گراں کوہ کے اُوپر

لطموں سے بحرِ حسن کے ہے زلف کا یہ رنگ
لہروں میں جیسے پھرتی ہے ناگن بَہی بَہی

جوڑے کا تیرے عالم بندھنے میں یوں بھی دیکھا
گویا کہ کُنڈلی مارے بیٹھا اک اژدہا ہے

اس نگار خانے کو، جس کا نام کلیاتِ مصحفی ہے، دیکھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ جس مصور کے موقلم کی تخلیقات ہمیں محوِ جمال کیے ہوئے ہیں، اس کا رُواں رُواں محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مصحفی محبت کا شاعر ہے، اوّل اور آخر محبت کا شاعر۔ اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی اُس پھیکی، ماورائی اور ٹھنڈی محبت کا گماں نہیں ہوتا، جسے افلاطونی محبت کہتے ہیں۔ مصحفی خد و خال کا گرویدہ ہے، جسم کی رعنائیوں اور کیفیتوں کا ادا شناس، ناز و انداز کا محرم ہے اور زندانی۔ وہ اہلِ نظر بھی ہے اور نظر باز بھی، بوالہوس ہے اور حسن پرست بھی۔ اس کی نگاہیں خوب سے خوب تر کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ کرشمۂ ناز وخرام اس کے دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور اس کے علاوہ بہت سے بے نام شیوہ ہائے سحر انگیز و حیرت آفریں۔ اس کی تشنہ ندیدی اور پُر جسارت نگاہیں کہاں نہیں پہنچتیں۔ مصحفی کے یہاں معاملہ بندی کی سطح سے بھی محبت شدت اور بے ساختگی کے ساتھ پھوٹتی ہے:

دیکھو ہی مت ادھر کو ایسی ہی گر حیا ہے
بچ بچ نگاہ کرنا یہ کون سی ادا ہے

آیا ہے طعنِ راحت دینے تصور اس کا
بھولے سے گر میں سر کو زانو پہ بھی دَھرا ہے

دوسرا شعر ذہن کو میرؔ کے اس نشتر کی طرف لے جاتا ہے۔

ہوگا کسو دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اپنی کیا تجھ سے کہوں تو ہی کہہ اپنی مجھ سے
کہ مجھے تیری ہی تقریر بھلی لگتی ہے

کسی نے کچھ نہ جانا اور یاں اک بات کے کرتے
قیامت ہوگئی ہم پر ادائے گردشِ رُو سے

ایسا اندازہ ہوتا ہے مصحفی کے کوئے خوباں کا غالب کے کوئے ملامت سے کوئی فاصلہ نہیں:

میں اس امید پہ بیٹھا ہوں کوئے خوباں میں
کہ بام سے کوئی مہ پارہ سر بلند کرے

غالب کے شعر

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کا نقش اوّل مصحفی کے یہاں ملے گا:

خاک میں مل گئے ہم تو بھی نہ دیکھا تم نے
ہائے اب تک تری آنکھوں میں حیا باقی ہے

کسی نے کچھ نہ جانا اور یاں اک بات کے کرتے
قیامت ہوگئی ہم پر ادائے گردش رُو سے

دل برشتگی کا عالم دیکھیے:

اس گلی میں جو جا کے نکلے ہے
دل پہ اک چوٹ کھا کے نکلے ہے

آہ نکلے تو دل سے ہے لیکن
آہ کیا جی جلا کے نکلے ہے

گرمی کہاں اب اس میں کہ مثلِ چراغِ صبح
افسردگی نے دل ہی ہمارا بجھا دیا

سنگ کیا توڑنے کو چاہیے اس شیشہ کے
دلِ ناز جو بیک گردشِ رو ٹوٹ گیا

مثالوں سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مصحفی میر کا معتقد ہونے کے باوجود پائیں باغ کی طرف سے آنکھ بند کرنے کا قائل نہ تھا۔ سچ پوچھیے تو پائیں باغ بھی اس کی صحرانوردنگاہوں پر تنگ تھا۔ شہر میں زیادہ دیر ٹھہرنے پر اُسے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ ان لوگوں پر اسے ترس آتا تھا جو زندانِ شہر میں اسیر رہ کر بھی مطمئن تھے۔ فطرت، انسان اور رسوم ورواج کا مشاہدہ اور ان پر غور وفکر مصحفی کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کی شاعری گرد وپیش سے بے نیاز ہونے کے بجائے گرد وپیش سے ہی غذا پاتی ہے۔

لیکن نگارخانے کی ایک دلآویز تصویر تو رہ ہی گئی، آیئے اسے دیکھتے چلیں:

آئے ہے نظر بے حرکت موجِ تبسّم
تصویر کا ہے اس کے لبوں کی غضب انداز

اس تصویر کو دیکھ کر ''مونالزا'' کا گماں ہوتا ہے۔ وہی زندگی، وہی لطافت، گویا بول اُٹھے گی۔ رمزیت اور وہ جمیل ابہام نہیں، نہ سہی، لیکن ابھی ہم نے اِسے قریب سے دیکھا ہی کہاں ہے۔

اس مختصر صحبت میں دھیان مصحفی کی شاعری کے صرف دو پہلوؤں کی طرف ہی جا سکا۔ ایک تو یہ کہ مصحفی کا تخیل پیکر تراش محبت ساز ہے۔ اس کا دیوان ایک نگار خانہ ہے، متحرک رقصاں، درخشاں۔

دوسرے اُردو شاعری کی جمالیاتی رگوں میں مصحفی نے گرم خون دوڑایا۔ کہیں کہیں کثیف معاملہ بندی اور ابتذال نے اس خون کو فاسد بھی کیا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ مصحفی کا شمار اردو کے ان بڑے شعرا میں ہونا چاہیے جنھوں نے محبت کو اپنا موضوع بنایا۔ محبت بہ یک وقت تشنہ اور لبریز محبت، مصحفی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ محبت جس کی نرمی جگر لالہ میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے اور جس کی گرمی سے اشعار دَہکنے لگتے ہیں۔ خد و خال کی محبت، قد و گیسو، چشم و ابرو کی محبت۔ انداز و ادا کی، جسم کے جمال کی محبت، یہ محبت کبھی سوز و گداز ہے، کبھی التہاب، کہیں نظارہ باز ہے، کہیں آغوش طلب، کبھی پاک بیں ہے کبھی پُر ہوس۔

سیّد حامد

غزلیات

الف

1

کلی کو اس چمن میں جب نہ ہو وقفہ تبسم کا — لبِ ہر برگِ گل پھر کیا کرے دعویٰ تکلّم کا

ہمیشہ اک نیا فریادی اس کوچے میں آتا ہے — درِ سلطاں سے کس دن کم ہوا غوغا تظلّم کا

جہانِ نیستی ہستی میں ہی تجھ کو نظر آوے — اگر اُٹھ جائے خطرہ دل سے ہستی کے توہّم کا

خداوندا نہ اس کو روے روزِ ہجر دکھلانا — بغل میں دل مری پروردہ ہے ناز و تنعّم کا

نہ تارے ہیں نمایاں اور نہ ہے یہ کہکشاں شب کو — پٹارا چرخ نے کھولا ہے گویا مار و کژدم کا

وہ ابراہیم ثانی ہے جو ترکِ سلطنت کر کے — بجا دے کوس ملکِ خاکساری میں تحشّم کا

ترے کانوں میں دیکھا ہے میں جب سے عقدِ گوہر کو — مری نظروں سے پیارے، گر گیا ہے، خوشہ انجم کا

محرم میں میں کس دن نعلِ ماتم اس میں گاڑا تھا — نشاں چھاتی پہ ہے میری کسی کے رخش کے سُم کا

کوئی واں چشمِ بد کے واسطے اسپند کیا لاوے — سپندِ روے آتش جس جگہ ہو نقطہ مردم کا

ہمارے حق میں تیری زخم ریزی گلفشانی ہے — غضب کو کیا سمجھتا ہے جو ہو خوگر ترحّم کا

کٹے تھی مصحفی آرام سے میخانے میں میری
کہ تکیہ تھا تلے سر کے مرے خشتِ سرِ خم کا

2

لگن میں گر نصیب غیر ہیں تیرے چرن دھونا	ہمیں بھی جان سے ہاتھ اپنے اے نازک بدن دھونا
صفا تلووں کی اس کے یوں پرستاروں سے کہتی ہے	روا تھا تم کو پہلے آبِ کوثر سے لگن دھونا
موا ہے عاشقِ سرگشتہ ریگستاں میں اے بادل	تو ہی اس میتِ بیکس کا واں جا کر کفن دھونا
غبارِ دل تو خسرو کا کیا سب دور شیریں نے	نہ جانا پر سرِ خسرو سے خونِ کوہکن دھونا
نہیں ہم صبح سے واقف ہمیں شبہائے ہجراں میں	منھ اپنا آنسوؤں سے مثلِ شمعِ انجمن دھونا
میں وہ ذی رتبہ مجرم ہوں کہ زیرِ دار کہتا ہوں	لگا ہووے نہ خوں منصور کا دار و رسن دھونا
زبس لڑکوں کے پتھر کھائے ہیں، بیچارے مجنوں کو	بہت مشکل ہوا ہے خونِ رخسار و ذقن دھونا
جدائی میں لبِ پاں خوردہ کی روزی ہوا ہم کو	لہو کی کلیوں سے ہر سحر اُٹھ کر دہن دھونا
دوپٹے ہر طرف لہروں کے یاں بہتے ہیں، دریا میں	سمجھ کر، اے حباب، اس جا تو اپنا پیرہن دھونا

تخلص پنج حرفی مصحفی کا ہے، خداوندا[1]
سیہ روئی کو تو اس کی طفیلِ پنجتن دھونا

3

نہانا تم کو واں حمام میں جا اور بدن دھونا	ہمیں یاں اشکِ گرم اپنے سے رخسار و ذقن دھونا
تو پیچھے جا کے جوئے شیر میں شیریں بدن دھونا	ذرا تیشے سے پہلے خونِ زخمِ کوہکن دھونا
شبِ ہجراں میں کرنا اشک خوں سے تر بتر اس کو	سحر دریا پہ جانا ہم کو نت اور پیرہن دھونا
نہ جاوے میتِ عاشق جو دریا پر تو غم کیا ہے	تو شبنم آنسوؤں سے اپنے بلبل کا کفن دھونا
مبادا دام میں ان کے پھنسیں آ مردمِ آبی	تو بال اپنے نہ یوں دریا میں اے نازک بدن دھونا
خدا جانے کہ ہے میلِ طبیعت ان پہ کس کس کی	نہ ساعد اس طرح مل مل کے تو اے سیم تن دھونا
نشاں یہ رہنے دیجو اپنے کُشتے کا پس از کشتن	سرے کا تیر کے لوہو نہ اے ناوک فگن دھونا
نہیں اک زخم تن دھونے کی رخصت ہم کو، اے شبنم	مبارک ہووے تجھ کو روئے گلہائے چمن دھونا

1۔ ج: تخلص مصحفی کا پنج حرفی ہے خداوندا

ثنا کرنے کی خاطر مصحفی اس گوہرِ تر کی
صدف کی طرح ہم کو آبِ نیساں سے دہن دھونا

4

سو بار یوں تو میرا ہو جی نڈھال ڈوبا　جا کر کنویں میں کس دن میں خستہ حال ڈوبا
ایک تیغ ہی کے جوہر کچھ لالہ گوں نہیں ہیں　اپنا بھی موجِ خوں میں ہے بال بال ڈوبا
خورشید و مہ جو ڈوبیں کون ان کو پوچھتا ہے　یوسف سا جب کنویں میں صاحبِ جمال ڈوبا
نکلا تو تھا افق سے وہ شامِ عید لیکن　ابرو کو دیکھتے ہی اس کے ہلال ڈوبا
دریا کہ تہ کو ایسے ہم تو چلے گئے کچھ　گویا جہاز اپنا روزِ وصال ڈوبا
شاید زکوٰۃ اس نے اشکوں کی دی نہ تھی کچھ　جر بحرِ عاشقی کے تاجر کا مال ڈوبا
موبافِ سرخ اس کے کر یاد میں جو رویا　چوٹی [1] تلک لہو میں ہر اک نہال ڈوبا
اس ماہ رو نے ہم سے اپنا جو منھ چھپایا　کہنے لگے نجومی سوک [2] اب کے سال ڈوبا

دریا دلی پر آجا، دے کچھ تو مصحفی کو
کس سوچ میں تو منعم، وقتِ سوال ڈوبا

5

میرے اور اس کے درمیاں جس نے نفاق رکھ دیا　نون کی جا نہ اس نے کیوں واوِ وفاق رکھ دیا
وصل کے پیچھے پیچھے سے آتے ہی غم نے گرم گرم　سینے پر اک غریب کے داغِ فراق رکھ دیا
عالمِ سادگی کی وصف میں نے جو کی تو ناک سے　اس نے اُتار کر وہیں اپنا بلاق رکھ دیا
تیر گیا فلک کے پار غمزۂ جور کیش نے　نیتِ مرغِ سدرہ کر زِہ [3] پہ جو فاق [4] رکھ دیا
نامہ کو دیکھ کر مرے ابرو میں ڈالی اس نے چیں　یعنی خطِ غریب تھا برسرِ طاق رکھ [5] دیا

1۔ ج: چوٹی تلک لہو میں ہر ایک بال ڈوبا　2۔ سوک = زہرہ ستارہ　3۔ زہ = کمان کی ڈور
4۔ ج: (حاشیہ پر) "لفظے ترکی است بہ معنی سوفار یا تیر"　5۔ ج میں یہ شعر نہیں ہے۔

منظرِ چشم کا علو دیکھ کہ دستِ صنع نے خانۂ دل کے سامنے طرف رواق رکھ دیا
سرخیِ شام سے ہے گواہ ترکِ فلک نے بے گناہ مہر کے سر کو کاٹ کر زیرِ طباق رکھ دیا
دخترِ رز سے مصحفی جب نہ بنی تو ہم نے بھی
ہاتھ پر اس کے اس کا مہر دے کے طلاق رکھ دیا

6

شور و فغانِ بلبلِ گلزار کم ہوا غوغا ترا نہ مرغ گرفتار کم ہوا
درزی پر آفت آئی، حدِ اعتدال سے گر دو گرہ بھی دامنِ دلدار کم ہوا
گر قبر میں گیا تو رہا واں بھی زیرِ خشت سر سے مرے نہ سایۂ دیوار کم ہوا
تجھ بن شبِ فراق میں، عاشق کا تیرے جاں خواب آشنا بہ دیدۂ بیدار کم ہوا
ہر چند لاکھ آبلہ پا خار چیں ہوئے دشت جنوں کا تو بھی نہ اک خار کم ہوا
جانا بھی اس کے پاس کا میں کم کیا و لے ہرگز نہ دردِ عشق کا آزار کم ہوا
سینے سے میرے سینۂ معشوق مل گیا ایسا بھی اتفاق شبِ تار کم ہوا
آزردگی کا شیخ و برہمن کی کیا گلہ ہم سے ہی پاس سبحہ و زنار کم ہوا
بوسہ لیا جو میں نے تو دیں اس نے گالیاں آپس میں اس طرح کا بھی بیوہار کم ہوا
مت زندگی کی رکھ تو طمع اور مصحفی
کم عمر جو موا وہ گہنگار کم ہوا

7

لب پہ لایا نہ سخن آپ کو بیمار کیا اک حیادار پہ میں عشقِ حیادار کیا
جعدِ سنبل میں کب انداز تری زلف کا ہے مجھ کو کس پیچ میں اس دل نے گرفتار کیا
یہ خجالت ہے کہ شب بزم میں اس کی ہم کو مردمِ چشم کی جنبش نے گنہگار کیا
اس ترحم پہ ترے سامنے ہم نے سو بار خواہش وصل کو خوں بر لبِ اظہار کیا

شکر کی جا ہے کہ صانع نے محبت میں تری ہم کو صد گونہ مذلت کے سزاوار کیا
ہووے اس کافریِ زلفِ پریشاں کا بُرا جس نے ہر تارِ نفس رشتۂ زنّار کیا
نہ بھرے زخمِ کُہن سودۂ الماس سے بھی میں نے تیرا بھی کہا، اے دلِ افگار کیا
حکمتِ[1] صانعِ عالم کچھ اسی میں ہوگی تجھ کو دلدار بنا کر جو دل آزار کیا
کچھ بھی باقی نہ رکھا آبلۂ دل میں مرے کیا ستم تو نے یہ، اے دیدۂ خونبار کیا
قدر دیوانۂ الفت کی سمجھتا تو تبھی اس گریباں کو گلے کا نہ ترے ہار کیا
مصحفی سایے میں اب بیٹھے گا کس کے یارب
سر سے کیوں اس کے جدا سایۂ دیوار کیا

8

کچھ نہ پتنگے ہی کا تن جل گیا شمع کی گرمی سے لگن جل گیا
لے کے گلِ شمع کو گل گیر نے اتنا کہا ہائے دہن جل گیا
دیکھ کے عارض پہ تیرے دودِ خط طرّہ پُر پیچ و شکن جل گیا
سوختۂ عشق کا تربت میں بھی سوز سے سینے کے کفن جل گیا
شوخ بلا ہوتے ہیں نازک دماغ سوختہ کی بو سے ہرن جل گیا
تاب نہ اک داغ کی وہ لا سکی[2] شمع کا سارا ہی بدن جل گیا
اشک[3] باراں سے جوانسے کی طرح سبزۂ سیرابِ چمن جل گیا
مصحفی دیکھ اس کے لبِ آتشیں
آگ میں جا لعلِ یمن جل گیا

9

گہ روئے خوں، کہ اَشکوں سے دامان بھر لیا ہم نے شبِ فراق میں چاہا سو کر لیا
وہ مرغ بے نصیب اسیرِ قفس ہوں میں صیّاد نے نہ جس کو کبھی ہاتھ پر لیا

1۔ج : ''حکمتِ صانعِ عالم بھی کچھ اس میں ہوگی'' 2۔ ج : لاسکا 3۔ ج: اشک کی باراں

شاید ہوا ہو دیدۂ یعقوب کو نصیب تو نے مزا جو گریے کا اے چشمِ تر لیا

کانوں کے موتی سب جو ہیں پرویں یہ طعنہ زن تم نے کہاں سے مول یہ درجِ گہر لیا

بلبل کہے ہے باغ سے دوں گی تجھے نکال بوسہ جو گل کا تو نے، نسیم سحر لیا

غیرت سے اس نے بام پر آنا اُڑا دیا ہمسائے اس کے ہم نے کرائے جو گھر لیا

اُن رہروانِ ملکِ عدم سے ہوں جس نے آہ کچھ یاں سے ساتھ اپنے نہ زادِ سفر لیا

حیران سا تکوں ہوں منھ اس کا کہ شوخ نے مجھ کو تو ایک بات میں بس آگے دھر لیا

بلبل صبا کو آنے نہیں دیتی گل کے پاس اب کے اُسی نے باغ اجارے مگر لیا

ہے فصلِ گل میں نشتر ہر خار سرخرو سودائیوں نے اپنا جو خوں بیشتر لیا

کھینچا کل اس ادا سے کچھ اس نے کہ مصحفی

ہاتھ اس کا میں نہ ہاتھ میں بار دگر لیا

10

صانع کا یہ اولیں عمل تھا بنیاد سپہر میں خلل تھا

پہنچے تھا پیامِ دوست ہر دم غم قاصد نامہ در بغل تھا

زلفوں نے کیا جو اس سے پنجہ کیا شانہ عاج[1] کچھ نبل تھا

کیا اس کی کہوں حلاوت تیغ ہر زخم میں شیشۂ عسل تھا

ہر روز زمانہ ہے کسی پر وہ آج نہیں ہے یاں جو کل تھا

خورشید جھکا پڑے تھا جس جا کیا جانیے کس کا وہ محل تھا

جب تک نہ ہوئے تھے قائم ارکاں سودا ہی یہاں کا چل بچل تھا

تھی روز کے منھ پر غم سے زردی شب کا ہرچند وہ بدل تھا

تا زیست زبانِ مصحفی پر ہر لحظہ ترانۂ غزل تھا

1۔ شانہ عاج = ہاتھی دانت کا کنگھا

کس واسطے در محیط معنی
سرمستِ خُمِ مے ازل تھا

11

زلف آئینے میں ہے[1] وہ طلسمات کا کیڑا پانی میں ترے[2] جیسے کہ برسات کا کیڑا
چمٹے کو کریں گرم تو شاید کہ جدا ہو چمٹا ہے یہ دل کو جو ملاقات کا کیڑا
جاتی نہیں اس زلف کی لٹ آنکھوں تلے سے یاں نظروں میں پھرتا ہے وہی رات کا کیڑا
صندل سے جو سینے سے جدا ہو نہیں سکتی سیلی نہیں عاشق ہے تری گات کا کیڑا
لہرا دے نہ کس طرح کہ شب خواب میں آکر من ڈس گیا کالوں کی ترے پات کا کیڑا
وہ اُس کو چاٹے ہے تو میں خاک قناعت ہے اس لیے قائل مری اوقات کا کیڑا

چاٹے ہے سدا مصحفی دل گھن کی طرح سے
دن رات پریشانیِ حالات کا کیڑا

12

یا ترا وصل صنم مجھ کو سزاوار نہ تھا یا ترے وصل کے لائق یہ گنہگار نہ تھا
کافری پر جو مزاج اس کا ذرا آجاتا موے گیسو تو کم از رشتۂ زنار نہ تھا
پردۂ شرم رکھا تو نے تو حائل شب و روز ایسے گھر میں کہ جہاں پردۂ دیوار نہ تھا
ہائے صیاد نے کچھ قدر نہ جانی میری دامِ الفت میں کوئی مجھ سا گرفتار نہ تھا
گلشنِ وصل کا دیکھیں تھے سماں شب کو گل ہی گل سب نظر آتے تھے کوئی خار نہ تھا
درمیاں میں مرے اور اس کے نہ حائل تھا کوئی اور جو تھا بھی تو بجز پردۂ پندار نہ تھا
آہ ہونٹوں تلک آتی تھی مرے دزدیدہ بسکہ ہمدم بھی مرا واقف اسرار نہ تھا
روزِ محشر میں پھرا چار طرف گھبراتا کہ مرے سر پہ ترا سایۂ دیوار نہ تھا
ہوگیا سرد وہ دو گھونٹ کے پیتے ہی مسیح شربتِ وصل علاجِ دلِ بیمار نہ تھا

1۔ اصل: تھی 2۔ ترے = تیرنا، پیرنا

رات سنسان سی مجلس جو نظر آتی تھی
اور سب تھے مگر اک مصحفی زار نہ تھا

13

عارض ہے یا کہ تارا میں کچھ نہیں سمجھتا — ابرو ہے یا کٹارا، میں کچھ نہیں سمجھتا
کیوں طعنہ زن ہو مجھ کو کیا مدعا ہے اس سے — اے دوستو، تمھارا میں کچھ نہیں سمجھتا
لب بھی ہلے نہ تھے یاں، کیونکر ہوا الٰہی — رازِ دل آشکارا میں کچھ نہیں سمجھتا
تحریک سے ہوا کی، کس ساتھ ہے چمن میں — ہر برگ کا اشارا میں کچھ نہیں سمجھتا
بالیں و بستر اپنا اس کوچے میں یہی ہے — جز خشت و سنگِ خارا میں کچھ نہیں سمجھتا
ہوں کم چشم، رکھوں ہوں پر طالعِ سکندر — عُجب[1] و غرورِ دارا میں کچھ نہیں سمجھتا
شرعِ محمدیؐ میں، عاشق کو گل رُخوں کا — کیوں منع ہے نظارا، میں کچھ نہیں سمجھتا
اس صید پر کہ جس میں تھی جان بھی نہ باقی — کیوں اس نے تیر مارا میں کچھ نہیں سمجھتا
دیوانہ ہوں کسی کا، آشفتہ ہوں پری کا — سمجھاؤ مت خدا را میں کچھ نہیں سمجھتا
اے دوستانِ صادق دلے ہمدمانِ مشفق — یاروں[2] کا وہ مدارا میں کچھ نہیں سمجھتا

اتنا تو وہ نہیں ہے، اس بت پہ مصحفی نے
کیوں جان و دل کو وارا میں کچھ نہیں سمجھتا

14

اے نالۂ دل، دف نہ ڈفالی کا بجانا — پردہ تو کوئی سازِ خیالی کا بجانا
قدغن ہوئی اب اس پہ مگر جو کئی دن سے — ہاتھوں کے اشارے نہ وہ جالی کا بجانا
طبلوں پہ مہ دمہر کے نت کوفت ہے جب سے — سیکھا ہے وہ مطرب بچہ چالی کا بجانا
اے نالۂ شب ہجر میں کیا فائدہ ہر دم — سر پر ہی مرے ماہ کی تھالی کا بجانا
بے سیر نہیں ہے ترے دیوانے کے پیچھے — تشہیر کو لڑکوں کی وہ تالی کا بجانا

1۔ عجب = غرور 2۔ ج : یاروں کی وہ مدارا

منصف ہو جو تعلیم کر البتہ ستم ہے   اس پھول سے پنڈے پر دوالی کا بجانا
ناخن[1] سے گہے غم میں ترے نوچنا سینہ   گہ لیٹے ہوئے تار نہالی کا بجانا
تجھ بن شب سرما میں یہی شغل ہے اپنا   غیر اس کے نہ گانا نہ وہ چالی کا بجانا
سن جس کو دِلا، مندلِ[2] مہ چرخ میں آوے   تو دائرہ اس فکرتِ عالی کا بجانا
ڈھولک کی صدا کرتی ہے دل اک تو دو ٹکڑے   پھر قہر ہے چینی کی سفالی کا بجانا
اے مصحفی آتش ہی نہ ہو جب کہ چلم پر
کیا فائدہ بیٹھے نَے خالی کا بجانا

15

جاتا نہیں ہے دل سے ہرگز تصور اس کا   وہ عُجب و بے دماغی اور وہ تکبّر اس کا
جب چھوڑ جاہ و حشمت اپنی چلا سکندر   نکلا جو دم تو نکلا باصد تحسّر[3] اس کا
نالہ مرا عجب ہے گر عرش تک نہ جاوے   اونچا رکھا ہے میں نے اس رات تک سر اس کا
اک شاخِ گل سے بلبل جھولے تھی کل لٹک کر   کتنا پسند آیا مجھ کو تمسخر اس کا
پازیب موتیوں کی جو زیبِ پا ہوئی ہے   پرویں پہ خندہ زن[4] ہے راتوں کو ہر دُر اس کا
چھلّے کو قول کے وہ کر بند کیونکے کھولے   جب یاد ہی نہ ہووے اس کے تئیں گُر اس کا
ممکن نہیں کہ ہووے فوتِ نمازِ عاشق   ہر نقشِ پا زمیں پر گریے سے ہے گُر اُس کا
اب پھر سنہری گوٹی پہنے لگا ہے وہ گل   ڈر ہے نہ میرے خوں پر باندھے کمر تر اس کا
علم بیاں کا یارو خود مصحفی ہے راوی
کب حوض و حاشیوں نے پایا تبحّر[5] اس کا

16

ہمارے شیشۂ دل پر یہ سنگِ سخت گرا   کہ رہ گزر میں تری ہو کے لخت لخت گرا

1۔ ج : ناخن سے ترے غم میں گہے نوچنا سینہ 2۔ مندل = وہ دائرہ جس کو عامل عمل کے وقت اپنے گرداگرد کھینچتا ہے 3۔ ج : تحیّر 4۔ ج : غم زدن 5۔ ج : تبختر

نہیں ہر ایک کی جا پوستِ تختِ درویشی جو بیٹھے اس پہ سلیماں تو دے وہ تخت گرا
تمھارے پنجۂ مژگاں سے کب بچا خوباں ہمارے صعوۂ[1] دل پر تو باز سخت گرا
سبب نہ پوچھو کوئی میری خاکساری کا وہ پختہ میوہ ہوں دیوے جسے درخت گرا
یہ رات چشم نمائی کی اس کے کاجل نے کہ جا کے بسترِ غش[2] پر یہ تیرہ بخت گرا
زبسکہ جامۂ عریاں تنی سے میں خوش ہوں دیا ہے میں نے نظر سے شہوں کا رخت گرا
نہ آیا ڈھب پہ مرے مصحفی وہ طفلِ شریر
گرایا میں نے جو اس کو تو حد کر خت گرا

17

دور سے گل پہ جونہی مرغِ خوش آہنگ گرا گل کے پتے گئے جھڑ پر نہ ذرا رنگ گرا
بزمِ خوباں میں یہ نازک ہے مرا شیشۂ دل برگِ گل بھی جو گرا اس پہ تو اک سنگ گرا
چل گئی تیغ جو رنگِ کفِ پا پہ تیرے خون کس کس کا زمیں پر نہ گہِ جنگ گرا
میں نے کب اس کی کلائی کو مڑوڑا توبہ آپ دامن سے الجھ کر کے وہ بے ڈھنگ گرا
چھیڑ تو دیکھیو، مجنوں کا جہاں مسکن تھا ناقہ[3] آیا اسی صحرا میں کئی رنگ گرا
اُس کو جب چاہِ زنخداں نے بہت تنگ کیا آخرش جا کے کنویں میں ترا دل تنگ گرا
تجھ کو کس فندقِ پا کا تھا تصور، اے دل اشک آنکھوں سے تری آج جو خوش رنگ گرا
مصحفی فکرِ رسا نے غزلِ ثانی کا
پھیر صفحے پہ دیا خاکۂ[4] رنگ گرا

18

چاہِ غم میں جو شبِ بیض[5] یہ دل تنگ گرا سر پہ اک ماہ نے چکّی کا دیا سنگ گرا
مانگ لیویں گے اُسے تجھ سے ہم، اے بادِ صبا اب کے ڈالی سے اگر گل کوئی خوش رنگ گرا

1۔ صعوہ = ممولا 2۔ ج بسترِ غم 3۔ ناقہ = مذکر باندھا ہے 4۔ ج خاکۂ بے رنگ
5۔ شبِ بیض = چاندنی رات

مجلسِ صاف دِلاں فیض سے خالی کب ہے — خود بخود آئینہ دیتا ہے یہاں زنگ گرا
لپٹی جاتی ہے بہت اس کے لبوں سے مِسّی — کہیں نظروں سے نہ دے وہ دہنِ تنگ گرا
پرِ طاؤس بنا خامۂ نقاشِ خیال — جب ورق پر کہیں اس حسن کا نیرنگ گرا
فرش دیکھے میں وہاں بوقلموں کے بچھتے — جس زمیں پر کہ ترا جلوۂ نیرنگ گرا
خیر گزری کہ موا ہو کے وہ زنداں میں اسیر — خونِ رستم نہ زمیں پر بہ گہِ جنگ گرا

مصحفی تیرا ٹھکانا نہیں کیا اور جگہ
رہے اس در پہ کوئی تجھ سا ہی[1] بے ننگ گرا

19

کل سیرِ گلستاں کو ہم کو بھی صبا جانا — بو باس کسی گل کی جاتے ہی اُڑا جانا
نت جالی سے برقعے کی چھن چھن کے گرے جلوے — منہ تم[2] نے چھپایا تو کیلن نہ چھپا جانا
دیوانے کی پھر تیرے کس طرح تسلّی ہو — نے آنکھ لڑا جانا، نے منہ کا دکھا جانا
گو خود وہ نہ بولیں تھے کیا لطف سے خالی تھا — اک بات کے کہتے ہی وہ بھوں کا چڑھا جانا
ہولی پہ نہیں موقوف الفت کے دوانے کو — اس کوچے میں جب جانا اک سانگ بنا جانا
کی تم نے ادا کوئی گر ہم سے مخالف بھی — ہم ناز کے کشتوں نے اس کو بھی ادا جانا
ندیاں سی رہیں پلکیں چشموں سی رہیں مژگاں — اے دیدہ، کبھی تم نے دریا نہ بہا جانا
کشتے کا ترے لاشہ افتادہ سرِ رہ ہے — شاید کبھی جی اُٹھے ٹھوکر تو لگا جانا
کیا کام کیا تم نے، تھی یہ بھی ادا کوئی — پردے سے نکل آنا اور جی میں سما جانا

اس سروِ خراماں کو اے مصحفی آتا ہے
ہر پانو کی ٹھوکر میں فتنے کو جگا جانا

20

ٹک جس سے کہ دل میں پیار رکھا — دو نظروں میں اس کو مار رکھا

1۔ ج : کوئی ایسا ہی 2۔ ج : منہ ہم نے چھپایا تو

ہم صاف دلوں نے خصم سے بھی دل میں نہ کبھی غبار رکھا
گو مکرے وہ اب کہ دختِ رز کو یاروں نے ہزار بار رکھا
صیاد نے جوشِ گل میں میرا گلبن سے قفس اُتار رکھا
الفت نے ہماری خاک کو بھی سرگشتۂ کوے یار رکھا
رکھتے ہی قدم جنوں میں ہم نے پا بر سرِ نوکِ خار رکھا
اس دشتِ جنوں نے فصلِ گل میں جامے کا نہ ایک تار رکھا
اس آئینہ رو نے مصحفی کو ق نت کشتۂ انتظار رکھا
یاں تک کہ بہار میں بھی گا ہے
اک گل نہ سرِ مزار رکھا

21

مرغِ دل پھر دامِ زلفِ خم بہ خم میں جا پھنسا یہ اسیر تازہ اک تازہ الم میں جا پھنسا
دام گہ دونوں ہیں، یہ فہمید کا ہی فرق ہے دیر میں کوئی گھرا، کوئی حرم میں جا پھنسا
حلقۂ دورِ خط اس کا ہے وہ گرداب بلا دیکھ کر رستم بھی جس کو چاہِ غم میں جا پھنسا
تو نیازی پر مرے تھا، بت پرستِ ناز[1] تھا دل مرا شاید کسی بیت الصنم میں جا پھنسا
کنگرہ عرشِ معلیٰ کا بڑا اندیشہ تھا خیر گزری نالہ شب جعدِ[2] علم میں جا پھنسا
کیا مزہ تو نے گرفتاری کا پایا زیست[3] میں جب ترا اندیشۂ فکر بیش و کم میں جا پھنسا
ہالۂ خط پر ترے کس دن نظر میری گئی میں دوانا تو خطوطِ جامِ جم میں پھنسا
اختیاری ہے رہائی اور گرفتاری مری ایک دم میں چھوٹ آیا، ایک دم میں جا پھنسا
وہ فریبوں پر بھی تیرے شاد و خرم ہی رہا جس کا دل، پیارے ترے قول و قسم میں جا پھنسا
سیرِ گلزارِ وجود اس کو نہ خوش آئی دریغ طائرِ رُوح آہ پھر دامِ عدم میں جا پھنسا
اس کے کوچے میں یہ دلدل گریۂ عاشق سے ہے پانو واں جس کا پڑا نقشِ قدم میں جا پھنسا

1۔ ج : یار بھی 2۔ جعد = چوٹی 3۔ ج ۔ زیست کی

حیف اس کا مجھ کو آتا ہے ارسطو سا بشر ملکِ دانش چھوڑ کر جاہ و حشم میں جا پھنسا
بال بکھرے دیکھ کر اس کی کمر پر مصحفی
رات میں تاریکیِ راہِ عدم میں جا پھنسا

22

کون سمجھا اس سے میری چشم تر نے کیا کہا زیرِ لب پھر اس نگارِ سیم بر نے کیا کہا
خلق میں رسوا ہوا میں جس کی خاطر یہ کہو سن کے رسوائی مری اس بے خبر نے کیا کہا
غیر سے سرگرم الفت ان دنوں ہے وہ پری مجھ کو تو باور نہیں یہ نامہ بر نے کیا کہا
ساکنِ کنجِ قفس ووں ہی تڑپ کر رہ گیا باغ سے آتے ہی یہ بادِ سحر نے کیا کہا
یوں گرفتارِ قفس کس جرم پر بلبل ہوئی خدمت صیاد میں اس مشتِ پر نے کیا کہا
"یعنی عاشق ہے تو ناداں، پیچھے پیچھے آ مرے" میں ہی سمجھا اس کی برگشتہ نظر نے کیا کہا
سیکڑوں پروانے سن جس کو لگن میں رہ گئے وقتِ رخصت کیا کہوں شمعِ سحر نے کیا کہا
دوڑ دوڑ اس کی گلی میں نت گیا تو شام و صبح کیا کہوں میں مجھ کو[1] اس بیداد گر نے کیا کہا
مصحفی کہنا نہ مانا تو نے ہرگز ایک کا
دیکھ تو تجھ کو دوانے سارے گھر نے کیا کہا

23

کوئی خبر لادے کہ اس سے نامہ بر نے کیا کہا سن مرا احوال پھر اس بے خبر نے کیا کہا
وصل کی شب آ گئے ہی اس شوخ کو دیتا جگا گر سمجھتا اتنا میں مرغِ سحر نے کیا کہا
"در فراقت سوختم، اے شمع بر روے لگن" اس سوا پروانۂ بے بال و پر نے کیا کہا
روزنِ دیوار تک بھی اب نہیں آتا وہ شوخ کچھ نہ سمجھا کر اس کو ہے ہے رخنہ گر نے کیا کہا
پھیر رم کرنے لگا جو وہ غزالِ رام آہ کان میں اس کے رقیبِ سگ سیَر نے کیا کہا
"ہاں نہ کر انکارِ معجز کچھ خبر ہے یا نہیں" معجزے سے دستِ سائل میں حجر نے کیا کہا

1۔ اصل تجھ کو

عشق کی وادی کی ہیبت پر پڑی جب میری آنکھ
"ہر چہ بادا باد"، چھٹ اہلِ سفر نے کیا کہا

مصحفی دلّی کو لکھ بھیجی تھی میں نے یہ غزل
سچ بتا سن کر اُسے دردؔ و اثرؔ نے کیا کہا

24

گر میں دامِ ہوسِ حور و پری سے چھوٹا
مصحفی خوب ہوا بدنظری سے چھوٹا

فندقِ پا کی ترے اس کو جو ٹھوکر لگ گئی
خوں کا فوآرہ سرِ کبکِ دری سے چھوٹا

تو نے فرصت نہ دی، اے عشقِ گریباں چاکی
گر ذرا ہاتھ مرا جامہ دری سے چھوٹا

سب کے بوسے لیے کافر نے گلے لگ لگ کے
ایک پودا نہ نسیمِ سحری سے چھوٹا

مرتے مرتے وہی حالت رہی دیوانے کی
عشق لیلیٰ کا نہ قیس ہنری سے چھوٹا

جان دی جس نے ترے قدموں پہ وہ کشتۂ ناز
چرخِ سفّاک کی بیدادگری سے چھوٹا

ہم تو آزاد سمجھتے ہیں اسی کو واللہ
مر کے جو شخص کہ قیدِ بشری سے چھوٹا

یوں کہا گر کے کبوتر سے مرے نامے نے
لے کبوتر میں تری ہم سفری سے چھوٹا

تیر دھویا تو بہت میرے کماں دار نے لیک
خونِ چسپیدۂ عاشق نہ سری سے چھوٹا

قاصد اس کوچہ میں مارا جو گیا خوب ہوا
مصحفی روز کی وہ نامہ بری سے چھوٹا

25

حنائی پا کی ٹھوکر دیتی ہے کھو خواب آتش کا
نگاہِ خشم سے ہوتا ہے زہرہ آب آتش کا

بہایا کس کے اشکِ گرم نے سیلاب آتش کا
کہ شعلہ بن گئی ہر ایک موجِ آب آتش کا

بہ شوقِ نعل تھا خارا میں دل بیتاب آتش کا
ہوا اک جنبشِ ناخن میں فتح الباب آتش کا

ستی ہوتی نہیں کیوں شمع لے پروانے کو اپنے
مہیا کر چکا ہے عشق سب اسباب آتش کا

نماز اپنی ریا ہے سر بسر، یہ ہم کو سوجھے ہے
بنے گا طوق اک دن حلقۂ محراب آتش کا

ندی جس جا ہے اب خونِ شہیدانِ محبت کی بہے تھا پیش ازیں کہتے ہیں یاں سیلاب آتش کا
ہزاروں سر ہیں سجدے میں ترے پائے نگاریں کے جو زرتشتی ہیں ان پر فرض ہے آداب آتش کا
شہیدانِ لباسِ سرخ کی تربت پہ کون آیا جو لوکا بن گیا ہر لالۂ سیراب آتش کا
بَنہٹی جب ہلاتا ہے وہ بحرِ حسن گرد اس کے بنے ہے شعلۂ جوالہ اک گرداب آتش کا
سبک وضعوں سے صاحب وزن کب رنجیدہ ہوتے ہیں گلہ کرتا نہ دیکھا میں کبھی سیماب آتش کا
نہیں جگنو چمکتے مصحفی وادیالمقدّس میں
بہ شوقِ عشقِ موسیٰ دل ہے خود بیتاب آتش کا

26

دل میں کھبتی ہے نازنیں کی ادا ہائے رے چشمِ شرگیں کی ادا
دردِ سر کو کرے ہے پھر پیدا اس کی صندل لپی جبیں کی ادا
تیغ رکھ دے کہ قتل کرتی ہے خود ترے دست و آستیں کی ادا
ساتھ ہم کافرانِ عشق کے آہ ہے وہی اب تک اہلِ دیں کی ادا
برق سو پیچ و تاب کھاتی ہے دیکھ اس آہِ آتشیں کی ادا
مصحفی اک تو وقتِ خشم و عتاب ق قہر ہے اس جبیں پہ چیں کی ادا
تس پہ پھر اور قتل کرتی ہے
نرگسِ سحر آفریں کی ادا

27

فقط اک سادی الفت کا صنم ناتا سمجھتا تھا محبت میں یہ صدمے ہوویں گے میں کیا سمجھتا تھا
سمجھتا تھا مرے پہلو میں دل اک قطرۂ خوں ہے معاذ اللہ نہ اس قطرے کو میں دریا سمجھتا تھا
لگاوٹ دل سے کم کرتا تھا آغازِ محبت میں نہ لگ چلتا تھا ہم سے تو ہی کچھ اچھا سمجھتا تھا
نگونیں[1] آنکھیں جوں جوں پیاری پیاری لگتی تھیں مجھ کو مرے انداز کو دل میں وہ بے پردا سمجھتا تھا

1۔ نگونیں = شرم سے جھکی ہوئی

صنم میں گرچہ تیرا وعدۂ فردا سمجھتا تھا　ترے فردا کے کہنے میں تھی دل کو میرے شادی سی

نہ آنے میں ترے دو دن کے کیا یہ مر گیا پیارے
مگر تو مصحفی کو اتنا بے صبرا سمجھتا تھا

28

حالِ دل خوب ہے مکشوف[1] خدا پر میرا　جی ہی جاتا ہے چلا تیری ادا پر میرا
کیوں گریبان کے تار اُڑتے ہوا میں ناصح　ہاتھ پڑتا جو کسی زلفِ رسا پر میرا
نامہ کس طرح میں دوں باندھ پروں پر ان کے　زور چلتا نہیں مرغانِ ہوا پر میرا
تو جب آتا ہے تو اس وقت ہی جی چلتا ہے　صحن و باغ و چمن و حوض و فضا پر میرا
منھ چھپا کر کے وہ بت گھر میں یونہی بیٹھ رہا　خون ثابت جو ہوا رنگِ حنا پر میرا
ہے یہی عشقِ ترنّم تو کبھی باغ کے بیچ　جی نکل جائے گا بلبل کی صدا پر میرا
اُربسی[2] رشک سے کیونکر کہ نہ ہو داغ کہ جاں　لوٹے ہے دل ترے سینے کی صفا پر میرا

مصحفی کیونکہ قدم رکھوں میں گورستاں میں
پا نو پڑتا ہے سرِ اہلِ فنا پر میرا

29

مستانِ رہِ عشق کریں کیا گلۂ پا　جب خوشۂ انگور بنیں آبلۂ پا
چھلتے ہیں نہ کانٹوں سے فقط آبلۂ پا　نیش ان کے سے نالش میں ہے ہر سلسلۂ پا
تب خون سے عاشق کے کفک اس کو بنایا　ہاتھ اس کے یہ آیا ہے عجب مشغلۂ پا
نقشِ قدمِ پیش رواں گم ہے جو یا رب　اس دشت سے کیدھر کو گیا قافلۂ پا
موزونیِ رفتارِ بتاں کس کو دکھاؤں　خود فاصلۂ بیت ہے ہر فاصلۂ پا
جس راہ سے غلطاں گئے سرگشتوں کے تیرے　اس راہ میں دیکھے میں کھڑے مرحلۂ پا
گر شیخ تو صیقل کرے آئینۂ دل کو　کیا فائدہ جھانواں جو ہوا مصقلۂ[3] پا

1۔ مکشوف = ظاہر　2۔ اُربسی = گلے میں پہننے کا ایک زیور　3۔ مصقلۂ پا = پیر صاف کرنے کی شے

اے مصحفی تیرے یہ زمیں زیرِ قدم ہے
کہہ اور غزل بھی کہ تو پاوے صلۂ پا

30

ہو ایک اسیروں کا ترے سلسلۂ پا — تب آوے نظر ہمرہیِ قافلۂ پا
اُٹھ کر ترے کوچے سے کہاں جاوے وہ بیمار — ہر گام پہ ہو جس کے تئیں فاصلۂ پا
چبھتے ہیں پڑے گوکھرو تلوؤں میں جو اس کے — کہتے ہیں انھیں اہلِ جنوں معبلۂ[1] پا
سو کانٹے لگے قطرۂ خوں ان سے نہ نکلا — تم ضبط مرا دیکھیو اور حوصلۂ پا
جھانواں نہ کر، اے شوخ کہ چاہے ہے نزاکت — گل برگ سے نازک ہو ترا مصقلۂ پا
کچھ آپ سے جاتا نہیں مجنوں طرفِ نجد — ہے ہاتھ میں وحشت کے سرِ سلسلۂ پا
گھیرا ہے جو آضعف نے دیوانے کو تیرے — ہم ہاتھ کا شکوہ ہے اسے ہم گلۂ پا
جانا ترے کوچے کی طرف اور پھر آنا — ان روزوں تو اپنا ہے یہی مشغلۂ پا

اے مصحفی کیا ماریں قدم دشتِ جنوں میں
معلوم ہو جب اپنا ہمیں حوصلۂ پا

31

جب سرنگوں ہو وہ بتِ ناداں خجل ہوا — لے کر میں بوسۂ لبِ جاناں خجل ہوا
گھر میزباں کے آکے یہ مہماں خجل ہوا — پایا نہ خون دل میں تو پیکاں خجل ہوا
جب حالِ زار سے مرے جاناں خجل ہوا — گھر سے نکل میں بے سروساماں خجل ہوا
وے تلوے ساری رات رہے تیرے سامنے — اس پر بھی تو نہ، اے مہ تاباں خجل ہوا
مہندی کی تازگی سے جو سرخی ہوئی کبود — رکھ کر وہ ہاتھ، زیرِ زنخداں خجل ہوا
اس اضطراب کا ہو بُرا ہائے کیا کہوں — کتنا میں اس کا کھینچ کے داماں خجل ہوا
اس نے شبِ وصال بھی جب اعتنا نہ کی — میں لب پہ لا کے شکوۂ ہجراں خجل ہوا

1۔ معبلہ = پیکانِ دراز اور چوڑا

ناقہ جو آکے وجد میں کوسوں نکل گیا
مجنوں کی واپسی سے حُدی خواں خجل ہوا

تھے اس کے بال و پَر نہ سزائے ہزار داغ
پروانہ جاکے پیشِ چراغاں خجل ہوا

میں اس کے سامنے ہی کیا پھر جو اس کو چاک
ناصح مرا سِلا کے گریباں خجل ہوا

قاصد نے خطِّ غیر دیا میرے ہاتھ میں
پڑھوا کے مجھ سے اس کا وہ عنواں خجل ہوا

آ تو نے بیکسی کو بنایا مرا انیس
منھ سے ترے میں، اے شبِ ہجراں خجل ہوا

بیرونِ[1] باغ ہی جو مرا دم نکل گیا
کر منع مجھ کو صاحب بستاں خجل ہوا

رویا میں زار زار یہاں تک کہ مصحفی
گریے سے میرے نوح کا طوفاں خجل ہوا

32

زنجیر سے مرتے تک، باہر نہ قدم نکلا
زندانیِ الفت کا زنداں ہی میں دم نکلا

جس روز سے وہ مکھڑا بالوں میں ہوا پنہاں
خورشید زمانے میں اس روز سے کم نکلا

لاکھوں ہی ستم اس نے مجھ پر تو کیے، یارو
لیکن نہ مرے منھ سے مذکورِ ستم نکلا

زاہد کی صمد خوانی[2] کچھ کام نہ آوے گی
جس وقت کہ پردے سے رخسارِ صنم نکلا

جس سے سرِ مژگاں پر رنگت تو کچھ آجاتی
اتنا بھی نہ خوں تم سے، اے دیدۂ نم نکلا

آرام لحد میں بھی اس کو تو نہ آوے گا
دل سے ترے عاشق کے کب خارِ الم نکلا

خط گر وہ لب اس کے کا لیں بوسہ بھلا کیونکر
ہم آبِ بقا جس کو سمجھے تھے وہ سم نکلا

جس خاک میں مدفوں تھے کشتے ترے میں اس کو
کھودا تو زمیں میں واں گلزار ارم نکلا

کیا جانیے میں کس کی شمشیر کا کشتہ تھا
بچ کر مرے لاشے سے جو صیدِ حرم نکلا

اس کوچے کی خاک از بس گریے سے مرے نم تھی
واں اشک کا جو دانہ بویا سو وہ جم نکلا

اے مصحفی عمر اتنی کی صرفِ سخن میں نے
عہدے سے بلاغت کے تو بھی نہ قلم نکلا

1۔ اصل میں یہ شعر ندارد، ج: میں "دل نکل گیا" سہوِ کتابت۔ 2۔ صمد خوانی = بے نیازی

33

ہوس سے ہے دلِ اہلِ ہوس تہ و بالا
کرے ہے شعلے کو جوں خار و خس تہ و بالا

شبِ فراق میں جوں ہی سنی مری فریاد
بہت ہوا دلِ فریاد رس تہ و بالا

پھڑک پھڑک کے خیابانِ گل میں مرغِ اسیر
کرے ہے دمبدم اپنا قفس تہ و بالا

ہلاکِ لذّتِ دنیا ہے آدمی اس طرح
قوامِ شہد میں جوں ہو مگس تہ و بالا

اگر بہ کوچۂ صہبا کشاں گزر کرتا
تو ایک جام میں ہوتا عسس[1] تہ و بالا

چلا جو نجد سے ناقہ تو ووں ہی کرنے لگی
زمینِ نجد کو بانگِ جرس تہ و بالا

مریضِ عشق کی آساں نکل گئی کیا جان
ذرا بھی ہونے نہ پایا نفس تہ و بالا

قفس میں مرغِ اسیراں کے شور نے تو کیا
قفس کدے کو بھی اب کے برس تہ و بالا

نشانِ مصحفیِ خستہ پوچھتے کیا ہو
غبار ہے تہِ پائے فرس تہ و بالا

34

تم نے دل کن کن اداؤں سے لیا عاشق کا
چپکے ہی چپکے غرض کام کیا عاشق کا

لبِ سوفار سے سرخی نہیں جاتی اب تک
بسکہ پیکاں نے ترے خون پیا عاشق کا

مجھ کو شکوہ ہے یہی سوزنِ مژگاں سے تری
ایک دن چاکِ گریباں نہ سیا عاشق کا

ڈھیر کوچے میں ترے تھا سو تری چال نے شوخ
آہ وہ ڈھیر بھی برباد دیا عاشق کا

پھر صبا مژدۂ گل مرغِ قفس کو لائی
پھر دلِ مردہ نئے سر سے جیا عاشق کا

اس کو باور نہیں ہرچند یہ قسمیں کھاوے
گرچہ ہر حرف ہے بے مکر و ریا عاشق کا

شرمِ[2] مردم کے سبب گو نظر آیا نہ وہ شوخ
اس کی جانب نہ اُٹھا دستِ ثنا عاشق کا

صرصرِ حادثہ گو اس کو طمانچے مارے
مصحفی گل نہیں ہوتا ہے دیا عاشق کا

1۔ عسس = کوتوال 2۔ شرمِ مردم (مردُم بہ پتلی) مراد آنکھ کی شرم

35

اک عمر سے تھا اس کا وطن دامنِ صحرا — آخر ہوا مجنوں کا کفن دامنِ صحرا
سبزی میں جھلکتی ہے جو صد برگ[1] کی زردی — دکھلاوے ہے سورج کی کرن دامنِ صحرا
پیدا ہے کہ مجنوں سے انھیں انس دلی ہے — کب چھوڑ کے جاتے ہیں ہرن دامنِ صحرا
رہنے کے نہیں اب یہ چمن میں، کئی دن سے — دیکھ آئے ہیں مرغانِ چمن دامنِ صحرا
نخچیر ترا کون سا آہو ہے جو ہر دم — سونگھیں ہیں غزلانِ ختن دامنِ صحرا
صد چاک ہے جاوے ہے، مگر سیکھ گیا ہے — مجنوں کے گریباں کا چلن دامنِ صحرا
وا رفتہ کو کیا کام ہے تزئینِ شہی سے — رکھتا ہی نہیں چین و شکن دامنِ صحرا
کیا ہوگا مرے چاک گریباں کے مقابل — رکھتا ہے کہاں اتنا دہن دامنِ صحرا

اے مصحفی پڑ جاویں نہ شان اس کی میں جفتے[2]
ڈھانپے جو دوانوں کا بدن دامنِ صحرا

36

لینے دے دم تو اے نفسِ آتشیں، ذرا — رہ دور چشمِ تر سے مری، آستیں ذرا
تا صبح دل پہ کوفت رہی کل شبِ وصال — پکڑی تھی اپنے ہاتھ سے اس نے جبیں ذرا
ایسا نہ ہو کہ تجھ میں مرا غم کرے اثر — مجھ سے سرک کے بیٹھ تو، اے نازنیں ذرا
ہرگز زباں نہ حرفِ نصیحت سے وا کریں — سمجھیں جو میرے دل کی مرے ہم نشیں ذرا
جلنے کا مجھ کو عرشِ معلّٰی کے خوف تھا — رکھتی قدم زیادہ جو آہِ حزیں ذرا
ہم ہیں وہ غم نصیب کہ بس ووں ہی مر گئے — پایا مزاجِ یار جو اندوہگیں ذرا
نرگس تباہ ہوگئی اس مستِ ناز نے — سوتے سے اُٹھ کے اپنی جو آنکھیں ملیں ذرا
جاتا ہوں گاہ دشت کو گاہے بسوئے باغ — تا دل کو میرے ہووے تسلّی کہیں ذرا
شرمندگی سے غرقِ خجالت ہے اب تلک — دیکھا تھا آئینے نے وہ روئے حسیں ذرا

1۔ صد برگ = گیندے کا پھول 2۔ جفتے پڑنا = سلوٹیں پڑنا

گو زیرِ تیغِ نازِ بتاں ہم نے جان دی
تو بھی پڑی نہ ماتھے پہ اپنے تو چیں ذرا

دیتا ہوں جان تو، پہ تمنّا ہے یہ مری
اک بار تیرے منھ سے سنوں آفریں ذرا

آیا نہیں وہ شوخ کئی دن سے مصحفی
آتا ہے جی میں اس کی خبر لیں ہمیں ذرا

37

گر ہوں ہم اب کے اس قفسِ تنگ سے جدا
پھر ہوں نہ طائرانِ خوش آہنگ سے جدا

رکھتا ہے عشق صاحبِ جوہر کو سینہ گرم
آتش کبھی ہوئی نہ دلِ سنگ سے جدا

عاشق کے آگئی رگِ جاں پر وونہی شکست
اک مو ہوا جو طرۂ شب رنگ سے جدا

مقتل میں کشتگاں کے جو پھرتا تھا وہ صنم
تھی موجِ خوں نہ اس کی شتالنگ[1] سے جدا

ایسا دیا ہے ساتھ کہ ہوتی نہیں ذرا
فریادِ قیس زمزمۂ زنگ[2] سے جدا

مصرعے دولخت شعر کے گر ہوں تو غم نہیں
پر چاہیے کہ رنگ نہ ہو رنگ سے جدا

یہ حسن ہے وہ شے کہ کیا جس نے مصحفی
صنعاں[3] سا شخص دانش[4] و فرہنگ سے جدا

38

طالع کرے ہے طوطیِ خوش رنگ سے جدا
ہو کاش مرغِ جاں قفسِ تنگ سے جدا

خوش خوش ہوئے تھے مرغ خوش آہنگ سے جدا[5]
تنگ آئے تب ہوئے قفسِ تنگ سے جدا

اب بھی قفس میں یاد ہیں گلشن کے زمزمے
ہیں گو کہ طائرانِ خوش آہنگ سے جدا

آتا ہے جی میں بوسے ترے اتنے لوں کہ ہو
رنگِ مسی لبوں کے ترے رنگ سے جدا

تا زیست دیر و کعبے کے در پر پڑے رہے
ہرگز ہوا نہ اپنا تو سر سنگ سے جدا

1۔ شتالنگ = ٹخنہ 2۔ زنگ = گھنٹی 3۔ صنعان = نام ایک بزرگ کا جن کے سات سو مرید تھے، شیخ فریدالدین عطار بھی ان کے مرید تھے 4۔ اصل: دانشت؟ 5۔ اصل میں یہ شعر ندارد

ابری کو رشک ہے دل عاشق پہ مصحفی
یہ صفحہ کب ہے عالم نیرنگ سے جدا

39

رکھتے ہیں سر کو در کے ترے سنگ سے جدا | کتنے ہیں ہم بھی دانش و فرہنگ سے جدا
اک رات تم اگر مرے قابو میں آ گئے | ہووے گا ہاتھ پھر نہ شتالنگ سے جدا
لکنت ہی چاہتی نہیں تو اس کو کیا کرے | سالم ہو حرف اس دہنِ تنگ سے جدا
فندق کو اس کی دیکھ کے کہتے ہیں اہلِ ہوش | یہ گُل ہے کیا کوئی گُلِ اورنگ سے جدا
جوہر شناسِ تیغ سخن ہیں جو مصحفی
سمجھیں ہیں مورچے کے تئیں زنگ سے جدا

40

جب تک یہ محبت میں بدنام نہیں ہوتا | اس دل کے تئیں ہرگز آرام نہیں ہوتا
عالم سے ہمارا کچھ مذہب ہی نرالا ہے | یعنی ہیں جہاں ہم واں اسلام نہیں ہوتا
کب وعدہ نہیں کرتیں ملنے کا تری آنکھیں | کس روز نگاہوں میں پیغام نہیں ہوتا
بال اپنے بڑھاتے ہیں کس واسطے دیوانے | کیا شہر محبت میں حجّام نہیں ہوتا
ملتا ہے کبھی بوسہ، نے گالی ہی پاتے ہیں | مدّت ہوئی کچھ ہم کو انعام نہیں ہوتا
ساقی کے تلطف نے عالم کو چھکایا ہے | لبریز ہمارا ہی اک جام نہیں ہوتا
کیوں تیرگیِ طالع کچھ تو بھی نہیں کرتی؟ | یہ روز مصیبت کا کیوں شام نہیں ہوتا
پھر میری کمند اُس نے ڈالے ہی مڑوائی ہے | وہ آہوے رم[1] خوردہ پھر رام نہیں ہوتا
نے عشق کے قابل ہیں، نے زہد کے درخور ہیں
اے مصحفی اب ہم سے کچھ کام نہیں ہوتا

1۔ اصل: رم کردہ

41

ہجرِ بتاں میں راحت و آرام گُم ہوا یاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ ناکام گُم ہوا
چیچک کو اس کے رو کی لیا خط نے یوں چھپا سبزے میں جس طرح کہ کبھی دام گُم ہوا
مانندِ آفتاب مرا داغِ سینہ سوز پیدا ہوا سحر جو سرِ شام گُم ہوا
پرواز کو مری نہ پری پاسکی کبھی وہ تیز پر ہوں میں جو تہِ دام گُم ہوا
ناقوس کا ہے ذکر نہ زنّار کا بیاں ان کافروں کے شہر میں اسلام گُم ہوا
آ اب تو بام پر کہ گئی شام سوے شب اور قرصِ آفتاب لبِ بام گُم ہوا
اس لاغری کو دیکھ کے مانندِ ماہِ عید زاہد بہ زیرِ جامۂ احرام گُم ہوا
شہرت نصیب کو کوئی کیونکر مٹا سکے عنقا کا کب جہاں سے بھلا نام گُم ہوا

قائم مقام نام تخلّص ہے مصحفی
کب صفحۂ جہاں سے مرا نام گُم ہوا

42

وہ بھولا سوادِ وطن کی فضا خوش آئی یہ مجنوں کو بن کی فضا
کسی سے کہے تھا[1] یہ مرغِ اسیر قفس میں ہے اپنے، چمن کی فضا
مری وحشت اس میں سمائے کہاں نہیں اتنی چرخِ کہن کی فضا
جو دیکھے تو کھل جاویں آنکھیں تری دلِ تنگ کی انجمن کی فضا
ابھی عقلِ اوّل کے اُڑ جاویں ہوش دکھاؤں جو قصرِ سخن کی فضا
نظر میں بہ از لوحِ یاقوت ہے شہیدِ وفا کے کفن کی فضا

ہر اک چینِ زلف اس کی میں مصحفی
نہاں ہے خطا و ختن کی فضا

1۔ ج : کہے تھی

43

جب تیر شستِ تیر فگن سے نکل گیا | عاشق کے لگتے ہی وہ بدن سے نکل گیا

تھی جس سے انس قیس کو سو وہ غزال بھی | ناقے کے پیچھے نجد کے بن سے نکل گیا

نزدیک قیس جا کے کسی نے کہا کہ اُٹھ | جب ناقہ دور نجد کے بن سے نکل گیا

لاشہ ترے شہید کا تھا بسکہ گریہ ناک | سیلابِ اشک ہو کے وہ کن سے نکل گیا

عیسیٰ خجل ہوا، ترے بیمار کا جونہی | ہچکی کے ساتھ سانس دہن سے نکل گیا

ہرگز رہا ہوا نہ اسیرِ کمندِ زلف | زنجیر میں پھنسا جو رسن سے نکل گیا

ویسا ہی دشتِ خار وہی پا پُر آبلہ | کب قیسِ خستہ رنج و محن سے نکل گیا

صیاد کیا یہ ظلم ہے بس ان کو چھوڑ دے ق اتنا اک آشنا کے دہن سے نکل گیا

پر کیا کریں گے ہو کے اسیرِ قفس رہا | جب موسمِ بہار چمن سے نکل گیا

پوچھی نہ مصحفی کی کسی نے وطن میں بات
آخر کو وہ غریب وطن سے نکل گیا

44

پیکاں جب اس کا زخمِ کہن سے نکل گیا | ''من مردم آہ'' میرے دہن سے نکل گیا

لیلیٰ نے فصد کیسی یہ کھلوائی تھی کہ آہ | مجنوں کا خوں تمام بدن سے نکل گیا

کنعاں میں تیرے حسن کی شاید پڑی تھی دھوم | یوسف جو منھ چھپا کے وطن سے نکل گیا

زلفِ سیاہ اس کے جو عارض سے اُٹھ گئی | دریائے حسن چین و شکن سے نکل گیا

میں جا کے داغِ دل سے جو پردہ اُٹھا دیا | ہر لالہ منفعل ہو چمن سے نکل گیا

مجنوں کی چشم میں جو پڑی گردِ کارواں | اتنے میں ناقہ نجد کے بن سے نکل گیا

کشتہ ترا تھا بسکہ سب روح، بعد مرگ | جوں بوئے گل ہوا ہو کفن سے نکل گیا

خالِ سیہ کا رخ پہ نہ رہنا ہی خوب تھا | اچھا ہوا کہ زاغ چمن سے نکل گیا

چھوٹے نہ مجھ سے کوے بتاں، اس کا غم نہیں ملکِ ختن جو شاہِ ختن سے نکل گیا
کرنا روا ہے ذبح تجھے، مرغِ نامہ بر اس زلف کے تو پیچ و شکن سے نکل گیا
مرنے سے مصحفی کے یہ کیسا غضب ہوا
لطفِ سخن مذاقِ سخن سے نکل گیا

45

گرجوش پہ ٹک آیا دریاؤ طبیعت کا ہم تم کو دکھا دیں گے پھیلاؤ طبیعت کا
کھیلے ہے وہ نکّی مٹھ[1] اور ہم نے لگایا ہے ہر داؤ پہ کافر کے اک داؤ طبیعت کا
وعدے پہ جو وہ ٹھہرے تو مجھ کو بھی چین آوے موقوف صداقت ہے ٹھہراؤ طبیعت کا
ہر شعر میں باندھے ہیں فندق کے تری مضموں میں نے بھی نکالا ہے کیا چاؤ طبیعت کا
کھل جاوے صبا گر وہ تو پھر یہ کہاں کی ہو کاکل کی گرہ سے ہے اٹکاؤ طبیعت کا
اس کے لب شیریں کا کیونکر میں نہ ہوں طالب ہوتا ہے مٹھائی پر للچاؤ طبیعت کا
ہم جلد دفاتر سے کچھ پاس نہیں رکھتے الّا ہے فقط موزوں اک تاؤ طبیعت کا
خوبانِ معانی جو بیٹھے ہیں گھرے ان پر گلشن ہے ہر اک تختہ جوں تاؤ طبیعت کا
سو گل کی کلی کی تو ضامن ہوئی پر اب تک غنچہ نہ کھلا تجھ سے اے باؤ طبیعت کا
مرہم کو خموشی کے تب لے کے اجل آئی ناسور ہو بہہ نکلا جب گھاؤ طبیعت کا
الجھوں سے وہ کیا خوش ہوں جو لوگ کہ پاتے ہیں سلجھی ہوئی باتوں میں الجھاؤ طبیعت کا
ہم ڈھونڈتے ہیں جس کو وہ گرچہ ہمیں میں ہے اس پر بھی نہیں جاتا بھٹکاؤ طبیعت کا
بازار ہے گو مندا اے مصحفی ہم نے تو
آخر کو نکالا ہے یاں بھاؤ طبیعت کا

46

سر زیرِ تیغ ناز جھکایا نہ جائے گا ہم سے یہ بارِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا

1۔ ج : نکّی مٹھ (سہو کتابت)

ناصح، نہ کر یہ قصد کہ فصلِ جنوں ہے یار | اس رُت میں چاکِ جیب سلایا نہ جائے گا
جاگیں گے لاکھ فتنے گلی میں تری صنم | پر بختِ خفتہ ہم سے جگایا نہ جائے گا
ظالم، دیارِ دل کی تجھے پاس ہے ضرور | ویراں ہوا یہ گھر تو بسایا نہ جائے گا
بیٹھیں گے جا کے سایۂ طوبیٰ میں بھی اگر | سر سے ہمارے زلف کا سایہ نہ جائے گا
گل کھائیں[1] گے جگر پہ نہاں داغ عشق کے | پہنچا تمام ہم سے جلایا نہ جائے گا

اے مصحفی تو ہستیِ وہمی کا غم نہ کھا
یہ نقش وہ نہیں کہ مٹایا نہ جائے گا

47

دودِ جگر جو سلسلہ جنبانِ برق تھا | شب دستِ صد تپش میں گریبانِ برق تھا
لیلیٰ چلی تھی وادیِ مجنوں کو جس گھڑی | ناقے کی جست و خیز میں عنوانِ برق تھا
اب کیا ہوا جو آہ کی طاقت نہیں ہمیں | سینہ کبھی تو عرصۂ جولانِ برق تھا
مرغِ کباب اس پہ ہوئے سیخ پر کئی | نالہ مرا کہ سروِ گلستانِ برق تھا
دامن ترا سنجافِ تمامی سے کیوں ملا | کہتے ہیں اس کے ساتھ تو پیمانِ برق تھا
آپ ہی اُنھوں کو آگ لگی آپ ہی جل بجھی | خرمن پہ اہلِ درد کے بہتانِ برق تھا
جنگل کو دی تھی جو مرے نالوں نے دوں لگا | کوسوں تلک وہ دشت بیابانِ برق تھا
نکلے تھی اس میں موجِ تبسّم کی جو چمک | ابر اس ادا کو دیکھ کے قربانِ برق تھا
یہ کس کے آبلوں کا لہو واں گیا تھا پھل | ہر خارِ دشت دست بہ دامانِ برق تھا
کرتا جو پیل ابر سیہ اس سے سرکشی | دستِ ہوا میں نیزۂ پیچانِ برق تھا
شب آشیانِ بلبلِ مسکیں جلا دیا | کام اس نے یہ کیا جو نہ شایانِ برق تھا
بلبل کا آشیانہ جلا پھول بچ رہے | یہ سر پہ باغبان کے احسانِ برق تھا

1۔ ج : گل کھائے ہیں

تھی چرب کش وہ کس کی کناری کی مصحفی
جو رعد[1] سو زباں سے ثنا خوانِ برق تھا

48

میں فرطِ غم میں رات جو خواہانِ برق تھا — سر پہ مرے تصوّرِ جولانِ برق تھا
روتا تھا کس سنجاف کی میں یاد میں کہ رات — اشکوں کے ساتھ چشم سے طوفانِ برق تھا
تھے نعلِ رخش کس کے شرار افگنِ زمیں — دامن جو دشت کا تہ جولانِ برق تھا
سینے میں کوندتی تھی جو شب آہِ سینہ سوز — دل کوئی زخم خوردۂ چوگانِ برق تھا
جل بھن کے رات خاکِ سیہ ہو گیا جو دل — کیا یہ کبابِ سوختہ مہمانِ برق تھا
صحرائے قیس کے جو نہ کانٹے جلا دیے — پائے جنوں کے سر پہ یہ احسانِ برق تھا
اُڑ کر جو اس پہ آتشِ گل سے پڑا تھا پھول — بلبل کا آشیانہ گلستانِ برق تھا
خطرہ گلیمِ بخت سیہ کا رہا مجھے — رنگِ سیہ پر اس کے جو میلانِ برق تھا
دامن نہ کھینچتا تھا ترا رات میں نحیف — وہ دستِ برگِ کاہ میں دامانِ برق تھا
وقتِ خرامِ ناز تری بزمِ رقص میں — دامن کا دور دورۂ دامانِ برق تھا
تھی زرق و برق اس کی جو پوشاک میں کچھ اور — میں جلوہ گاہِ حسن میں حیرانِ برق تھا

اس کی زباں پتنگ سمجھتے جو مصحفی
شعلہ تو شمع کا بھی زباں دانِ برق تھا

49

اے جان، تم سے مل چلے ٹک ہم تو کیا ہوا — بیٹھے تمھارے پاس کوئی دم تو کیا ہوا
آئے جو ہم بھی باغ میں اک روز، باغباں — بہرِ نظارۂ گل و شبنم تو کیا ہوا
ماتم میں اس کے جس کی نت آنکھوں سے خوں بہا — مژگاں کو تم نے اپنی کیا نم تو کیا ہوا
میں آپ کا ہمیشہ شریکِ طعام تھا — کھایا جو آپ نے بھی مرا غم تو کیا ہوا

1۔ مصحفی نے رعد کو مذکر باندھا ہے

تو آشنا رہے مجھے کچھ اس کا غم نہیں — بیگانہ مجھ سے ہوگیا عالم تو کیا ہوا
اتنا بھی اس کی زلف سے تو ڈر نہ، اے صبا — اس کا اگر مزاج ہے برہم تو کیا ہوا
مجروحِ تیغ عربدہ کے تم نے زخم پر — رکھا جو اپنے ہاتھ سے مرہم تو کیا ہوا
سب روئے صبر مردہ کی بالیں پہ تا سحر — اور ہم سے اس غریب کا ماتم تو کیا ہوا
ہم گو کہ تھے نہ قابلِ اسرارِ دوستی — تم نے کیا جو ہم کو بھی محرم تو کیا ہوا
طالب سمجھ کے اپنا ہمیں تم، ہمارے گھر — دس دن رہے جو ماہِ محرم تو کیا ہوا
عشقِ فزوں میں میرے نہ ہو دوستو، کمی — معشوق عمر میں ہے بہت کم تو کیا ہوا

ہے مدح سے تو انس ابھی، تو نے مصحفی
گر ہاتھ سے رکھا قلمِ ذم تو کیا ہوا

50

بزمِ سخن میں فکر مرا جب دخیل تھا — خامہ مرے بناں[1] میں پرِ جبرئیل تھا
آیا نہ وہ عیادتِ بیمارِ عشق کو — شاید مزاجِ عیسٰی مریم علیل تھا
قصدِ طوافِ کعبۂ[2] چشمِ بتانِ ہند — کرتا جو سرمہ عرصہ یہ اس کو دو میل تھا
جاتا تھا جی چلا تری رفتار کے جو ساتھ — شب ہر قدم ترا مجھے کوسِ رحیل تھا
دیکھا جمال اس کا تو بیتاب ہوگئے — بھر عمر جن کو دعویِ صبرِ جمیل تھا
سبزے کو تو نے خط کے منڈایا بُرا کیا — نادان، مصرِ حسن کا یہ رودِ نیل تھا
موئے کمر سے دل کو جو لٹکا رکھا تھا میں — یہ بھی عمل بعینہٖ جرِ ثقیل تھا
دینے میں جاں کے میں نے نہ کی اس سے کوتہی — وہ تیغ اگر[3] سخی تھی تو کیا میں بخیل تھا
آتش میں ڈالنا مرا چاہا قضا نے ہائے — زرتشت تھا اگرچہ نہ میں، نے خلیل تھا
رہتا تھا جب بہشتِ کتابت میں میرا ہاتھ — کوثر دوات تھی تو قلم سلسبیل تھا
پل مارتے ہی مثلِ شرر ہم فنا ہوئے — از بسکہ زندگانی کا عرصہ قلیل تھا

1۔ بناں=بن (انگلی کی پور) کی جمع 2۔ ج : کعبہ و چشم 3۔ انجمن: گر

اس پر بھی اعتنا نہ کیا تیغ ناز نے　　خون شہیدِ عشق کہ آبِ سبیل تھا
دعوے سے میرے تا دمِ آخر خجل رہا　　دعوائے مدّعی کہ نپٹ بے دلیل تھا
یہ نقطہ اہلِ ہند میں تھا خال پشتِ چشم　　وہ ہی عرب میں بھی رخِ لیلیٰ کا نیل تھا
دیکھا جو میں نے چشمِ حقیقت سے مصحفی
یک جلوہ فرد فرد میں یاں مستحیل[1] تھا

51

دیکھو تو کر رہا ہے وہ آج شور و شر کیا　　دریا کے ہاتھ میں ہے دامانِ چشم تر کیا
سب کائنات میں ہے ساری بس اک حقیقت　　اندھوں کو اس قدر بھی آتا نہیں نظر کیا
باتیں کئی زبانی میں نے کہی ہیں اس سے　　کیا جانیے کہے گا واں جاکے نامہ بر کیا
اتنی تو ہجر کی شب رکھتی نہ تھی درازی　　رستے میں آتے آتے گم ہوگئی سحر کیا
قیدی ہوئے قفس کے گلزار ہم سے چھوٹا　　کیا جانیں ہم جہاں میں گل کیا ہے اور ثمر کیا
صندل لپی جبیں کا آیا تھا یاد عالم　　میں کیا کہوں رہا ہے شب مجھ کو دردِ سر کیا
آئے تھے ہم جہاں سے پھر ہے وہیں کو جانا　　ہم کیا کہیں کہ ہم کو درپیش ہے سفر کیا
ہم مصحفی غنی ہیں شعر و سخن کی دولت
رتبہ ہمارے آگے رکھتا ہے سیم و زر کیا

52

رتبہ مرے سخن کا سمجھے ہے ہر بشر کیا　　یعنی ہے اس سخن سے ہر ایک کو خبر کیا
مہر سکوت لب پر جب سے کسی نے دی ہے　　ہم جانتے نہیں ہیں ہے نالۂ سحر کیا
دیکھی تھی میں ابھی تو جامے میں ڈال کر ہاتھ　　اتنے میں درمیاں سے گم ہوگئی کمر کیا
جانے کا اس گلی کو کیوں قصد کر رہا ہوں　　آئی ہے موت تیری اے مرغِ نامہ بر کیا
یار و ندیم و مونس جو پاس اب نہیں ہیں　　ہمرہ جو تھے ہمارے سب کر گئے سفر کیا

1۔ مستحیل = محال، ناممکن، حیلہ کرنے والا، بہانہ کرنے والا۔

کھا لے گی تجھ کو اک دن تیغِ برہنۂ موج　سر پر دھرے[1] پھرے ہے تو اے کشف[2]، سپر کیا

جس جا نہ ہو ہُما کا اے مصحفی گزارا
پرواز کر سکے واں پھر مرغِ جعد پَر کیا

53

جب تک نہ مجھے خاک میں ملوائے گا غصّا　ہرگز نہ طبیعت کا تری جائے گا غصّا
غصّے میں ترے ہے یہی بیزاری تو، پیارے　کاہے کو تجھے گھر مرے پھر لائے گا غصّا
ہر لحظہ یہی روٹھنا منا جو رہے گا　کیا اپنے کیے کی نہ سزا پائے گا غصّا
غصّے کو ترے میں تو نہ مانوں گا چہ خوش واہ　میں ایسا نبل ہوں، مجھے دھمکائے گا غصّا
ہاتھوں کو تو میں کھینچوں ہوں پر مجھ کو یقیں ہے　اب گھر میں مرے اس کو نہ ٹھیرائے گا غصّا
غصّے ہے اگر یار تو تم یارو، نہ بولو　دو دن میں بس اس کا بھی نکل جائے گا غصّا
اے مصحفی اب اس کے تئیں جل کے منا لا　ق　کب تک یونہی دن کاٹے گا اور کھائے گا غصّا

میں قطع کی الفت ہی نہ کر مجھ سے یہ باتیں
ورنہ تری باتوں پہ مجھے آئے گا غصّا

54

کب اس کے لب سے ہو نفسِ سرد آشنا　دردِ سخن سے ہو جو نہ بے درد آشنا
اے باغباں، تو اتنی نہ کر بے مروّتی　بلبل سے تھا کبھی تو گل درد آشنا
دورِ فلک سے رکھ نہ مروّت کی تو طمع　مردوں کا کب ہوا ہے یہ نا مرد آشنا
مجنوں غبارِ ناقۂ لیلیٰ کو دیکھ کر　بولا کہ کچھ نظر سے ہے یہ گرد آشنا
انساں کے نوع کی نہ کھلے تجھ پہ ماہیت　تا مدرکہ نہ ہووے بہر فرد آشنا
فصّاد[3]، خوں کہاں ہے تنِ زار میں مرے　نشتر نہ کر بہ تارِ رگِ زرد آشنا

1۔ ج : دھرے ہوئے　2۔ کشف = کچھوا　3۔ ج : فساد، یہ صریحاً غلط ہے "س" کے بجائے "ص" سے لکھنا صحیح ہے بمعنی فصّاد = فصد کھولنے والا

اب عزلتی ہیں مصحفی ہم، پیش ازیں کبھو
اپنا بھی تھا یہ پاے جہاں گرد آشنا

55

کوئی دشتِ عشق سا نہ بیاباں ہے دوسرا — مجنوں سا اور نہ چاک گریباں ہے دوسرا
میں لگ چلوں تو یوں وہ کہے مجھ سے راہ میں — دل پاس تیرے اور بھی، ناداں ہے دوسرا
لختِ جگر یہ روئی ہے بلبل کہ، اے صبا — دیکھے جو تو قفس میں گلستاں ہے دوسرا
کیونکر نشیدِ[1] نالۂ مجنوں نہ ہو درست — دینے کو ساتھ اس کا حدی خواں ہے دوسرا
کشتہ ہو اس کا ایک تو اس کا بیاں کروں — ہر دم قتیلِ خنجرِ مژگاں ہے دوسرا
اس خالِ رخ سے بچ کے نکل جائے گر کوئی — تو رہزنی کو خالِ زنخداں ہے دوسرا

خواہاں ہے جان کا ہی وہ بے درد مصحفی
دل دے چکے تھے آگے یہ تاواں[2] ہے دوسرا

56

پروین کے تئیں سمجھو نہ تم نور کا خوشا — ہے طارمِ[3] خضرا[4] میں یہ انگور کا خوشا
آدم کی نہ کچھ پیش گئی باتوں سے اپنی — کس طرح نہ کھاتا وہ کفِ حور کا خوشا
تجھ بن مجھے اس باغ میں، اے خوبیِ عالم — گیہوں کی ہر اک بال ہے ساطور کا خوشا
کر آنکھیں بہم چرخ نے خوبانِ جہاں کی — نام اس کا رکھا نرگسِ مخمور کا خوشا
شبنم کی لطافت نے عجب سیر دکھائی — غنچہ جو بنا دانۂ کافور کا خوشا
آرائشِ تن دُر سے تو کر لیعنی پھبے ہے — یاں نخل کو بلّور کے بلّور کا خوشا
سوفاروں سے گر خانۂ زنبور ہے ترکش — دستہ ترے تیروں کا ہے زنبور کا خوشا
زخم اس کا جو لگتے ہی گیا پھل مرے تن پر — سمجھا میں اسے نخلِ تن عور کا خوشا

1۔ نشید = گانے کی آواز 2۔ ج: ناداں 3۔ طارم = لکڑی کا مکان
4۔ خضرا = ہری گھاس

کیونکر نہ دمِ تیغ قضا سے ہو بریدہ — نت داس[1] طلب ہے سرِ مغرور کا خوشا
وہ نخلِ سر افراز ہے سولی کہ جھکا ہے — جس نخل سے خم ہو سرِ منصور کا خوشا
جب جمع ہوئے[2] نار قبس کے کئی اخگر — موسیٰ انھیں سمجھا شجرِ طور کا خوشا
بالیں سے کوئی اس کی نہ انگور اُٹھاؤ — توشہ ہے فقط عاشقِ رنجور کا خوشا

اے مصحفی دہقاں سے گلہ کیا ہے کہ اپنی
قسمت میں نہیں خرمنِ معمور کا خوشا

57

اس قدر تیز نہ چل میں ترے قربان، ہوا — خاک ہوتی ہے غریبوں کی پریشان ہوا
حال مت پوچھ گریبان کے پرزوں کا مرے — ان کو کرواتی ہے نت سیرِ بیابان ہوا
مژدۂ گل جو گرفتارِ قفس کو پہنچا — اس کی وو‌ں ہی قفسِ تن سے ہوئی جان ہوا
گر یہ شاگرد نہیں دستِ جنوں کی میرے — چاک کر ڈالے ہے کیوں گل کا گریبان ہوا
اس کو صرصر سے بچانا ہی تجھے لازم ہے — گل تو تیرا ہے چراغِ تہِ دامان ہوا
توسنِ ناز کی پہنچے نہ کبھی گرد کو تو — تجھ پہ ہے سرعتِ رفتار کا بہتان ہوا
نہ لگا ہاتھ تو اس زلف پریشاں کے تئیں — کیوں عبث پھنستی ہے کہنا بھی مرا مان ہوا
شب کو جس بام پہ تو جلوہ گری کرتا ہے — لا کے رکھ دیتی ہے واں تختِ سلیمان ہوا

پھر غزل مصحفی نے لکھی نفاست کے ساتھ
یعنی پھر اس کی ہوئی سلسلہ جنبان ہوا

58

خانۂ تن میں کوئی دم کی ہے مہمان ہوا — تو کہاں، خانہ کہاں، ہوگئی جب جان ہوا
نہ ملا وادیِ[3] مجنوں میں بھی لیلیٰ کا نشاں — ناقہ جاتے ہی ہوا سوئے بیابان ہوا
گر اُٹھاتی ہے نقاب اس کا اُٹھا دے جلدی — لے نکل جاوے ترے دل کا بھی ارمان ہوا

1۔ داس = درانتی، ہنسیا 2۔ ج : جمع ہوئیں 3۔ ج : وادیِ مجنوں سے

اتنی طاقت نہیں رکھتی کہ اچک لے جو تو باگ — ساتھ دیوے ترے گھوڑے کا دو میدان ہوا
آفریں دستِ جنوں اس تری چالاکی کو — کردیا ایک ہی جھٹکے میں گریبان ہوا
جو اسیرِ قفس بے پر و بالی ہووے — کھاوے کیا گلشنِ دنیا کی وہ انسان ہوا
چند روزے اسی صحرا میں[1] کوئی لے جاوے — تیرے بیمارِ محبت کا ہے درمان ہوا
بعد مرنے کے تو رہنے دے گلستاں میں انھیں — کیوں کرے ہے پرِ بلبل کو پریشان ہوا

یہ بگولا نہیں اے مصحفی گردِ ناقہ
خاکِ مجنوں کے تئیں کرتی ہے قربان ہوا

59

نقشِ قدم کی طرح جب چل نہ سکا، بٹھا دیا
تو نے تو مجھ کو، اے فلک، خاک ہی میں ملا دیا
حشر ہے، غل ہے، شور ہے، خاک پہ تیرے کشتے کی
کس کے خرامِ ناز نے فتنے کو یاں جگا دیا
بہہ گیا اشک ہو کے سب تن میں رہا ہے خاک اب
داغِ فراق نے ہمیں شمع صفت گلا دیا
کل نہیں پڑتی ایک دم اس کے بغیر جو مجھے
بیٹھے بٹھائے عشق نے روگ یہ کیا لگا دیا
مرغِ اسیر کو کبھی لا کے بہ رسمِ ارمغاں
برگِ گلِ فسردہ بھی تو نے نہ اے صبا دیا
قلزمِ حسن میں ترے وہ خسِ ناتواں ہے دل
موج کرشمہ نے جسے چاروں طرف بہا دیا

1۔ ج : صحرا کو

میں جو بھرے نمک سے سب ہو کے قلق میں جاں بلب
دل کی جراحتوں نے شب زور مجھے مزاد دیا
سنگ دلی تو دیکھیو چرخِ ستیزہ کار کی
لاشے کو کوہ کن کے لے پتھروں تلے دبا دیا
اب وہ نگاہِ لطف ہی یار کی اس طرف نہیں
سرمۂ تیرہ روز نے کچھ تو اسے سُجھا دیا
لیلیٰ نہ چونکی خواب سے گرچہ بچارے قیس کے
نالۂ صبح گاہ نے عرش کو بھی ہلا دیا

عید کے دن بھی مصحفی اس سے رہا تو محترز
ہوتے ہی ہمکنار آہ منہ سے نہ منہ بھڑا دیا

60

آتش کدۂ دہر سے دل سرد ہے اپنا — یہ وجہ ہے سرما میں جو رخ زرد ہے اپنا
مانندِ فلک بیٹھے نہ آرام سے اک دن — گردش میں زبس پائے جہاں گرد ہے اپنا
فنجاں سے ڈرے[1] ہے مے پرزور کے ساقی — بے حوصلہ کتنا دلِ نامرد ہے اپنا
اس خاک پہ گل لوٹے تو بلبل کو لٹا دے — جس خاک سے رخسار پُر از گرد ہے اپنا
کچھ تو نظر آئی ہے نوشتے کی حقیقت — مجموعۂ عالم سے جو دل فرد ہے اپنا
کیا جا کے گلستاں میں کریں، بادِ صبا، ہم — لختِ جگر اپنا ہی گلِ ورد ہے اپنا

مر جاویں جو ہم دردِ جدائی سے تڑپ کر
اے مصحفی سچ ہے اسے کیا درد ہے اپنا

61

ہمارے آنسوؤں کا جس دم آیا جوش میں دریا — رہا پھر دیکھ کر اس کو نہ اپنے ہوش میں دریا

1۔ ج : ڈرے ہے

جوانی کے جب اپنی آئے ہے ٹک[1] جوش میں دریا
سماتا پھر نہیں ساحل کی بھی آغوش میں دریا

اسے اب سیرِ کشتی نت مری آنکھیں دکھاتی ہیں
نہ دیکھا تھا کبھی جس مہ نے اپنے ہوش میں دریا

مگر اس بحرِ خوبی کا دُرِ گوش اس نے دیکھا ہے
جو پچھ جھک جھک کے کہتا ہے صدف کے گوش میں دریا

صبا پردہ اٹھا ایسا نہ ہو عالم ڈبو دیوے
کہ محبوبی کا پنہاں ہے ترے روپوش میں دریا

جو گویائی پہ ہم آویں تو عالم کو ڈبو دیویں
چھپا ہے مصحفی اپنے لبِ خاموش میں دریا

62

گر آوے شانِ قہّاری کا اس کی جوش میں دریا
تو قطرہ ہو سما جاوے صدف کے گوش میں دریا

یہ مارِ جعد نے کس کے اسے کاٹا ہے حیراں ہوں
جو لب پر کف ہے اور اب تک نہیں ہے ہوش میں دریا

عطش سے اس کی گر آگاہ ہووے ساقیِ مجلس
بھرے لاکر سبوے عاشقِ مے نوش میں دریا

گری کفش آب پر جس وقت اس پائے نگاریں کی
تسلّی پا گیا بس ایک ہی پاپوش میں دریا

جدا دریا سے کب ہو وہ، جو کوئی آشنا ہووے
تو سمجھے یہ کہ ہے یاں[2] موج کی آغوش میں دریا

محیطِ ذاتِ حق ہو کیونکہ درکِ آدمِ خاکی
سماتا ہے بھلا قطرے کے کب آغوش میں دریا

جدا اس بحرِ خوبی سے رہے اے مصحفی جس شب
بہایا آنسوؤں کا ہم نے بالا پوش میں دریا

1۔ ج : ٹک اپنی آئے ہے جب 2۔ ج : یاں ہے

63

کس طرح کریں، ضبطِ فغاں ہو نہیں سکتا
ہم سے تو غمِ عشق، نہاں ہو نہیں سکتا

حیرت کا یہ عالم ہے کہ اب سامنے اس کے
آنسو مری مژگاں سے رواں ہو نہیں سکتا

تو کیا کرے تیری نگۂ شرم سے پیارے
پاسِ دلِ صاحب نظراں ہو نہیں سکتا

سر خوابِ گراں سے میں اُٹھا تا پہ کروں کیا
چھاتی سے جدا سنگِ گراں ہو نہیں سکتا

عاشق ہی، مری جان، گزر جاتے ہیں جی سے
ہر ایک سے یوں جی کا زیاں ہو نہیں سکتا

چاہوں ہوں میں کچھ تجھ سے کہوں حالِ دل اپنا
پر کیا کروں، پیارے، کہ بیاں ہو نہیں سکتا

ہے مصحفی وا گرچہ مری چشمِ بصیرت
اس پر بھی تماشائے[1] جہاں ہو نہیں سکتا

64

تاراجِ فصل دے نے کیا گلستاں کو کیا
مرغانِ باغ چھوڑ گئے آشیاں کو کیا

مانا میں یہ کہ کچھ تری عصمت میں شک نہیں
لیکن کروں میں اپنے دلِ بدگماں کو کیا

آیا تھا بام پر وہ نہ کچھ ان سے ہو سکا
دشنام دوں میں نالۂ آہ و فغاں کو کیا

دیتا ہے مجھ کو آج جو بھر بھر کے جامِ مے
کیا جانے ہو گیا ہے یہ پیرِ مغاں کو کیا

سبزہ ہماری خاک سے اُگنا محال[2] تھا
پھر فصلِ گل نے سبز کیا استخواں کو کیا

پیشانیِ قمر پہ جو ہے داغِ دل کشا
اس نے کیا ہے سجدہ ترے آستاں کو کیا

ناقے کو پھیرتا ہے وہ جب دشتِ نجد سے
لیلیٰ کہے ہے جل کے کروں سارباں کو کیا

آتا ہے مارے ضعف کے غش دمبدم چلا
یہ روگ لگ گیا ہے دلِ ناتواں کو کیا

دیوان گاہِ عشق جو بے سلسلہ رہے
موت آئی اس بہار میں آہنگراں کو کیا

یاں کام اپنا نیم نگہ میں تمام ہے
تم کھینچتے ہو نیچۂ امتحاں کو کیا

یک قطرہ خوں بدن میں مرے ان دنوں نہیں
رامح[3]، کرے ہے تیز تو نوکِ سناں کو کیا

1۔ ج تماشائے بتاں　　2۔ ج محال ہے　　3۔ رامح = نیزہ مارنے والا

آئی شبِ فراق تو یکبار مصحفی
چلنے سے رہ گیا، یہ ہوا آسماں کو کیا

65

سرمہ[1] کھلا دیا جرسِ پُر فغاں کو کیا — یارانِ رفتہ بھول گئے ہمرہاں کو کیا
شعلہ اُٹھا یہ رنگِ شفق کا جو ناگہاں — آہِ سحر نے پھونک دیا آسماں کو کیا
پس تو گیا ہوں میں ٹھہر، اے آسیائے چرخ — اب توتیا[2] کرے گی مری استخواں کو کیا
بالینِ گل پہ غنچہ لیے تھا گلاب پاش — پھر بو کیا صبا نے ترے عطرداں کو کیا
در خط ہوا ہے نسخۂ اعجاز عیسوی — کھولا ہے یار نے لبِ جادو بیاں کو کیا
ہوں متہم[3] میں چشمِ پریشاں نظر سے آہ — پوچھو ہو دوستو، سببِ امتحاں کو کیا
اک جستِ شوق چاہیے بیتابِ عشق کو — اس بام پر لگائے کوئی نردباں[4] کو کیا
مرغِ چمن ملول ہے کیوں انتظارات سے — مرغِ قفس[5] کیا ہے سنا داستاں کو کیا
باتوں سے میری یار ہیں شاکی تو خوش رہیں — جیتے ہی کاٹ ڈالوں میں اپنی زباں کو کیا
آنسو رواں ہیں شوق میں اک سبزہ رنگ کے — غمناک مجھ سا جا کے کرے گلستاں کو کیا
یاں پیش چشم اور ہی سرسوں رہی ہے پھول — دیکھوں میں سیرِ سبزۂ آبِ رواں کو کیا

گل سینہ ریش و لالہ جگر داغ مصحفی
اس باغ میں بناوے کوئی آشیاں کو کیا

66

نگاہِ ناز نے جس کی دمِ نخچیر کو توڑا — مدام اس بت نے سنگ وخشت ہی پر تیر کو توڑا
لگا لکھنے جو یں زلفِ درازِ یار کا مضموں — قلم نے پھر نہ تارِ رشتۂ تحریر کو توڑا

1۔ سرمہ کھلانا (محاورہ) سرمہ کھلا کے گونگا کر دینا 2۔ توتیا = سرمہ (ج میں طوطیا) طا سے لکھنا غلط ہے
3۔ متہم = جس پر الزام یا تہمت ہو 4۔ نردباں = سیڑھی 5۔ ج : مرغ قفس کوئی ہے

خجالت حشر کے دن ہوگی مجھ کو روئے قاتل سے
کہ میری سخت جانی نے دمِ شمشیر کو توڑا

نکل جا تو بھی دردِ دل کہ تیرِ نالہ نے میرے
شبِ ہجراں میں اس سقفِ کہن تعمیر کو توڑا

بحالِ پرورش کی خامۂ مانی نے صیادی
بنایا کیا کہ بالِ بلبلِ تصویر کو توڑا

شرابِ وصل کا ساغر نہیں دیتا جو تو ساقی
مگر صانع نے پتھر سے مری تقدیر کو توڑا

وہ محرومِ ازل ہوں میں کہ باغِ حسن سے جس نے
نہ اک گل کی کلی چھیڑی نہ اک زنجیر کو توڑا

کچھ اس پیماں شکن سے مصحفی میں ہی نہیں نالاں
ہمیشہ اس نے دلہاے جوان و پیر کو توڑا

67

ساقی، نہ دکھا مجھ کو شیشہ مےِ گلگوں کا
احوال زبوں ہے یاں آپھی[1] دلِ پُر خوں کا

دل بستۂ لیلیٰ ہے وہ نجد نشیں، یارو
صحراے تجرّد میں کیا کام ہے مجنوں کا

رعنائی کو دیکھ اپنی کیوں اکڑے نہ ہر ساعت
ہے سروِ چمن بندہ کس قامتِ موزوں کا

شوریدگی اس کی میں سو رنگ نکلتے ہیں
کل کیونکہ نہ مفتوں ہو پیارے ترے مفتوں کا

وارفتہ ہے کیا گل کی، ٹک دیکھ ادھر بلبل
ہر خار میں یاں جلوہ ہے صنعتِ بے چوں[2] کا

چشمِ تر عاشق سے کیا ابر مقابل ہو
ہر اشک کے قطرے میں یاں شور ہے جیحوں[3] کا

از بسکہ نہیں کھلتا لطفِ تنِ محبوباں
تشریح میں ان کی ہی دل خوں ہے فلاطوں کا

نرگس کی قلم اس کی تربت سے نکلتی ہے
جو مار گزیدہ ہے اس چشم کے افسوں کا

اے مصحفی گر اس کے ہاتھوں کی کھلے مہندی
عالم تجھے دکھلاؤں رنگینیِ مضموں کا

1۔ ج : اپنے 2۔ بے چوں = بے مثل جس کا کوئی ہمسر نہ ہو مراد یہاں ذاتِ باری تعالیٰ ہے

3۔ جیحون = ایک دریا کا نام ہے جو بلخ کے قریب واقع ہے

ب

68

ان پہ ہر چند رہی اشک فشاں زاریِ شب　پر نہ آنکھوں سے گئی گرمیِ بیداریِ شب
روٹھنا اور ترا لڑنا نہ گیا میرے ساتھ　دن کی رنجش ہے وہی اور وہی بیزاریِ شب
کس کے گھر شادی میں جانے کا ارادہ ہے جو آج　ہے اسے دن سے ہی اندیشۂ تیاریِ شب
کیوں نہ تا صبح میں جاگوں کہ مری آنکھوں میں　شبِ ہجراں نے دیا سرمۂ بیداریِ شب
شام کے زمزمہ سنجوں سے نہ نکلی آواز　آ گئے جب بہ تہِ دامِ گرفتاریِ شب
عوضِ مرہم کافورِ سحر حق نے رکھا　داغِ سینہ پہ مرے مرہمِ زنگاریِ شب
طرح باروت کی اک دم میں دیا اس کو اُڑا　نالۂ گرم نے کی زور ہواداریِ شب
کیوں گیا تھا تری بالیں پہ تصور میرا　ہے بجا اس سے جو کچھ لیجے گنہگاریِ[1] شب

مصحفی دیکھیو پھولوں کی ستاروں کے بہار
کتنی آنکھوں میں خوش آتی ہے یہ گلکاریِ شب

69

نو اسیرانِ قفس شاکیِ صیّاد ہیں سب　آشیاں پھینکے[2] گئے ہیں چمن آباد ہیں سب
باغ یہ خون کا پیاسا ہے کہ مجنوں کے لیے　بید کے پتّے جو ہیں خنجرِ فولاد ہیں سب
کیوں اُڑاتی ہے صبا خاک تو دیوانوں کی　آپ ہی اک جنبشِ دامن میں یہ برباد ہیں سب
کیا کروں تجھ سے ترے موے کمر کا شکوہ　موے سر بھی تو ترے مائلِ بیداد ہیں سب
اشکِ خوں کے جو یہ قطرے ہیں مری آنکھوں میں　رنگ بخشِ قلمِ مانیِ و بہزاد ہیں سب
بے مروت تجھے آزردہ کریں گے ہم لوگ؟　یہ تری نازکیِ طبع کی ایجاد ہیں سب

1۔ گنہگاری = مراد تاوان، جرمانہ　2۔ اصل وج۔ پھینکے (قیاس چاہتا ہے کہ یہاں پھونکے گئے ہوں)

کبھی ادھر سے بھی ہو جا تو کہ عاشق تیرے لب پر شکوہ رکھیں ہیں گلۂ بنیاد ہیں سب
خوں رہے خاک بدن میں کہ ترے مجنوں کو طعنۂ ہم نفساں نشترِ فصاد ہیں سب
سامنے داورِ محشر کے بھی عاشق تیرے زیرِ لب اپنے چرائے ہوئے فریاد ہیں سب
بسکہ ہیں تشنۂ خوں اپنے ترے زندانی دست[1] آویختہ[2] در دامنِ جلاد ہیں سب
مصحفی تجھ سے کوئی دل کی کہے کیا ناداں
تجھ کو تو خانہ خرابی کے چلن یاد ہیں سب

70

تھی خطِ تیغ سے ان کو جو سرنوشت نصیب شہیدِ تیغ نگہ سب ہوئے بہشت نصیب
رلے[3] ہے کاسۂ سر خاک میں پڑا اپنا مگر کہ اس کو ہوئی تھی یہ سرنوشت نصیب
خزاں میں کیونکہ جیا ہووے گا وہ مرغِ اسیر نہ فصلِ گل میں ہوئی جس کو سیرِ کشت نصیب
جنھوں کے بالشِ پرنت رہیں تھے سر کے تلے ہوئے نہ بعدِ فنا ان کو سنگ و خشت نصیب
ہمیشہ عشق میں خوباں کے سنتے ہیں طعنے خدا نے اپنے بنائے ہیں کتنے زشت نصیب
زبس طواف کو آتے ہیں مہ وشانِ عرب ہے کعبے میں بھی ہمیں جلوۂ کنشت نصیب
رہیں ہیں اس لیے غمگیں کہ مصحفی ہم کو
ہوئی بروزِ ازل طبع غم سرشت نصیب

71

ہے یہ جو سطحِ بحر پہ تحریرِ موجِ آب سمجھے ہیں اس کو ہم خطِ تقدیرِ موجِ آب
گر زلفِ تابدار سے تیری وہ بڑھ چلے ہو جاوے طوقِ ورطۂ گلوگیرِ موجِ آب
تلواریں جو کھنچیں ترے کوچے میں بن گیا سطحِ ہوا کا کاغذِ تصویرِ موجِ آب
لینے کو شمعِ ماہ کا گل شب بہ بزمِ بحر کھولے ہے منہ حباب سے گلگیرِ موجِ آب

1۔ ج : دست آویختۂ دامنِ جلاد 2۔ دست آویختہ در = مراد گریباں گیر 3۔ رلنا = لوٹنا

کشتی[1] پہ وہ سوار ہے اور میرے دل پہ یاں لگتے ہیں تازیانۂ تعذیرِ موجِ آب
دریا میں تیری موجِ تبسم کے بیم سے سنگِ فساں ہے از پئے شمشیرِ موجِ آب
ابرو کی تیغ سے جو مشابہ ہوئی[2] ہے وہ کیا کیا شکار ہوتے ہیں نخچیرِ موجِ آب
لب تشنگان[3] بادیۂ یاس دور سے ریگِ رواں میں پاتے ہیں تاثیرِ موجِ آب
کھایا ہے پیچ کس خمِ ابرو کو دیکھ کر جو بن گئے ہیں شکلِ کماں تیرِ موجِ آب
کھاتی رہی ہوا سے تھپیڑے وہ مصحفی
ثابت ہوئی کسی پہ نہ تقصیرِ موجِ آب

72

اے دل کسی گل کی بو نہ کر اب خوباں کا خیال تو نہ کر اب
اے دیدہ بہت ہوا میں رُسوا بس روئے نکوے خو نہ کر اب
پیراہنِ صبر گو ہو صد چاک رہنے دے یونہی رفو نہ کر اب
رہ مستِ شرابِ بے نیازی ہرگز طلبِ سبو نہ کر اب
گیسوئے بتاں میں مرغِ دل کو وابستۂ تارِ مو نہ کر اب
ہونے دے نمازِ عشق کو فوت با خونِ جگر رفو نہ کر اب
رہ اپنا ہی عاشق تجرّد معشوق کی آرزو نہ کر اب
یک رو رہنے دے لوحِ ہستی اس آئنے کو دو رو نہ کر اب
جو چیز کہ گم ہوئی ہے تجھ سے اس چیز کی جستجو نہ کر اب
پانو کو بہ جستجوئے شاہد سرگشتۂ کو بہ کو نہ کر اب
گو آتشِ ہجر سینہ دے پھونک جلنے دے دل کو ہو نہ کر اب
اے مصحفی آرزوئے وصلت
گر حور ملے کبھو نہ کر اب

1۔ ج کشتی امر 2۔ ج ہوئی تھی 3۔ ج لبِ کشتگان؟

پ

73

شب ہوئے شیخ و برہمن بھی تری یاد سے چپ
تا سحر میں نہ رہا نالہ و فریاد سے چپ

نالے کرتا ہے وہ بے طرح چمن کے نزدیک
کوئی کہتا نہیں یہ مرغِ چمن زاد سے "چپ"

گرچہ تھا صورت شیریں کو خراشِ جگری
نہ کہا تو بھی دمِ تیشۂ فرہاد سے "چپ"

نالے کرتا ہوا پھرتا ہے جو عاشق تیرا
یہ صدا آتی ہے ویرانہ و آباد سے "چپ"

وہ زباں پر جو مرے قتل کا لایا مذکور
میں نے اتنا ہی کہا نظروں میں جلّاد سے "چپ"

کیا زمیں سر پہ اُٹھالی تھی انھوں نے اللہ [1]
ہوئے مرغانِ قفس آمد صیّاد سے چپ

جس دم آجائے فلک بر سرِ بے انصافی
کیا عجب اس کا جو بلبل کو کرے خاد [2] سے چپ

میری اور تیری نہ کیوں بحث رہے اے ملّا
نہ تو بطلان سے ساکت نہ میں الحاد سے چپ

شرح اس روئے کتابی کی ہے وہ سبزۂ خط
مصحفی رہتے ہیں منکر اسی استاد سے چپ

74

گو تجھ کو مسلماں کہے کافر، نہ دِلا چپ [3]
جز نامِ صنم اور تو کسی نام کو مت جپ

کیا عمر کے توسن کی کہوں تجھ سے میں سرعت
رہوار ہے ایسا کہ چلا جائے ہے رپ رپ

ہتھ [4] پھیر کہوں کیا میں تری چشم سیہ کا
دل لینے میں زور اس کے تئیں یاد ہے لپ جھپ

یاد آوے ہے وہ معرکۂ عشق کہ جس میں
تلواریں چلی تھیں صف مژگاں کی شپاشپ

1۔ ج : باللہ 2۔ خاد = باز 3۔ چپ (؟) 4۔ ہتھ پھیر = لوٹ پلٹ، فریب

دہقاں ہے سخی وہ ہی جو خرمن سے گدا کو غلّہ بھی اگر دیوے تو دے بھر کے کئی لپ[1]
دن رات ہوں تیغِ خمِ ابرو کے مقابل مجھ سا بھی نہ ہووے گا کوئی عشق میں سرکھپ
کر سیر ذرا مجلسِ رنداں کی کہ اس جا
اے مصحفی رہتی ہے عجب طرح کی گپ شپ

75

دریا میں چھوڑ دیوے جو گیسوئے یار سانپ مانند موج کیوں کے نہ ہو بے قرار سانپ
مشکل ہے جانبری تری چوٹی سے اب کہ وہ بھیجے ہے میرے قتل کو ہر شب ہزار سانپ
جو لے گیا ہو ساتھ تری زلف کا خیال لپٹیں نہ کیونکہ اس کو بہ کنجِ مزار سانپ
یوں خط سے حسن زلف کا ہوتا ہے جلوہ گر لہرائے جیسے برطرفِ سبزہ زار سانپ
موذی[2] گری میں اس کا یہ اُستاد ہے صریح کیا دور آدمی سے کرے گر فرار سانپ
تیرے فراقِ زلف میں اس کا عجب نہ جان ہو کیچوے کی طرح جو زار و نزار سانپ
اے بے خبر، فریفتہ دنیا کا تو نہ ہو رکھتا ہے دیکھنے ہی کے نقش و نگار سانپ
رکھ دے قلم کو ہاتھ سے تو اپنے مصحفی
پالے ہے آستیں میں کوئی ہوشیار سانپ

ت

76

نوحے کی اس گلی میں صدا تھی بلند رات کیا نالے کر رہا تھا کوئی دردمند رات
آمد شدِ خیال کا صدمہ جو دل پہ تھا جوں سبزہ روندتا تھا مجھے وہ سمند رات
اک گوشہ دیکھتا تھا کھڑا میں بھی، جس گھڑی پھینکے تھا نالہ عرش کی جانب کمند رات

1۔ لپ = دونوں ہاتھ بھر کے 2۔ ج میں یہ شعر ندارد

شاید کوئی فراق کی کہتا تھا داستاں　　جو درد کر رہا تھا مرا بند بند رات
بھر بھر کے مٹھیاں ترے رخسار کے حضور　　مجمر پہ پھینکتی تھی ثریا سپند رات
لکھتا تھا وصف کس لبِ شیریں کا مصحفی
کاغذ میں تا سحر جو[1] لپیٹا میں قند رات

77

لاکھوں ڈھے پڑے ہیں مکانِ بلند و پست　　انجام یہ رکھے ہے جہانِ بلند و پست
تیرِ بلند و پست لگا کر گرا دیے　　اس تیرزن نے کتنے نشانِ بلند و پست
تب خوش قدانِ باغ کی ہم دید کو گئے　　جب[2] ہو چکی چمن میں خزانِ بلند و پست
شمشیر پست رو نے تری قتل گاہ میں　　لاکھوں سلا رکھے ہیں جوانِ بلند و پست
سوراخوں کی قطار[3] ہے سینے میں مثلِ نے　　ازبس میں کھائیاں ہیں سنانِ بلند و پست
پیاسی ہے کس کے خوں کی خدایا وہ تیغ ناز　　نت چاٹتی رہے ہے فسانِ بلند و پست
کشتے کو ناز کے لبِ ساحل پہ مصحفی
لگتی ہے تیغِ موجِ روانِ بلند و پست

78

غمِ نہاں سے جو دل پر شکست ہے دن رات　　نت اپنا سینہ و سر پر ہی دست ہے دن رات
یہ کس کی چشم کا نقشا اڑا گئی نرگس　　جو صحنِ باغ میں ساغر پرست ہے دن رات
شرابی[4] تاک کے سایے میں اینڈتے ہیں پڑے　　مقام ان کا تہِ دار بست ہے دن رات
جلے ہے کون یہ آتش کدے میں حیراں ہوں　　جو شعلہ چرخ کو سرگرم جست ہے دن رات
گلی میں اس کی گزر مہر و ماہ کا بھی نہیں　　عجب طرح کا وہاں بندوبست ہے دن رات
خبر ہے کیا اسے مرتا ہے کون میرے[5] پر　　کہ وہ شرابِ جوانی میں مست ہے دن رات

1۔ ج　میں لپیٹا جو قند　　2۔ ج　جب ہو گئی　　3۔ ج　قطار میں　　4۔ ج　شراب تاک
5۔ ج　عاشق پر

نہ مصحفی کو خبر دیں کی ہے نہ دنیا کی
وہ مستِ بادۂ جامِ الست[1] ہے دن رات

79

تا سحر قیدِ محبت سے نہ ہم چھوٹے رات | منہ پہ منہ رکھنے کے کیا کیا نہ مزے لوٹے رات
شکوۂ ہجر کیا یار سے میں نے تو کیا | بارے اس دل کے پھپھولے تو بھلا پھوٹے رات
تھے[2] بھرے غم سے زبس، ماتمیوں نے تیرے | تعزیہ خانوں میں جا سینہ و سر کوٹے رلت
چمنِ وصل کا عالم جو مجھے یاد آیا | رخ پہ ناخن سے میں کاڑھے کئی گل بوٹے رات

آکے ساقی نے جو شب بزم میں کی بدمستی
مصحفی مے کے بھرے جام و سبو ٹوٹے رات

ٹ

80

ظالم میں کیا کہوں تری تیغِ جفا کی کاٹ | لاشے کو کردیا ہے مرے اُس نے بارہ[3] باٹ
آوازِ آبشار نہ فریادِ باغباں | سیرِ چمن سے کیونکہ مرا دل نہ ہو اُچاٹ
یوں سطحِ دل ہوا غمِ پنہاں کا اس کے رزق | کرمِ کتاب جاوے ہے جیسے ورق کو چاٹ
کیا چاہیے ہے جامۂ احرام، زاہدا | بس ہے تجھے یہ دامنِ عصمت کا تیرے باٹ
شاید ترا گزر ہو اس امید پر ہنوز | رستے کے روڑے پھینکیں ہیں چُن چُن کے راہ باٹ
اے آں کہ چکھ چکا ہے مزہ اس کے لطف کا | چندے بہ پائے تیغِ تغافل ہی عمر کاٹ

1۔ الست = اللہ تعالیٰ نے عالمِ ارواح میں تمام انسانوں کی روح سے یہ عہد لیا ہے جس کا اشارہ قرآن مجید کی اس آیت میں کیا گیا ہے "الست بربکم قالوا بلیٰ"۔ 2۔ ج : تھے زبس غم سے بھرے 3۔ بارہ باٹ = برباد

دلی کی آرزو میں میں روتا ہوں مصحفی
یاد آوے ہے وہ مجھ کو نگمود[1] کا جو گھاٹ

81

کہتا ہے کہ جلوہ ہے عیاں یار کا گھٹ گھٹ
مطرب بجے آتا ہے نظر تو مجھے نٹ کھٹ

از بسکہ ہے بیمار ترا صاحبِ بستر
ان روزوں میں دشوار ہے لینا اسے کروٹ

یہ کس نگۂ تیز نے ناوک فگنی کی
فوجِ صفِ مژگاں جو وہیں کھا گئی[2] گھونگھٹ

اُڑ جاتے ہیں رستم کے بھی اس لحظہ وہیں ہوش
پھینکے ہے سمند اپنے کو جس وقت وہ سرپٹ

تعویذوں میں ہیکل کی کیا تعبیہ اس کو
پرویں کے جو ہاتھ آئی شب ان پانوؤں کی انوٹ[3]

جاگے تھے بلا کس کی صنم خوابِ عدم سے
چونکا میں فقط سن کے ترے پانوں کی آہٹ

کوئی جام لیا چاہے تو چل مصحفی تو بھی
دوکان پہ ساقی کی ہے اک زور ہی جمگھٹ

82

چینِ جبیں نے اس کو دیا ملکِ چیں اُلٹ
اور زلف نے سوادِ حبش کی زمیں اُلٹ

جاوے نمازیوں میں وہ کافر تو بس وونہی
دے الٹی چتون اس کی صف اہلِ دیں اُلٹ

عیسٰی ترے مریض کی بالیں پہ تھا خموش
جس دم گیا تھا اس کا دمِ واپسیں اُلٹ

کیا جانے اس مریض کو ہے کس کا انتظار
جاتا ہے دم بدم جو دمِ واپسیں اُلٹ

کیا فائدہ کرے یدِ بیضا سے دشمنی
مہری نہ آستیں کی تو اے نازنیں اُلٹ

ان بے قراریوں سے یہ ڈر ہے کہ بعد مرگ
عاشق کا سنگ قبر نہ جاوے کہیں اُلٹ

لاکھوں بناے دل کو بہ یک گردشِ نگاہ
دیتی ہے اس کی نرگس سحر آفریں اُلٹ

تاروں نے آنکھیں اپنی لگا دی ہیں خواب میں
جس جا گیا ہے پردہ روئے حسیں اُلٹ

1۔ نگمود = دہلی میں جمنا کا ایک گھاٹ 2۔ فوج کا گھونگھٹ کھانا = شکست کھا کے پیچھے ہٹ جانا
3۔ انوٹ = پاؤں کا ایک زیور

کر رحم کشتگانِ بنا گوشِ یار پر — ہر دم صبا نہ سلسلۂ عنبریں اُلٹ
گر چاہتا ہے سیرِ بسایط[1] تو مصحفی
ملفوظِ دل کو تا ورقِ آخریں اُلٹ

83

لاکھوں گئی ہیں مجھ پہ میاں تیغ کیں اُلٹ — ہردم نہ میرے قتل کو تو آستیں اُلٹ
کشتی تباہ کردۂ دریائے غم ہیں ہم — اب ڈر ہے یہ کہ جاوے نہ تختہ کہیں اُلٹ
مجنوں تجھے دکھاویں گے ہم روئے یار سے — گاہے گیا جو سلسلۂ عنبریں اُلٹ
کیا دشتِ نجد ہے یہ ہوا سے جو بار بار — جاتا ہے پردۂ رخِ محمل نشیں اُلٹ
مسمومِ زہرِ ہجر ہیں[2] عاشق کے لختِ دل — جوں برگ پاں نہ ان کو تو اے نازنیں اُلٹ
ہے یہ جو تیری آنکھوں میں پردہ حجاب کا — اس کو کبھی تو اے صنمِ شرمگیں[3] اُلٹ
اتنا بھی مت ستا تو کہ عاشق کا تیر آہ — دیتا ہے اک کشاد[4] میں عرشِ بریں اُلٹ
اے مصحفی ہے اس کے نہ آنے کا کیا گلہ
ہم سے گیا فلک ہی دمِ واپسیں اُلٹ

ث

84

رات کرتا تھا وہ اک مرغِ گرفتار سے بحث — میں بھی تا صبح رکھی بلبلِ گلزار سے بحث
نوبہاراں میں وہ ہو جاوے ہے کیوں سرخ مگر — داغِ دل کو ہے مرے لالۂ کہسار سے بحث

1۔ بسایط = بسیط (فراخ) کی جمع 2۔ ج : میں 3۔ ج : نگہ شرمگیں 4۔ کشاد = تیر کا چلنا

طالبِ علمِ محبت جو میں تھا طفلی میں — تھی نت آنکھوں کی مرے حسن رخ یار سے بحث
صلحِ کل میں مری گزرے ہے محبت کے بیچ — نہ تو تکرار ہے کافر سے نہ دیندار سے بحث
سوزباں گو ہوئیں منھ میں ترے، اے غنچۂ گل — تجھ کو لازم نہیں کرنا مری منقار سے بحث
شیوہ ہرچند کہ اپنا نہیں طالب علمی — تو بھی موجود ہیں ہم کرنے کو دو چار سے بحث
یوں ہوئی ہار گلے کا مرے وہ نرگس مست — جوں کرے راہ میں کوئی کسی ہشیار سے بحث
ہوں وہ دیوانہ کہ اک شب جو میں گھر میں رہوں — رات کو صبح کروں کر در و دیوار سے بحث
تیرے حیراں سے مدرس کو نہیں ربط کلام — اہلِ معنی نہ کریں صورتِ دیوار سے بحث

عقل کل نے نہیں الزام دیا اس کو حسود[1]
دور ہو، کر نہ عبث مصحفیِ زار سے بحث

85

کیوں تشنۂ خوں میرا خونخوار ہے کیا باعث — کیوں ہاتھ میں پھر اس کے تلوار ہے کیا باعث
میں وصل کا خوباں کے تہمت زدہ کس دن تھا — اس رات جو ہمسایہ بیدار ہے کیا باعث
کس کافرِ بے دیں نے کی دل میں جگہ یارب — تسبیح بھی جو مجھ کو زنار ہے کیا باعث
مجلس میں وہ کون آیا افروختہ رُخ ایسا — شعلے سے پتنگے کو انکار ہے کیا باعث
کس آبلہ پا کی یہ صحرا کو خبر پہنچی — افروختہ گردن جو ہر خار ہے کیا باعث
ہنگامِ وداع اس کا نزدیک نہ پہنچا ہو — بلبل کی رخ گل پر منقار ہے کیا باعث
کن ہاتھوں کی فندق کو شب خواب میں دیکھا جو — ہر نوکِ مژہ میری خونبار ہے کیا باعث

کل ہی تو بھلا چنگا میں نے اسے دیکھا تھا
پھر مصحفیِ خستہ بیمار ہے کیا باعث

1۔ حسود = حاسد کی جمع بمعنی حسد کرنے والا

ج

86

لگا ہے کس کی نگہ کا یہ تیر کاری آج　　کہ سیل خون ہے آنکھوں سے میری جاری آج
کسی سے وصل کا وعدہ وفا کیا اُس نے　　عجب طرح کی ہے کچھ دل کو بے قراری آج
نکل کر آئے ہیں آہو برائے استقبال　　بسوئے نجد ہے لیلیٰ کی جو سواری آج
وہی مریض جو گنتا تھا کل کی شب گھڑیاں　　کرے ہے بسترِ غم پر نفس شماری آج
کچھ آپ ہی آپ بھر آئے ہے نہایت دل　　کریں گے ہم کسی صحرا میں جا کے زاری آج
اسیرِ کُنجِ قفس راہ دیکھتے ہیں ہنوز　　گئی چمن سے کدھر نکہتِ بہاری آج

یہ دن ہے عید کا، ہے مصحفی تو کیوں مغموم
ٹک آنکھیں پونچھ نہیں روزِ اشکباری[1] آج

87

روزِ اوّل سے ہے یارو چرخِ کج رفتار کج　　یعنی چلتا ہے یہ موذی نت بسانِ مار کج
کیا اسے تاب اپنے بھی بارِ نزاکت کی نہیں　　خود بخود ہوتا ہے جو موئے میانِ یار کج
الاماں مانگوں نہ کیونکر دیکھ وہ ترچھی نگاہ　　کاٹ کرتی ہے بہت پڑتی ہے جو تلوار کج
بوجھ پیری کا نہ ہم سے اُٹھ سکا کیا کیجیے　　عمر جب آخر ہوئی قد ہو گیا ناچار کج
راستی سے عدل کی نوشیرواں کو کام تھا　　اس کا کیا غم ہے اگر گھر کی ہوئی دیوار کج
سجدہ کرتے ہیں جو اس محراب ابرو کی طرف　　قبلہ ان لوگوں کا ہوتا ہی نہیں زنہار کج
بوجھ کیا ان پر پڑا ہے یہ تو بتلائے ہمیں　　اس قدر کیوں ہیں صنم مژگاں کے تیرے خار کج
بے خودی نکلے ہے یوں اس شوخ کی رفتار میں　　پاؤں رکھتا ہے کوئی جوں کیفِ سرشار کج

1۔ ج　وقتِ اشکباری

قتل گاہِ چرخ میں ہیں وہ بھی اب سیدھے پڑے
سر پہ جو رکھتے تھے اپنے مصحفی دستار کج

88

دل کی بے چینی نے شب مجھ کو کیا زمزمہ سنج
پھر میں بے ساز و نوا آہ ہوا زمزمہ سنج

اس کا کچھ غم نہیں گو مرغِ چمن ہوں خاموش
آپ اس باغ کی ہے موج ہوا زمزمہ سنج

ظلم تو یہ ہے کہ اس حزن پہ عاشق کے حضور
اس کو ہونے نہیں دیتی ہے حیا زمزمہ سنج

گٹکری[1] کا تری کچھ اور ہی عالم ہے پری
زہرہ کس دن تھی بہ ایں ناز و ادا زمزمہ سنج

آئی ہے ہاتھ میں مجنوں کے جو ناقے کی مہار
کس خوشی ساتھ ہے یہ آبلہ پا زمزمہ سنج

ہم صفیروں سے صبا کہیو کہ تم میں بھی کبھی
ایک دن تھا یہ گرفتار بلا زمزمہ سنج

کیا کروں باغ سے قسمت جو مجھے لے آئی
قفسِ تنگ میں آکر میں ہوا زمزمہ سنج

کس گلِ تر کا اسے دھیان تھا یہ گلشن میں[2]
مصحفی ہے جو بہ آہنگِ نوا زمزمہ سنج

89

جویا نہ سلطنت کے نہ خواہانِ تخت و تاج
ہم گرد ہیں فشاندۂ دامانِ تخت و تاج

کھودے جو کوئی اب بھی دفینے کو خاک کے
لاکھوں گڑے ہیں اس میں سلیمانِ تخت و تاج

خار اس کا تخت گرد، بیاباں ہے تاجِ سر
پا و سرِ جنوں نہیں شایانِ تخت و تاج

باغِ جہاں میں برگِ خزاں دیدہ وش ہوئے
کیا کیا سرِ بریدہ پریشانِ تخت و تاج

شاہوں کو کیا سمجھتے ہیں آنکھیں جنھوں کی ہیں
نت جلوہ گاہِ حسن میں حیرانِ تخت و تاج

کیا کیا نہ سرکشوں میں بہم معرکے ہیں یاں
روئے زمیں ہے عرصہ جولانِ تخت و تاج

دولت سے خسرووں کی ہمارا نباہ ہے
ہم لوگ ہیں طفیلیِ مہمانِ تخت و تاج

حسنِ تجمل اس کی سواری کا دیکھ کر
خیل پری بھی ہووے ہے قربانِ تخت و تاج

1۔ گٹکری = پیچدار سریلی آواز 2۔ ج : کیا کسی غنچہ دہن پر یہ ہوا پھر عاشق

خاک سیہ میں مل گئے وہ جن کے مصحفی
تھے مہر[1] و ماہ لعلِ گریبانِ تخت و تاج

چ

90

کیا تجھ میں برائی ہے ذرا بولیو تو سانچ — جو دختر رز تیرے تئیں کہتے ہیں سب پانچ[2]
تھا اس میں زبس اس کے خط و زلف کا مضموں — آشفتہ ہوا وہ مرے نامے کے تئیں بانچ
جو سوختۂ داغ جدائی بتاں ہے — مس کرتی نہیں آتشِ دوزخ کی اسے[4] آنچ
رکھ دیجیے سر اس کے پہ گر بارِ محبت — رستم ہو تو اس کی بھی نکل جاوے وہیں کانچ

باقی نہیں کچھ مصحفیِ زار کے تن میں
قالب نظر آتا ہے فقط پتلی کا جوں ڈھانچ

91

پھول لالے کا رکھا اس نے جو دستار کے بیچ — آگ تلووں سے لگی سرو کے گلزار کے بیچ
خون کس کس کا خدا جانیے اس نے چاٹا — آبداری یہ کہاں تھی تری تلوار کے بیچ
چین دیتا جو نہیں شوقِ تماشا اس کو — روزن اک روز نیا نکلے ہے دیوار کے بیچ
قیدِ ہستی سے ہوا کیا کوئی آزاد جو آج — شور نوحے کا ہے مرغانِ گرفتار کے بیچ
حُسن کا اس بتِ محجوب کے عالم ہے جدا — کوئی یہ جنس نظر آتی ہے بازار کے بیچ
گوندھ کر جیسے ملاوے کوئی میدے میں شہاب — سرخی اس رنگ سے گوروں کے ہے رخسار کے بیچ
کیا قیامت ہے جو کوچے میں ترے اہلِ ثواب — بیٹھنے پاتے نہیں سایۂ دیوار کے بیچ

1۔ ج : ماہ و مہر 2۔ پانچ = بانجھ 3۔ بانچنا = پڑھنا 4۔ ج : کے تئیں

مجھ کو حسرت یہ رہی ایسے چمن میں جا کر برگِ گُل بھی نہ لیا میں کبھی منقار کے بیچ
مصحفی ہوتا مسلمان جو مجھ سا کافر
دانۂ سبحہ پروتا ابھی زنّار کے بیچ

92

پروانہ گردِ شمع پھرا انجمن کے بیچ رکھنے دیا نہ پانو ادب نے لگن کے بیچ
صیاد چھوڑتا نہیں گر فصلِ گُل کے بیچ لے چل مرے قفس ہی کو اک دم چمن کے بیچ
شدّت سے اُنس تھا مجھے، دیوان کو مرے چھاتی پہ میری رکھ نہ دیا کیوں کفن کے بیچ
تم نے شبِ فراق کے تارو، یہ کیا کیا کیوں بھر دیا نمک مرے زخمِ کہن کے بیچ
بیٹھے ہیں تیرے سامنے حیرت سے یوں خموش گویا کہ ہم زباں نہیں رکھتے دہن کے بیچ
جس دن سے لے گئی ہے صبا بوے مشکِ زلف اک دھوم پڑ رہی ہے خطا و ختن کے بیچ
اس گُل کی میں لطافتِ تن کیا بیاں کروں بھر دی ہے کوٹ کوٹ نزاکت بدن کے بیچ
پیوستہ گردِ دشت رہی کُرتۂ دروں[1] آیا ہے جسمِ قیس اگر پیرہن کے بیچ
لے جا دلِ شکستہ مرے کام کا نہیں رہنے دے اس کو زلف شکن در شکن کے بیچ
منصور نے نہ زلف کے کوچے کی راہ لی ناحق پھنسا وہ قصّہ دار و رسن کے بیچ
وے دن جنوں کے آتے ہیں اب یاد مصحفی
کیا کیا بکا کریں تھے نہ دیوانہ پن کے بیچ

ح

93

کرتا ہے مجھ پہ ظلم و ستم باغباں صریح اُس نے جلا دیا ہے مرا آشیاں صریح

1۔ کرتۂ دروں = زیر جامہ، بنیان

کیوں کر سیوں میں اُن کے دہانِ سوال کو　　مرہم طلب ہیں زخمِ تنِ خونچکا صریح
برگ ونوا سے کیوں نہ ہو ہر نخل بے نصیب　　ویراں چمن کو کر گئی بادِ خزاں صریح
یا رب غمِ فراق سے ہو کیونکہ جاں بری　　درپے ہے جاں کے یہ الم جاں ستاں صریح
گلہائے باغ کیوں نہ ملیں خاک میں، انھیں　　پامال کر گیا ہے وہ سروِ رواں صریح
پردے پڑے ہوئے نہیں کچھ روئے یار پر　　وا ہو جو چشم دید تو وہ ہے عیاں صریح
اخفائے دردِ عشق کروں کیونکہ مصحفی
جوں چنگ ہیں فغاں میں مرے استخواں صریح

94

تا جاوے نہ اُٹھ کر مرے پہلو سے وہ گھر صبح　　یا رب تو شبِ وصل کو زنہار نہ کر صبح
نالے مرے کر دیویں گے دم میں اسے چھلنی　　خورشید سے رکھتی ہے عبث منھ پر سپر صبح
دیکھا جو جڑاؤ یہ ترے کان کا بالا　　نذر اس کی وہیں کر گئی صد عقدِ گہر صبح
اس رنگ سے پھیلی شبِ ہجراں کی سیاہی　　جو اس کی کدورت میں پھر آئی نہ [1] نظر صبح
خورشید کو کہہ جلد پھرے جانبِ مشرق　　زنداں میں مجھے قید نہ کر آٹھ پہر صبح
ہمراہ ہوں تا میں وہ ٹھہرتی نہیں اتنا　　اک آن میں کر جاتی ہے کیا جلد سفر صبح
کیا وصل کی شب ہی تجھے آتا ہے ستانا　　ناحق تو مرے خون پہ باندھے ہے کمر صبح
پاوے نہ تری صبح بنا گوش کا عالم　　منھ شیر سے دھویا کرے صد قرن اگر صبح
اے مصحفی شعر ایسے نہ ہوں مجھ سے کبھی صاف
کھولے نہ اگر منھ پہ مرے فیض کا در صبح

1۔ ج : نہ ٹھہرائی

خ

95

جس نخل کو کہ ہو نہ تمنائے برگ و شاخ
وہ نخل خشک ہوں میں مبرّائے برگ و شاخ

کیا وہ بھی دن تھے خوب جو میں طائروں کے ساتھ
پر مارتا پھرے تھا بہ صحرائے برگ و شاخ

آتے ہی بس خزاں کے چمن سے سٹک گئی
بادِ بہار تھی جو مسیحائے برگ و شاخ

وہ بلبلِ اسیرِ قفس ہوں جو پیش ازیں
گلشن میں دیکھتا تھا تماشائے برگ و شاخ

جب تک ہے نامیہ کی مدد اس کو خاک میں
دانے سے کیونکہ جائے تقاضائے برگ و شاخ

بادِ خزاں سے اتنا چمن پر ہوا کہ بس
واں ایک نخل کو نہ رہی جائے برگ و شاخ

فوجِ خزاں سے لٹ گئے ہیں سب نہال کاش
فصلِ بہار ہو علم آرائے برگ و شاخ

وہ دار بست موم پہ خوشے بناتے ہیں
ہوتا ہے مصحفی جنھیں سودائے برگ و شاخ

96

انگلی چھٹی تری ہے صنم نسترن کی شاخ
اس رنگ پر نہیں کسی نخل چمن کی شاخ

اس زلفِ تابدار سے کی تھی جو سرکشی
آرے سے کاٹتے ہیں غزالِ ختن کی شاخ

مجھ کو وداعِ موسم گل یاد آوے ہے
کیا کیا گلے ملیں تھیں گل و یاسمن کی شاخ

دیکھی ہے جب سے فندق دست اس نگار کی
مژگاں ہیں اشکِ خوں سے میری نارون[1] کی شاخ

نخلِ قیام سبز نہ غربت میں ہو کبھی
تا قطع ہووے دل سے نہ حبِ وطن کی شاخ

بارِ مراد لائی نہ اک شب بھی کس لیے
اے آہِ نا رسا تو بنی تھی دہن کی شاخ

1۔ نارون = انار (ایک آتش بازی)

گو مانے یا نہ مانے کوئی ہم تو مصحفی
سمجھیں ہیں کلکِ صنع کو سیبِ ذقن کی شاخ

97

نرگس کی رکھ قلم تو نہ بو یاسمن کی شاخ — کافی ہے قبرِ قیس پہ بس اک ہرن کی شاخ
کیوں ثورِ چرخ[1] کانپے نہ جب شب برات کو — جاوے فلک تک اس مہِ آتش فگن کی شاخ
گولی سے اس کی کیونکہ بچیں آہوانِ چیں — رنجک[2] کا جس کی گھر ہو غزالِ ختن کی شاخ
گو سو بہار آوے ولے یہ محال ہے — پھر سبز ہووے عُمر کے نخلِ کہن کی شاخ
حربہ ہے عاشقوں کا فقط آہِ پیچ دار — درویش لوگ رکھتے ہیں جیسے ہرن کی شاخ
سبزے سے خاکِ کشتہ پوشاک سرخ کی — پھوٹے کبھی تو لالہ خونیں کفن کی شاخ
سایے میں اس کے بیٹھوں جو تو دے صبا نکال — دیوارِ باغ سے کسی نخلِ چمن کی شاخ

گر آبیاری اس کی کرے کلکِ مصحفی
پھر ایک خشک ہو نہ درختِ سخن کی شاخ

98

ہو صراحی نہ اس سے کیونکر سُرخ — مے ہے جوں دیدۂ کبوتر سرخ
سرِ فرہاد کے لہو سے ہیں — اب تلک بے ستوں کے پتھر سرخ
تیرے کشتوں میں ہے وہ کشتۂ خجل — نہ کیا جس نے روئے خنجر سرخ
رنگِ خاکستری پہ میرے نہ جا — دل ہے سینے میں مثلِ اخگر سرخ
تھی شہیدوں کی تیرے جس جا قبر — آندھیاں واں سے اُٹھیں اکثر سرخ
خوں مرا ہے اسی کی گردن پر — جس حنا سے ہے دستِ دلبر سرخ
گل تو تھا زرد جوں رخِ عاشق — آج پاتا ہوں اس کو یکسر سرخ
آہ کس رنگِ اعتبار پہ ہے — چہرۂ آفتابِ خاور سرخ

1۔ ثورِ چرخ = آسمان کا دوسرا برج جو بیل کا ہم شکل ہے — 2۔ رنجک = بارود

خوں کہاں، مصحفی کی شریاں سے
کبھی نکلی نہ نوکِ نشتر سرخ

99

مہندی سے یوں ہوا کفِ دستِ نگار سرخ ‌ کرتی ہے برگِ گل کے تئیں جوں بہار سرخ
زخموں کے اس کے خوں نہ ہوا بند بعدِ قتل ‌ ہو کیوں نہ تیرے کشتے کی خاکِ مزار سرخ
سرکشتگانِ عشق کی لاشیں جہاں ہیں دفن ‌ اُٹھتا ہے گردباد ہو واں سے غبار سرخ
کھا کر موئے ہیں وہ جو ترے زخمِ دستِ تیغ ‌ چہرے اُنھوں کے ہوویں گے روزِ شمار سرخ
تو بھی شرابِ سرخ سے ساغر تہی نہ رکھ ‌ ہے جب تلک کہ رنگِ رخِ لالہ زار سرخ
کرتا نہیں وہ غمزۂ صبر آزما کبھو ‌ پیکانِ تیرِ ناز بخونِ شکار سرخ
تلوے فگار اگر نہیں مجنوں کے ہو گئے ‌ پھر کیوں ہے دشتِ نجد کا ہر ایک خار سرخ
شیشہ لیا جو ہاتھ میں غش کر گیا وہ شوخ ‌ آنکھوں کو اپنی دیکھ کے وقتِ خمار سرخ

وہ قتلِ مصحفی سے اُٹھاتا ہے کوئی ہاتھ
تا خوں میں ہو نہ پنجۂ آبدار سرخ

د

100

گو زمانے کو کرے گردشِ ایام سپید ‌ ہو نہ یا رب یہ ترا خطِ سیہ فام سپید
بہ شبِ چاردہم آوے جو وہ ماہِ تمام ‌ میں تمامی سے کروں اپنا در و بام سپید
کون میخارِ نفیس آئے گا گلشن میں جو آج ‌ کف پہ ہر لالۂ نیرنگ کے ہے جام سپید
گل کی پتّی سا جھلکتا ہے بدن اس میں تمام ‌ جامہ جب پہنے ہے وہ سروِ گل اندام سپید
کشتۂ رنگِ حنا کو ترے اے دشمنِ دیں ‌ نہیں دیتے ہیں کفن صاحبِ اسلام سپید

صاف تو یہ ہے کہ آنکھوں میں تری صانع نے مہر کر کر کے رکھے ہیں یہ دو بادام سپید
کیا انھیں روزِ سیاہ اپنا نظر آتا ہے تارے ہو جاتے ہیں کیوں صبح کے ہنگام سپید
ہم بھی اخگر کی طرح رہتے ہیں خاکستر پوش بر میں زاہد کے ہے گر جامۂ احرام سپید
مصحفی فکر سے خوں خشک ہوا اک تو مرا قس پہ پیری نے کیا سر کو بھی ناکام سپید
چاہیے یاروں کو اب یہ کہ لکھیں دیواں میں
جاے سرخی کے سپیدی سے مرا نام سپید

101

ہے بے مروتی سے یہ خونِ جہاں سپید دشمن کے تن سے نکلے ہے نوکِ سناں سپید
مہتاب نے جب ان کو تمامی سے منڈھ دیا آیا نظر ہر اک شجرِ بوستاں سپید
ہم تیرہ بخت قائلِ عیش و طرب نہیں دیکھا ہے کس نے خانۂ زندانیاں سپید
جاتے ہی ناقہ وادیِ مجنوں میں گم ہوا کیونکر نہ ہووے رنگِ رخِ سارباں سپید
رنگیں[1] لہو سے گریۂ بلبل نے وہ بھی آج دو چار تھیں قفس میں جو کل تیلیاں سپید
گر مشتری بھی چاہے تو اس سے نہ ہو سکے روزِ سیہ کو میرے کرے آسماں سپید
رکھنے تو دے گلی میں مجھے یار کی قدم چہرے کو کر ابھی سے نہ اے نیم جاں سپید
کیا وہ بھی اک سماں تھا جو دامن میں تم سے رات گرتے تھے اشک اے مژۂ خونچکاں سپید
جلتا رہا تھا بسکہ میں داغِ فراق سے تھے بعدِ مرگ بھی نہ مرے استخواں سپید
اے ابرِ رحمت اتنا نہیں تجھ سے کچھ بعید کردے جو نامۂ عملِ عاصیاں سپید
ہم تھے شہید، اُن کے تغافل کے مصحفی
جس قتل گہ میں تھا دمِ تیغِ بتاں سپید

102

پہنے ہے جب لباس وہ سروِ رواں سپید لاتا ہے اس کی نذر کو گل باغباں سپید

1۔ رنگیں = یعنی رنگ لیں

جس دشت میں بہا تھا شہیدوں کا تیرے خوں ‌ ‌ دیکھا نہ واں کا ذرّۂ ریگِ رواں سپید
عاشق کے رنگِ زرد کا مذکور مت کرو ‌ ‌ کیا فائدہ ہوا جو رخِ زعفراں سپید
تھے وہ جو سرخروے ازل، تیری تیغ سے ‌ ‌ چہرہ ہوا نہ ان کا دم امتحاں سپید
شاید اثر ہے وصفِ بنا گوش کا تری ‌ ‌ سوسن کی ہوگئی جو اے گل زباں سپید
آتا ہے ہر قدم پہ نظر آج کس کا خوں ‌ ‌ تھا کل تلک تو جادہ یہ اے ہمرہاں سپید
تھا زندگی میں کس کی صباحت کا مجھ کو دھیان ‌ ‌ جو خاک میں ملے پہ رہے استخواں سپید
کیا تھا جو باغبان نے بلبل کا کردیا ‌ ‌ پھولوں سے چاندنی کے تمام آشیاں سپید

وا ماندگاں کے رنگ کو ہر لحظہ مصحفی
کرتا ہے نالۂ جرسِ کارواں سپید

103

کسی پہ کیونکہ کھلے پیکرِ گلی کا بھید ‌ ‌ نہ پاوے جب کہ ملائک بھی آدمی کا بھید
کرے ہے مجھ سے سدا عشقِ غیر کا مذکور ‌ ‌ کہ اس بہانے سے لیوے وہ میرے جی کا بھید
ہے صرفہ نیم تبسّم میں اس کو اتنے لیے ‌ ‌ کسی پہ تا نہ کھلے لب کی نازکی کا بھید
مرے ہی عشق پہ موقوف کچھ نہیں کہ رہا ‌ ‌ ہمیشہ بر سرِ بازار عاشقی کا بھید
نکل گیا مرے منھ سے میں اس کو چاہوں ہوں ‌ ‌ چھپا سکا نہ میں جب آہِ عاشقی کا بھید
وہ جس طرح کہ مرے چاہنے کو جان گیا ‌ ‌ کسی پہ فاش نہ ہو اس طرح کسی کا بھید
تمام عمر رہی گلستاں میں بلبل پر ‌ ‌ ولے کبھی نہ کھلا منھ مُندی کلی کا بھید

اگرچہ سازِ محبت کا ہے وہ نغمہ طراز
ہزار پردے میں ہے تو بھی مصحفی کا بھید

104

اوّلِ شب سے ہے واں وہ تو بہ تیاریِ عید ‌ ‌ اور یاں آنکھیں سجائی ہیں میں کرزاریِ عید

تھا گرفتارِ تماشاے پری اک تو میں آہ — دام پر دام ہوئی تس پہ گرفتاریِ عید
چشم بد دور کہ کچھ اور نظر آتی ہے — یار کے طرّۂ دستار سے طرّاریِ عید
غسل و پوشاک سے محروم ہے عاشق کہ نہیں — حسرت ہجر سے کم حسرت بیماریِ عید
کچھ تو سوجھا ہے حنا کو جو بصد خونِ جگر — پور پور اس کی پہ ہے محو بہ گلکاریِ عید
کشتہ ان خوش کمروں کا میں نہ ہوں کیونکہ آہ — بندِ شلوار پہ ٹھہری ہے خریداریِ عید
اب کے شوّال میں دیکھیں تو ہو کس کس کی وداع — بے طرح سے نظر آتی ہے طرحداریِ عید
وہ حنا بندی کا عالم تری یاد آتا ہے — خواب میں بھی نہ پھر آئی شبِ بیداریِ عید

مصحفی پیتے ہیں ہم خونِ جگر یار بغیر
عشق نے ہم کو یہ بھجوائی ہے افطاریِ عید

105

آنکھیں کرے ہے نجد کا گرد و غبار بند — ہو کیوں نہ راہِ لیلیِ محمل سوار بند
آنے کے انتظار میں تیرے سحر تلک — دروازہ میں کیا نہ شبِ انتظار بند
صرصر خرام کا نہ مرے ساتھ دے سکی — ہوکر نہ دستِ بادِ صبا میں شکار بند
تا کاغذ و قلم ہے تری وصف زلف میں — کرنے سیاہ روز مجھے تین چار بند
یوں موے زائد اس خطِ نو خیز کے ہیں گرد — دہقاں کرے ہے کھیت کو جس طرح خار بند
رکھ رکھ گئے ہیں اس خمِ ابرو کے سامنے — پٹکے کمر سے کھول کے لاکھوں کٹار بند
اس کا جو مر گیا تھا تمنّائی گل کے بیچ — کرتا تھا چوبِ گل سے شگافِ مزار بند
کیا سوزِ دل نے رات مزے لوٹے صبح تک — چھاتی پہ تھا کسی کا جو دستِ نگار بند
یاں رخنہ ہاے سینہ کدورت سے ہیں پھٹے — واں ہوگئے ہیں روزنِ دیوارِ یار بند

کب کھولتے ہیں حورِ بہشتی پہ مصحفی
جو مرد کس کے باندھیں ہیں اپنا ازار بند

106

اگر ہزار کرے بلبلِ سحر فریاد
سنے نہ اس کی کبھی گل کا گوشِ کر[1] فریاد

کبھی تو کشورِ عشاق میں بھی کر تو گزر
کرے ہے یاں تری فرقت سے بحر و بر فریاد

اگرچہ لب ہیں بظاہر خموش، باطن میں
کرے ہے کشتہ کا تیرے دل و جگر فریاد

نصیحت اس دلِ نالاں کو یوں ہے جوں کوئی
کہے بہ سنگ بہ سر خوردہ "تو نہ کر فریاد"

یہ آہ و نالہ مرا رائگاں نہ جاوے گا
کبھی تو دل میں کرے گی ترے اثر فریاد

شبِ فراق ضعیفانِ عشق کی تیرے
گئی ہے عرشِ معلّٰی سے پیشتر فریاد

چھپائے دل فلک رخنہ گر سے کوئی کہاں
کرے ہے اس کی مشقت سے ہر گہر فریاد

یہ تو نے اس پہ جفا پیشہ[2] بانس تڑوائے
کہ آکے مجھ سے لگا کرنے نامہ بَر فریاد

جواب چیست ازیں ظلم مصحفی چو کند
بہ پیشِ داورِ محشر بچشمِ تر فریاد

107

پھین[3] ہو کر یہ شب اشکوں کا بہا آب سپید
جس کے آگے نہ ہوئی چادر مہتاب سپید

گر نہ ہو صحبت کامل پے ناقص اکسیر
کرے تانبے کی سیاہی کو نہ سیماب سپید

ساقیا جامِ بلوریں میں تو مے مجھ کو پلا
چاندنی فرش ہے اور ہے شبِ مہتاب سپید

قلزمِ عشق کی طینت میں ہے خونخواریِ محض
پوست غرقے کا نہ ہو کیوں تہِ گرداب سپید

روتے روتے تری فرقت میں ہوئے عاشق کے
اخترِ صبح صفت دیدۂ بے خواب سپید

زنگیِ پیر کی ابرو ہو جو ابیض تو سمجھ
سنگِ موسیٰ میں یہ مرمر کی ہے محراب سپید

تیری مہمانی کی خواہش میں پری زادوں نے
در و دیوار کیے ہیں بہ سپید آب سپید

یہ بُری شکل تھی کشتے کی ترے دیکھ جسے
ہو گیا رنگِ رخِ تیغ سیہ تاب سپید

1۔ گوشِ کر = بہرا کان 2۔ ج: جفا کار 3۔ پھین = جھاگ

شب مہتاب میں مہماں ہو جو وہ ماہِ تمام
چاہیے گھر کا مرے ہووے سب اسباب سپید

پا سکے ہے کوئی برقعے کی ترے برّاقی
ماہ کے سر پہ ہے گو نور کی جلباب[1] سپید

رنگ گلزار جہاں کم ہے قراری یارو
ہو شگوفے کی طرح کیونکہ نہ عناب سپید

رنگِ بے رنگیِ معشوق کا جو کشتہ ہے
اس کو دیتا ہے کفن لالۂ سیراب سپید

حیف ہے قندِ مکرر کا کا وہاں لیجیے نام
صورتِ شہد مُصفّا ہو جہاں راب سپید

ہیں جو مشتاقِ سوادِ قلم نادرہ فن
دستے کاغذ کے مجھے بھیجیں ہیں احباب سپید

مصحفی ہے وہ سیہ کار کہ اس کا نامہ
گر ملک دھوئیں تو ہووے نہ بہ سیلاب سپید

108

اے فلک رکھ نہ تو یہ بات روا میرے بعد
ہاتھ میں گل کے ہو دامانِ صبا میرے بعد

خون روتا ہوں میں اس غم سے کہ کیا جانے کون
تیرے پاؤں کو لگا دے گا حنا میرے بعد

مجھ کو ہنگامۂ مردم سے بچانا، اے عشق
میری تربت پہ نہ ہو حشر بپا، میرے بعد

دے گیا مہر کوئی بسکہ اُنھوں کے لب پر
ایک غنچہ بھی چمن میں نہ کھلا میرے بعد

صحبتِ گل کو غنیمت سمجھ اے مرغِ چمن
نہیں رہنے کی یہ گلشن کی ہوا میرے بعد

قتل کرا تنا پشیماں ہے کہ اب آپ وہ شوخ
زندگی کی مری مانگے ہے دعا میرے بعد

گو میں ناشاد گیا عالمِ امکاں سے تو کیا
دلِ دشمن تو بھلا شاد ہوا میرے بعد

مجھ کو ذلت سے جو صیاد نے مارا تو کوئی
دام میں اس کے نہ پھر آکے پھنسا میرے بعد

مصحفی مجھ کو نہ پایا جو تجسس میں مرے
در بدر خوار پھری میری وفا میرے بعد

109

موسمِ گل نے کیے کوہ و بیاباں آباد
کیوں نہ ہو نالۂ بلبل سے گلستاں آباد

1۔ جلباب = چادر

کافری ہے ترے غمزے کی یہی گر کافر	کبھی ہونے کا نہیں کشورِ ایماں[1] آباد
کی شفاعت جو اسیروں کی کسی نے تو کہا	اور اک سال رہے خانۂ زنداں آباد
جس نے آنکھوں کو تری دی یہ حیا اس نے کیا	شہر فتنے کا تہِ سایۂ مژگاں آباد
اے فلک تجھ سے میں پوچھوں ہوں بھلا یہ تو بتا	کبھی ہووے گا مرا کلبۂ احزاں آباد
ایک گردش میں فلک کی نہ رہا ان کا نشاں	گھر کئی تھے جو تہِ گنبدِ گرداں آباد
خبرِ غارتِ دہلی سے دل اپنا ہے ملول	چھوڑ آئے تھے ہم اس شہر کو یاراں آباد
پوجے پاؤں انھوں کے ترے کوچے سے نکل	جن دِوانوں نے کیا دشتِ مغیلاں آباد
مصحفی میں ہوں اب اور جامۂ عریانی ہے
تھا کبھی چاکِ ملامت سے گریباں آباد

ز

110

سرخ کیا بھیجے اسے عاشقِ مسکیں کاغذ	آگ بن جاوے ہے وہ دیکھ کے رنگیں کاغذ
زخمِ سینہ کو جو مرہم نہیں ملتا تو مسیح	اس پہ دیتے ہیں لگا ہم پئے تسکیں کاغذ
رحم آتا ہے مجھے طائرِ دل پر اپنے	لے چلا ہے یہ کبوتر سوے شاہیں کاغذ
جب صباحت کا بدن کی میں ترے وصف کروں	رگِ گل ہووے قلم اور ہو نسریں کاغذ
طاقتِ بال کبوتر نہ ہوئی اس کی حریف	بسکہ تھا نامۂ عشاق کا سنگیں کاغذ
وے جو عاشق ہیں ترے لکھ کے وصیت کا مدام	رات کو سوتے ہیں رکھ کر تہِ بالیں کاغذ
مصحفی خط سے بھی نکلا ہی کیا اس کے عتاب
اس نے بھیجا نہ کبھی بے شکن و چیں کاغذ

1۔ ج: کشورِ امکاں

ر

111

جس ورق پر ہو مری کج نظری کی تصویر
کھینچ دے پاس کوئی اس کے پری کی تصویر

مجھ کو رسوائے جہاں خامۂ مانی نے کیا
لکھ کے کاغذ پہ پریشاں نظری کی تصویر

پُر دلی کا تری جس جا کہ لکھا ہو نقشا
وہیں پھبتی ہے مری بے جگری کی تصویر

ان کھلے بالوں پہ کیونکر نہ پری مرجاوے
بد بلا ہے تری آشفتہ سری کی تصویر

صفحۂ خاک پہ ہر نقشِ قدم دیتا ہے
پھر مجھے یاد مری بے خبری کی تصویر

بول اُٹھے ہے وہیں وصل کی شب رات سے وہ
رکھوں کھنچوا کے جو مرغِ سحری کی تصویر

دیکھ پیرایہ ترا کہتے ہیں یوں صورت بیں
ہم نے دیکھی نہیں اس جلوہ گری کی تصویر

تیری رفتار سے کیونکر نہ مصور ہو خجل
جب وہ کھینچے روشِ کبک دری کی تصویر

مصحفی نالے سے دل خاک تسلّی پاوے
سامنے تو ہے وہی بے اثری کی تصویر

112

جب سے وہ آستاں ہے ہماری جبیں سے دور
یہ چشمِ تر کبھی نہ ہوئی آستیں سے دور

آئے بھی تیری بزم میں گاہے تو ہم غریب
مارے ادب کے بیٹھے ترے ہم نشیں سے دور

صیّاد میں دو رنگیِ گلشن سے داغ ہوں
رکھیو مرے قفس کو گل و یاسمیں سے دور

یہ داغ دیدنی ہے کہ حسرت میں جوں سپند
تارے جلیں ہیں اس کے رخِ آتشیں سے دور

کاہے کو لب پہ مہرِ خموشی رکھے کوئی
دل کا ملال ہووے گر آہِ[1] حزیں سے دور

انداز[2] اس کا یہ ہے تو سوجھے ہے، جاوے گا
یہ تیر نالہ کنگرِ عرشِ بریں سے دور

خلوت میں اس کی کیونکہ قدم اپنا رکھ سکے
ہے یہ مقام زاہدِ خلوت گزیں سے دور

1۔ ج : جو آہِ حزیں 2۔ ج : انداز ہے یہ اس کا

کس سے یہ منفعل ہے کہ ہوتی نہیں ہنوز بوندیں عرق کی گل کے رخِ شرمگیں سے دور
پھر آج روبرو وہی صحرا ہے، کل دِلا آگے نکل گیا تھا میں جس سرزمیں سے دور

پڑھ دوسری غزل تو کہ سن جس کو مصحفی
سامع نہ اپنے لب کو رکھے آفریں سے دور

113

پردہ ہوا ہے کس کے رخِ آتشیں سے دور جوں برق جلوہ پہنچے ہے عرشِ بریں سے دور
ناقے کو سوے نجد لیے جائے ہے کوئی ہے ساریاں جو لیلیِ محمل نشیں سے دور
اس رخ سے کل صبا نے جو پردہ اُٹھا دیا سورج نظر پڑا قدِ آدم زمیں سے دور
افسوس ہم کو کھانے دے اچھی نہیں یہ وضع دنداں کو رکھ تو اپنے لبِ نازنیں سے دور
فتراک سے بندھا جو سرکشتہ کیا ہوا ہے اب تک اس کا ہاتھ تو دامانِ زیں سے دور
اوروں کے دل میں تیرا تصور پھر آ گیا رکھا حجابِ حسن نے اس کو ہمیں سے دور
جو دم ہے زندگی کا شبِ ہجر میں نہیں مثلِ چراغِ صبح دمِ واپسیں سے دور

وعدے کے باندھے ہم ہیں کھڑے در پہ مصحفی
ہم سے زمیں ہے دور نہ ہم ہیں زمیں سے دور

114

ہوتا ہے رو و مو کا غبار آستیں سے دور مشکل ہے یہ ملال ہو طبعِ حزیں سے دور
ایسا نہ ہو کہ ہووے مکدر مزاجِ یار اے گردِ ناقہ رہ مہِ محمل نشیں سے دور
زیرِ زمیں بھی نقب لگاتے پہ کیا کریں مدفوں ہیں اس کے کوچے کی ہم سرزمیں سے دور
لگتا ہے جس زمیں پہ دل اپنا جفاے چرخ دیتی ہے پھینک مجھ کو اسی سرزمیں سے دور
مجھ کو بڑا عجب ہے کہ ایسی بہار میں پاے صبا ہو سلسلۂ عنبریں سے دور
جو دور بیں کہ دیکھے نہ نزدیک کا ہی حال آنکھیں ہیں اس کی عینکِ نزدیک بیں سے دور

دل کی شکست میں ہے فنا اپنی مصحفی
ٹوٹے نگیں تو حرف نگیں ہوں نگیں سے دور

115

قاصد کے ڈر سے بسکہ میں کی بات مختصر — خط بھی لکھا جو اس کو تو ہیہات مختصر
شاید دیارِ عشق کا ہے آسماں جدا — دن بھی جو واں بڑھے تو نہ ہو رات مختصر
مل لوں ہوں اپنے یار سے رستے میں میں یونہی — ان روزوں آرہی ہے ملاقات مختصر
رو رو کے میرے دیدۂ گریاں نے روز و شب — آخر کیا ہی قصۂ برسات مختصر
عالم میں ٹوپی کُرتی کا کیونکر نہ ہو رواج — ٹھہری ہے اس زمانے کی اوقات مختصر
گرتا بیاضِ چشم میں ہوتی اگر صنم — برگِ سمن کی طرح تری گات مختصر
گردوں سے ہے گلہ کہ جب آئی شبِ وصال — کی اس نے مارے ضد کے وہی رات مختصر

دزدیدہ دیکھنے پہ میں قانع ہوں مصحفی
کافی ہے مجھ کو اس کی عنایات مختصر

116

اگر سو طرح کی تہمت[1] لگاویں دشمناں تم پر — نہ تم ہو بدگماں ہم پر نہ ہم ہوں بدگماں تم پر
تمھاری بدگمانی نے تو میرا جی جلا ڈالا — پڑے اے دیدۂ دل ٹوٹ اک دن آسماں تم پر
پھرو ہو راتوں کو ہمسایہ میں کیا چرخ نیلی نے — ستاروں سے صنم چھوڑے ہیں لاکھوں دیدباں[2] تم پر
سگوں[3] سے اپنے تم کو دانت کاٹی روٹی ہے صاحب — عبث[4] جی جان دیتا ہے یہ مشتِ استخواں تم پر
تماشا ہے جو کوئی چوری تمھارے ہاتھ لگ جاوے — تمھاری طرح پھر ہونے لگیں ہم سرگراں تم پر
زباں بازی سدا کرتے رہے تم مجھ پہ حیراں ہوں — کترنی[5] سی چلے ہے آج کیوں میری زباں تم پر

1۔ ج : چلے (معنی تہمت) 2۔ دیدباں = وہ سوراخ جن میں سے تاک کر تیر یا گولی چلاتے ہیں
3۔ سگوں = اپنوں، بیگانو 4۔ ج : عیب (سہو کتابت) 5۔ کترنی = قینچی

ستاتے ہو بہت تم اس کو پیارے مجھ کو یہ ڈر ہے
نہ دیوے جان اپنی مصحفیِ ناتواں تم پر

117

ہوئی بہ رنج و محن شست سال کی عمر　لگے نہ تیری کیوں دل میں اس کمال کی عمر
نمود وہمی سی ہے شامِ زندگانی کی　ہر اک ستارے کو ملتی ہے یاں ملال کی عمر
گھٹی بڑھی وہ سمجھتے نہیں زمانے کی　ملے ہے جن کے تئیں تیری زلف وخال کی عمر
یہ مانگے ہے شبِ تاریک میں دعا عاشق　دراز ہو تری زلفوں کے بال بال کی عمر
برنگِ مہر نہ پست و بلندِ دہر پہ جا　نہ یاں کمال کی مدت نہ کچھ زوال کی عمر
شبِ وصال کو اے کاش ٹک بڑھا دیوے　گھٹا کے یہ فلکِ پیر کوتوال کی عمر
جو دم ہے ہے دمِ شمشیر مصحفی مجھ پر
کسی نے کاٹی نہ ہووے گی اس ملال کی عمر

118

ملتی ہے اجل جس کو کفن نذر پکڑ کر　سو جاوے ہے وہ خاک کو تن نذر پکڑ کر
تھی بسکہ وہ مشتاقِ سیہ چشمیِ لیلیٰ　مجنوں سے ملی آنکھ[1] ہرن نذر پکڑ کر
اس گلشنِ خوبی کو لگے کھینچنے تصویر　نقاش مرقعے کا چمن نذر پکڑ کر
کس دستِ حنابند کے چھلّوں کے یہ گل ہیں　جو ملتے ہیں گل ان سے چمن نذر پکڑ کر
کیا خوب پھر اب لگنے لگی کان سے گل کے　شبنم تو کئی دُرِّ عدن نذر پکڑ کر
تم نے دلِ حیراں کو مرے سخت ستایا　آئینے کو آرایشِ تن نذر پکڑ کر
اس برہنہ پائی پہ یہ ہے قیس کی شوکت[2]　جو کانٹے بھی ملتے ہیں تو بن نذر پکڑ کر
کیا نالہ و آہ اپنے بھی مغرور ہوئے ہیں　دو تیر ترے، صید فگن، نذر پکڑ کر
کل کل گئی مشہد سے شہیدانِ وفا کے　بادِ سحری عطرِ کفن نذر پکڑ کر

1۔ ج : آنکھیں　2۔ج : عزت

کشتے سے تری تیغ تغافل کے ملے گا   صحرائے قیامت بھی کفن نذر پکڑ کر
رنگِ مسی و پاں سے ترے بوسہ طلب ہے   لالے کی کلی اپنا دہن نذر پکڑ کر

اے مصحفی اب پڑھ غزلِ تازہ تو ہم کو
بہلائے ہے کیا نظمِ کہن نذر پکڑ کر

119

زلفوں سے ملا شانہ شکن نذر پکڑ کر   بٹنا گلِ عارض کو چمن نذر پکڑ کر
جو آنکھیں رہیں تشنۂ خوں شیر دلوں کی   ہم سادہ ملے ان سے ہرن نذر پکڑ کر
چوٹی نے تری اس کو کیا سنگِ فلاخن   کالا جو گیا تھا اسے من نذر پکڑ کر
کیا شمع کی پا بوس سے محظوظ ہوا ہے   اک دیدۂ حیراں کو لگن نذر پکڑ کر
حیراں ہوں کہ کیوں جاتی ہے پھر سوئے گلستاں   زلفوں کو صبا بوئے سمن نذر پکڑ کر
وحشت کو مری پاویں[1] گے؟ کیا سمجھے ہیں آہو   گو جاتے ہیں صحرائے ختن نذر پکڑ کر
کیا دخل ہے کچھ منھ سے کہیں اپنے کہ ہم لوگ   بیٹھے ہیں خموشی کو دہن نذر پکڑ کر
ہیں گوکھرو یہ نقرئی دامن میں تمھارے   کلیاں گئیں یا اپنی سمن نذر پکڑ کر
اس چاہِ زنخداں نے کسے پانی پلایا   سو پیاسے سے موئے دلو و رسن نذر پکڑ کر
عاشق کا دمِ گریہ ترے لب سے جو ملتا   ق ہر لختِ جگر لعلِ یمن نذر پکڑ کر
تو روزِ جزا لاشے کا اس کشتے کے کرتی   پابوس شفق سُرخ کفن نذر پکڑ کر

اے مصحفی یکسر میں بنا سروِ چراغاں
شب خنجرِ قاتل کو بدن نذر پکڑ کر

120

جان جانی ہے مری، اے بتِ کم سن تجھ پر   مرہی جاؤں گا گلا کاٹ کے اک دن تجھ پر

1۔ ج: جاویں گے

وام کر تاروں سے آنکھوں کو نظر کرتے ہیں کس قدر شیفتہ ہیں چرخ کے ساکن تجھ پر
اے پری، شب کو نہ تو بام پر آ بال کھلے مجھ کو یہ ڈر ہے نہ عاشق ہو کوئی جن تجھ پر
لے کے دل بوسہ جو دیتا ہے تو خط لکھوا لے اور دعویٰ نہ کرے کچھ کوئی راہن تجھ پر
حیف ہے مصحفی کچھ منھ سے نہ نکلا تیرے
رات مجلس میں پڑیں گالیاں گن گن تجھ پر

121

چھریاں چلیں شب دل و جگر پر لعنت ہے اس آہِ بے اثر پر
بالوں نے ترے بلا دکھا دی جب کھل کے وہ آ رہی کمر پر
نامے کو مرے چھپا رکھے گا تھا یہ تو گماں نہ نامہ بَر پر
پھرتے ہیں جھروکوں کے تلے شاہ اس کو میں امیدِ یک نظر پر
کیا جاگا ہے یہ بھی ہجر کی شب زردی سی ہے کیوں رخِ قمر پر
پھر غیرت عشق نے بٹھائے درباں شدید اس کے در پر
رہتی ہیں بوقت گریہ اکثر ق دو انگلیاں اپنی چشم تر پر
ہے عشق سخن کا مصحفی کو
مائل نہیں[1] اتنا سیم و زر پر

122

وحشت ہے میرے دل کو تو تدبیر وصل کر پانو میں اس غزال کے زنجیر وصل کر
زخمی شکار ہوں میں ترا مر ہی جاؤں گا پہلو سے مت جدا تو مرے تیر وصل کر
اک لحظہ تیری باتوں سے آتا ہے دل کو چین ہمدم خدا کے واسطے تقریر[2] وصل کر
دستِ دراز اپنے کو طوقِ گلو مرا تو ایک دم تو اے خمِ شمشیر وصل کر

1۔ ج : نہیں ہے 2۔ ج : تدبیر وصل

اے مہ یہ تیری دورکشی کب تلک بھلا　　اک شب تو تو ارادۂ شب گیرِ وصل کر
سینہ پہ سینہ خشت پہ گویا کہ خشت ہے　　اب اے فلک، نظارۂ تعمیرِ وصل کر
تہمت لگے گی، پاس بٹھانے سے فائدہ　　ناحق نہ مجھ کو موردِ تقصیرِ وصل کر
مت چاندنی میں آ کہ زمانہ غیور ہے　　اس کام کو سپردِ شب قیر[1] وصل کر
شاید کہ پڑھ کے نرم ہو دل اس کا مصحفی
جا کر حوالے اس کے یہ تحریرِ وصل کر

123

خالِ نرمہ[2] سے ہے یوں اس خطِّ ریحانی پہ مہر　　جیسے فردِ دستخطی کی ہووے پیشانی پہ مہر
بخت کی برگشتگی سے دن مرے پھرتے[3] نہیں　　دے رکھی ہے اس نے اسبابِ پریشانی پہ مہر
ہاتھ میرا شہپرِ طاؤس سے کچھ کم نہیں　　ہیں گلوں کی بسکہ اس ساعد کی طولانی پہ مہر
رہ گئی بینش سے وہ ایسی[4] کہ گویا بعد ذبح　　دے گیا قاتل بیاضِ چشمِ قربانی پہ مہر
چشم کے دنبالے پر تیرے ہے[5] یوں خالِ سیاہ　　ہووے[6] جوں دنبالۂ[7] تیغ صَفاہانی پہ مہر
سکتہ رہ جانے کا اس کے بھید کچھ کھلتا نہیں　　کس کی حیرت کی ہے آئینے کی حیرانی پہ مہر
نامہ خوش چشموں کو پہنچے یہ اشارہ اس کا تھا　　تھی جو بادامی مرے نامے کی پیشانی پہ مہر
ملکِ شاہاں میں تصرف جو کوئی چاہے کرے　　دے گیا ہے کون تاج و تخت سلطانی پہ مہر
مانعِ زہر اجل زنہار ہو سکتی نہیں　　جوں حسن دیوے کوئی محتاط گو پانی پہ مہر
پھاڑتا جائے گریباں سینہ ہی پر کیا کروں　　داغِ سودا سے ہے صد جارخت عریانی پہ مہر
خط غلامی کا وہ مجھ سے مانگتا تھا مصحفی
بھیج دی اک فرد کی میں کر کے پیشانی پہ مہر

1۔ شبِ قیر = تاریک رات　　2۔ نرمہ = کان کی لو　　3۔ ج : پھرتے ہیں کب
4۔ مطلب یہ کہ کھلی رہ گئی　　5۔ ج : دہیں یوں آنکھیں لگیں　　6۔ ج : ہوویں
7۔ دنبالۂ تیغ = مراد تلوار کا دستہ

124

لاکھ داغوں سے ہے میرے رختِ عریانی پہ مہر
متصل جوں ہوں پرِ طاؤسِ بستانی پہ مہر

سر بسر داغِ سودا ہے مرا ہر اک عضو
جس طرح ہو جابجا آلاتِ سلطانی پہ مہر

غل مچانا نالۂ زنجیر کا اچھا نہیں
چاہیے ہر لحظہ اک زنجیرِ زندانی پہ مہر

قتل کی خاطر کیا تھا جس کو تو نے انتخاب
تجھ کو کرجانی تھی قاتل اس کی پیشانی پہ مہر

وائے قسمت بزم میں ہم تشنہ لب جو آئے ہیں
کر گیا ساقی بہ سوئے راح[1] ریحانی پہ مہر

موم کا رکھنا تو بہرِ چشم بد بد بھی نہ تھا
گر نہ دیتا وہ ترے بالوں کی پیچانی پہ مہر

واصلانِ حق بنا بیٹھے ہیں گونگا آپ کو
ہے لبِ خامُش سے یاں اسرارِ پنہانی پہ مہر

تیرہ بختی میں عیاں ہے اپنی یہ روزِ سپید
یاں نہیں موقوف کچھ نوابی و خانی پہ مہر

اس قدر رویا کہ آنکھیں یہ چلیں جوں رودِ نیل
کر کے مالک خطِ بیع ماہ کنعانی پہ مہر

نزع کے دن جان کا دینا ہمیں مشکل ہوا
دی سبک وضعی نے جو اپنی گراں جانی پہ مہر

گو کریں اس کا احاطہ سچ ہے، دے سکتے نہیں
اوس کے قطرے تو سنبل کی پریشانی پہ مہر

سجدہ گاہ اس کو بنایا ہم نے اپنا مصحفی
تھی جو داغِ سجدہ کی مدّت سے پیشانی پہ مہر

125

ہے دام فگن زلفِ گرہ گیر ہوا پر
عنقا ہو بھلا کیونکہ نہ تسخیر ہوا پر

قاصد جو صبا ہو تو لکھوں میں کوئی پُرزہ
موقوف ہے خط کی مرے تحریر ہوا پر

ہمراہ بگولے کے کئی پیچ جو کھائے
خاکِ تن مجنوں ہوئی زنجیر ہوا پر

کس طرح نظر آئے پھر اس حسن کا عالم
جوں نکہتِ گل جس کی ہو تصویر ہوا پر

جب اس کو وہ چھیڑے ہے تو ہر بید کا پتّا
کھینچے ہے[2] پکڑ کر وہیں شمشیر ہوا پر

انداز میں نالے کا کہوں کیا شبِ غم میں
سینے سے نکل جائے ہے جوں تیر ہوا پر

1۔ راح = شراب   2۔ ج: پکڑ گردن شمشیر

قائم بہ تنفّس ہے کفِ خاک کا پتلا اس خانۂ نُہ در[1] کی ہے تعمیر ہوا پر
سوزش سے مری آہِ فلک تاب کی ہردم ہر مرغِ ہوا آوے ہے تعذیر ہوا پر

اے مصحفی نازک قلمی اپنی تو دکھلا
کر ایک غزل اور بھی تحریر ہوا پر

126

مژگاں نے سجے ترکشِ پُر تیر ہوا پر ابرو جو ہلے، چل گئی شمشیر ہوا پر
نالہ ترے دیوانے کا جا پہنچے ہے واں تک لٹکی ہے جہاں عرش کی زنجیر ہوا پر
چُوکا یہ مصوّر کہ لیا ہاتھ میں کاغذ لکھنی تھی ترے حسن کی تصویر ہوا پر
انساں کی کفِ خاک کی ہے مجھ کو بھی حیرت[2] کس طرح سے ٹھہری ہے یہ تعمیر ہوا پر
کیا نالے کروں ضبط لیے جاتی ہے اس کو سینے سے اُڑائے ہوئے تاثیر ہوا پر
سوتے میں نقاب اس رُخِ زیبا سے اُٹھایا[3] ثابت ہے بس اتنی ہی تو تقصیر ہوا پر
جب اس کو وہ ہر لحظہ چھوئے دستِ ہوس سے برہم نہ ہو کیوں زلفِ گرہ گیر ہوا پر
تیزی کہوں کیا نالۂ مرغِ قفسی کی جاتا ہے نکل چوبِ قفس چیر ہوا پر

یہ شعرِ سبک کیوں نہ ہر اک دل پہ گراں ہو
اے مصحفی ہے ان کی تو تقریر ہوا پر

127

تھا کس کا سحر نعرۂ تکبیر ہوا پر جو لاکھ گلے تھے تہِ شمشیر ہوا پر
بے خامہ و نقاش زہے صنعتِ بے چوں کھنچ جاتی ہے کیا ابر کی تصویر ہوا پر
گردوں کے تلے اتنا بھی بے خوف نہ رہ تو اس گنبدِ بے در کی ہے تعمیر ہوا پر
جاتا ہے ادھر شب کو نکل سینے سے اکثر گویا مرے نالے کی ہے جاگیر ہوا پر
سودا ہے یہ کس زلف کا اس کو جو ہمیشہ دیوانہ ترا پھینکے ہے زنجیر ہوا پر

1۔ خانۂ نُہ دَر = جسم جس کے نو دروازے ہوتے ہیں 2۔ج : یہ حسرت 3۔ ج : اُٹھاتا

تجھ بن شبِ ہجراں میں شرر نالے کے میرے　　جگنو[1] کی طرح کرتے ہیں شب گیر ہوا پر

اے مصحفی گاوے یہ غزل میری جو رانجھا
مانندِ پری اُڑنے لگے ہیر ہوا پر

128

رقصاں یہ بگولا ہے نہ چک پھیر[2] ہوا پر　　دامن کا کسی سرو کی ہے گھیر ہوا پر
کیا باد بھری کھال کا اے یار بھروسا　　گو قوت شیری سے اُڑے شیر ہوا پر
پھیلی ہے مگر میرے نصیبوں کی سیاہی　　ہوتا ہے کب آندھی سے یہ اندھیر ہوا پر
وہ طفل اُڑاتا ہے کبھی لال[3] جو گتا[4]　　پھولوں کا نظر آوے ہے اک ڈھیر ہوا پر
پامالیِ عالم سے مری خاک کے ذرّے　　رہتے ہیں ہمیشہ زبر و زیر ہوا پر
امعا کی پُری[5] مانعِ پرواز ہے جس طرح　　چڑھتے نہیں مرغانِ شکم سیر ہوا پر
پر توڑ کے صیّاد نے بلبل کے جو پھینکے　　آندھی میں وہ اُڑتے رہے تا دیر ہوا پر
کوچہ ہے ترا باغِ ارم اُڑنے میں اس کے　　ہر مرغ کو آجاتی ہے اوسیر[6] ہوا پر

اے مصحفی پرواز پس از مرگ تو کر لے
آنے کی نہیں خاک تری پھیر ہوا پر

129

دیتے ہیں گالیاں جو کھڑے میرے نام پر　　ہے آج کیا یہ لطف و نوازش غلام پر
آتش زن دل و جگر، لعل پارہ ہے　　سبزہ دھواں سا اس کے لبِ لعل فام پر
دیکھ اس کو شب لباسِ تمامی میں جلوہ گر　　ماہ تمام نے نہ رکھا پانو بام پر
رستے میں مل گیا تھا مجھے قتل کر گیا　　رک کر وہ اس کے ہاتھ کا رکھنا زمام[7] پر

1۔ ج : جن کوکہ (صریحاً سہو کاتب)　　2۔ چک پھیر = گرد باد　　3۔ اصل : لعل (صریحاً غلط)
4۔ گتا = دبیز کاغذ کا پتنگ مصحفی کا ایک شعر ہے:
جب کٹ گیا پتنگ مرے شمع رو کا تب　　بولا رقیب "آپ کا گتا لڑا کیچ"
5۔ امعا کی پُری = شکم سیری (امعا = آنتیں)　　6۔ اوسیر = غنودگی　　7۔ ج : لگام

گزرا تو جس گلی سے وہاں ہمدموں کے بیچ تلوار چل گئی تری طرز خرام پر
تا مرغ گلستاں ہو چمن جان کر اسیر صیاد برگ گل کو بکھیرے ہے دام پر
جس جا کیا تھا دفن شہیدانِ عشق کو خوں جوش مارتا ہے ہنوز اس مقام پر
آتے ہی اس کو وادیِ مجنوں میں کیا ہوا جاتا ہے ناقہ بیٹھ جو اب گام گام پر
باطل ہو جزو[1] لایتجزیٰ کا جب وجود کچھ حاجتِ دلیل نہیں انقسام[2] پر
کھایا ہے جوش شہد بلاغت میں شست سال معجون عقل آئی ہے جب ٹک قوام پر
لوحِ مزار میرا بنانا اسے بتاں یہ بیت کندہ کر کسی سنگِ رُخام[3] پر
"اس دور میں کسی نے نہیں پی شرابِ عیش جمشید کے لکھا تھا یہی دور جام پر"
جس جا کہ تیرے پائے حنائی کا تھا نشاں کیا کیا نہ کشت وخون ہوئے اس مقام پر
رکھ پختہ دل کو دینِ محمدؐ پہ مصحفی
مت جا فلاسفہ کے خیالاتِ خام پر

130

کبودی سی نہ ہو کیوں ماتمی جلباب[4] ناخن پر کہ یاں رنگ حنائے عیش ہے نایاب ناخن پر
ہلال انگشت سے جس کی ہوا ہے سوکھ کر کانٹا اسی کے چرخ مارے ہے پڑا مہتاب ناخن پر
جھکاتے ہیں سر اپنا وہ وہیں، کیا تیرے پانو کی بنی تھی عاشقوں کی مسجد ومحراب ناخن پر
ہم اک تنکے سے تار سازِ وحشت کو بجاتے ہیں غم اس کا کچھ نہیں ہے گو نہ ہو مضراب ناخن پر
نہ دستِ رو کے مارے گوشۂ دامن تلک پہنچا رہا واں لعب بازی میں گلِ سیراب ناخن پر
نہ آوے رشک کیونکر اس محرر پر مجھے جب وہ زباں سے چاٹ لے لکھ کر ترا القاب ناخن پر
شب اس کی راں میں چٹکی لی تھی میں بھی اک نزاکت سے سو ووں ہی آ گیا رنگِ گلِ سیراب ناخن پر
شبِ ہجراں میں سو رہتا ہوں پیارے بیم نسیاں سے میں تیرے نام کو لکھ کر بوقت خواب ناخن پر

1۔ جزو لایتجزیٰ = وہ حصہ جس کے مزید ٹکڑے نہ ہو سکیں، جوہر، ایٹم 2۔ انقسام = تقسیم
3۔ رُخام = سنگِ مرمر 4۔ جلباب = چادر

کہاں فرہاد پنجہ کر سکے ہے مصحفی ہم پر
کہ ہم خارا تراشی کی رکھیں ہیں آب ناخن پر

131

دیدۂ کور کو کیا روے نگار آئے نظر چشم بینا ہو تو البتہ بہار آئے نظر
گر یہ فرصت نہیں دیتا ہے کہ مجنوں کو ذرا دور سے محملِ لیلیٰ کا غبار آئے نظر
دن کو سوجھے ہے کسی زلف و کمر کا مضموں یہ بھی بس ہے جو میانِ شبِ تار آئے نظر
اس کی تربت پہ کسی نے نہ دھریں دوا ینٹیں کشتۂ عشق کا کیا خاک مزار آئے نظر
بے قراری دلِ مجنوں کی یہی کہتی ہے دور سے کاش کوئی ناقہ سوار آئے نظر
میں نے مُڑ مُڑ کے رخِ صبحِ وطن تو دیکھا کاش جلدی کہیں اب شامِ دیار آئے نظر
عالمِ عشق کا کر سیر کہ واں تیرے تئیں اور ہی شکل کی اک لیل و نہار آئے نظر
تیز ہونے دو ذرا دستِ جنوں کے ناخن پھر میں لکھ دوں[1] جو گریبان کا تار آئے نظر
طرفہ بے نور ہے یہ ہجر کی شب بھی جس میں سنگِ چقماق دے آتش نہ شرار آئے نظر
جب تلک سینے میں تھے دل کے تئیں ٹھنڈک تھی اشک مژگاں تلک آئے تو شرار آئے نظر

مصحفی عشق نہیں یہ تو بڑا روگ ہے میاں
جان ہی جائے تمنا میں نہ یار آئے نظر

132

کھاوے نہ زہر کیونکہ پری اس سہاگ[2] پر شانہ سوار ہے تری چوٹی کے ناگ پر
تھوڑی سی رات سے جو مری آنکھ کھل گئی مطرب بچے نے خوب رُلایا بہاگ[3] پر
واں تجھ کو کچھ خبر نہ ہوئی اور یاں میاں چل گئیں کٹاریاں تری مژگاں کی لاگ پر
لایا جواب گرم یہ قاصد کہ رکھ دیا پڑھتے ہی شوخ نے مرے نامے کو آگ پر

1۔ میں لکھ دوں = یعنی میں ضامن 2۔ سہاگ = سوبھاگیہ، خوش قسمتی
3۔ بہاگ = رات کو گایا جانے والا ایک راگ

چھریوں کو جس طرح کہ رکھے سان پر کوئی آواز ہائے خوش کا یہ عالم ہے راگ پر
سننے کو عرضِ حالِ غریبانِ رہ نشیں ظالم کبھی تو ہاتھ کو رکھ اپنے باگ[1] پر
جو بھاگتے میں تیغ سے تیری لپٹ گیا آتا ہے رشک مجھ کو تو اس کے ہی بھاگ پر
پیری سے یوں علاقہ تنِ ناتواں کا ہے رہ جائے جیسے خس کوئی دریا کے جھاگ پر
کیا مصحفی سے اہلِ عداوت کی پیش جائے
غالب ہوا کبھی نہ کوئی ایسے گھاگ پر

133

صبا نہ آئی کبھی بلبلِ اسیر کے گھر کب آوے ہے کوئی ہاں سچ ہے یہ فقیر کے گھر
ہمارے سینے میں روزن ہیں یہ جو اے یارو نہ جانو روزن انھیں، ہیں کسی کے تیر کے گھر
فقیر کی جو نہیں یاد اِن امیروں کو فقیر بھی نہیں جاتا کسی امیر کے گھر
کشش نے عشق کی کیا کام کچھ کیا تھوڑا ہزار بار تو رانجھا کو لائی ہیر کے گھر
کل اک اگن[1] نے مجھے آگ پر لٹایا[2] خوب کہ یاد تھے اسے[3] کچھ مرغِ خوش صفیر کے گھر
تمام چولی ہے مسکی ہوئی یقیں ہے مجھے رہا ہے رات تو جا کر کسی شریر کے گھر
کسی کی مصحفی مجھ کو بھی کچھ نہیں پروا
نہ آوے گو کہ کوئی مجھ سے گوشہ گیر کے گھر

134

اے آہ نہ جا تو دلِ رنجور سے باہر وہ کام نہ کر ہووے جو مقدور سے باہر
وہ شستہ وصاف اس کا بدن ہے کہ کہے تو نکلا ہے ابھی چشمۂ کافور سے باہر
اتنا وہ پسیجا ہے کہ اب جا نہیں سکتا سرمہ بھی تری نرگسِ مخمور سے باہر
دیکھے جو ترے حسن کی تصویر کا عالم ہو موجِ تبسّم نہ لبِ حور سے باہر

1۔ اگن = ایک خوش آواز چھوٹا پرندہ 2۔ج : رُلایا خوب 3۔ ج : کچھ اسے

اعضا میں ترے حسن سما کر یہ کہے ہے　　کیوں جاوے کوئی کشورِ معمور سے باہر
عالم جو تجلّی کا اسے واں نظر آیا　　موسیٰ کا قدم پھر نہ پڑا طور سے باہر
خورشید بھی ہووے جو مرے بخت کا مہماں　　نکلے نہ سوادِ شبِ دیجور سے باہر
گر آبلۂ دل سے مرے دیں اسے تشبیہ　　خوں نکلے وہیں دانۂ انگور سے باہر
حیران ہوں میں مصحفی اس خطِ سیہ[1] کا
کیوں آئی ہے ظلمت یہ نکل نور سے باہر

135

چل کریں ساقی چراغِ بادہ روشن آب پر　　بیٹھ کر کشتی میں ہم تم ہوں قدح زن آب پر
جوں جوں دیوانوں نے اپنے زخمِ تن ان سے سیے　　اور بھی آتی گئی کانٹوں کی سوزن آب پر
آب گلہائے چمن کو جس طرح دیتا ہے رنگ　　رنگ سے تصویر کا آتا ہے گلشن آب پر
ہوگئی بے آب اس قاتل کی شمشیرِ نگاہ　　لوگ جو رکھتے گئے آ آ کے گردن آب پر
سر اُٹھاوے کیا کہ تیرے غرقۂ کمزور کو　　ہوگیا ورطے کا حلقہ طوقِ آہن آب پر
سلکِ گوہر بن گئی ہے موج جا ساحل کے پاس　　بال جب اس نے نچوڑے وقتِ رفتن آب پر
پنجۂ مرجاں ہوا تھا غرق بحرِ انفعال　　تھا جو وہ دست حنائی سایہ افگن آب پر
ہر کوئی آتش پہ دامن مارتا ہے یاں بہ عکس[2]　　جنبشِ مژگانِ تر مارے ہے دامن آب پر
تیرہ بختی کی یبوست[3] اشک سب دیتے ہیں کھو　　خشک بالوں کے تئیں لاتا ہے روغن آب پر
مصحفی اس بحر میں لازم ہے میرا کلکِ فکر
جوں نسیمِ صبح مارے پھر بھی دامن آب پر

136

تھی گھٹا میں گات[4] کس کی سایہ افگن آب پر　　چھٹ گئی جو قطرہ افشانی کی چلمن آب پر

1۔ ج :خطِ سیہ کر　2۔ بہ عکس = برخلاف　3۔ یبوست = خشکی　4۔ گات = بدن

غسل میں تھی کس کی چوٹی سایہ افگن آب پر
عشق میں جس کے ہوئیں لہریں بروگن[1] آب پر

گریہی رونا رہا عاشق[2] کا تیرے بعد مرگ
تختہ ساں بہتا پھرے گا سنگ مدفن آب پر

تا دمِ شمشیر سے بھی تر نہ ہو بسمل کا حلق
ہے نیامِ نازِ خوباں کی یہ قدغن آب پر

واسطے اس کے کفِ افسوس ملتی ہے جو موج
رہ گیا کس ساعدِ نازک کا کنگن آب پر

کس شہیدِ ناز کا لاشہ ہوا دریا میں غرق
کررہی ہیں جو بطیں دن رات شیون آب پر

اے فلک کشتی تو بحرِ اشکِ عاشق میں نہ لا
مان کہنا یاں بچھا ہے نفت[3] روغن آب پر

خانہ ویرانوں کے گھر سے کر گیا دریا کنار
بسکہ تھا حال ان کی ویرانی کا روشن آب پر

دیکھ کر بُرّش تری شمشیر جوہر دار کی
پھینک دی تُرکِ[4] فلک نے اپنی جوشن آب پر

تیرنے میں تیرے جی ڈرتا ہے تیغ موج سے
سینہ یوں رکھا نہ کرا ے جی کے دشمن آب پر

مصحفی اب گومتی میں تو نہاتا کیوں نہیں
پاسباں ہے حسن کا کس کے برہمن آب پر

137

حلقہ کماں کا نہ رکھ گل اندام دوش پر
کافی ہے تجھ کو زلف کا اک دام دوش پر

وہ طفلِ گریہ ناک ہے اپنا دلِ حزیں
جس کو بغل میں چین نہ آرام دوش پر

کیا کیا نہ سرگزشتہ جھکاتے ہیں سر اسے
جس دم وہ رکھ کے نکلے ہے صمصام دوش پر

وہ کشتہ ہوں کہ جس کے جنازے کو راہ میں
لیتے ہیں چلتے چلتے ملک تھام دوش پر

کچھ ان دنوں میں دور ہیں کاکل کے تیرے بال
رکھتے نہیں جو ناز سے دو گام دوش پر

ہے جی میں ایسا جن کوئی تسخیر کیجیے
لاوے اُٹھا جو اس کا در و بام دوش پر

لے جاوے قتل کو ہمیں اس مجرم پر اجل
ہو خواب میں جو ساق دل آرام دوش پر

یاد آتے ہیں جو اس کو شبِ وصل کے سمیں[5]
سر دُھن رہا ہے عاشق ناکام دوش پر

1۔ بروگی، بروگن = فراق زدہ 2۔ ج : عاشق کے 3۔ نفت (نفط) = مٹی کا تیل، بارود
4۔ ترکِ فلک = مراد سورج 5۔ سمیں = مناظر

چین اس کے گھر میں کب ہے، کہاروں کو مصحفی
ڈنڈے پنس کے ہیں سحر و شام دوش پر

138

رکھتے ہیں باندھ کر ثمرِ خام دوش پر
یہ لے چلا چمن سے رہ انجام دوش پر

میں ہوچکا اسیر تو پھر نو بہار میں
صیّاد نے مرے نہ رکھا دام دوش پر

گل جامہ چاک کیوں نہ ہو جب باغ میں پھرے
دامن کو ڈال کر وہ گل اندام دوش پر

زلفوں کو تیری دیکھ کے حیراں ہو کیوں نہ چرخ
پہلو میں صبحِ رخ کے ہے وہ شام دوش پر

عاشق کو تیری زلف کے رعشہ رہا مدام
آیا جو بعدِ مرگ تو آرام دوش پر

یا رب کبھی نہ لغزشِ پا سے دوچار ہو
دستِ فتادہ لے جو کوئی تھام دوش پر

شب میکدے میں جا کے چھکے بس کہ شیخ جی
لائے سحر اُٹھا انھیں خدّام دوش پر

یا رب ہو ایسی لغزشِ مستانہ کا بھلا
ہے عرش کا جنھوں کی در و بام دوش پر

چل تو بھی مصحفی کہ ہوا قافلہ رواں
رکھا مسافروں نے سر انجام دوش پر

139

غنچے جلتے ہیں مری تازہ مضامینی پر
شاخِ گل کھاوے ہے گل شعر کی رنگینی پر

کیا کہوں صانعِ قدرت نے ترے چہرے میں
کس قدر زور قلم صرف کیا بینی پر

آرسی ہاتھ سے اک دم نہیں چھٹتی ہرگز
کتنا خود رفتہ ہے وہ شوخ بھی خود بینی پر

ہندی الاصل ہے ہرچند مرا کلکِ خیال
پر بہ تحریر ہے راجح قلمِ چینی پر

ذائقہ جن کو ہے معنی کا وہ مانندِ مگس
جان دیتے ہیں سخن کی مرے شیرینی پر

ہندوانہ جو شہیدی اسے مطلوب ہوا
رکھ دیا کاٹ کے سر اپنا میں اک سینی پر

بسکہ ہوں ملت و مذہب سے جہاں کے آزاد
خندہ تقریر کرے ہے مری بے دینی پر

ہاتھ آئے ہیں جو اس کے چمن فکر کے پھول	کیا سر انگشتِ قلم تیز ہے گل چینی پر
سر بہ زانو وہ مجھے دیکھ کر ہنستا ہی گیا	کہ اسے رحم نہ آیا مری مسکینی پر
مصحفی کا ہو یہ جب مسلکِ اندازِ غزل
طعنہ کیونکر نہ کرے سالکِ قزوینی[1] پر

140

جس طرح صبح کٹی یوں ہی کٹے شام بخیر	ہووے یا رب دلِ بیمار کا انجام بخیر
دردمند، یہ عجب منزل جاں فرسا ہے	عشق میں چاہو اگر راحت و انجام بخیر
درد و رنج و تعب و حسرت و ارمان و فراق	یہ ہی دل ہے تو کٹے کیونکہ یہ آلام بخیر
دیکھنے پائی نہ تکلیفِ قفس کو بلبل	پہنچی جنت کو وہ آتے ہی تہِ دام بخیر
''سر کو مانگا ہے''، جب آیا یہی ظالم نے کہا	نامہ بر واں سے نہ لایا کبھو پیغام بخیر
خط مرا لے کے وہ قاصد سے لگا یوں کہنے	''چاہیے گالی کے سوا تو اگر انعام بخیر''
گھر میں رہتے ہیں تو ہم کے ہم آزاد منش	ہم سے گر پوچھے کوئی صحن و در و بام بخیر
رشک آتا ہے مجھے اس کے نصیبوں پہ یہاں	جس کو پہنچائے وطن گردشِ ایام بخیر
اس پہ ہر صبح نشاں پائے میں گل تکیے کے	کبھی دیکھا نہ ترا عارضِ گلفام بخیر
شر کی امید نہ تھی مصحفی جس سے اصلا
بھول کر بھی نہ لیا اس نے مرا نام بخیر

141

ساتھ پھرتا ہے لیے اپنے وہ قاتل دو چار	اس کو کیا غم[2] ہوئے آزردہ اگر دل دو چار
شہر بس جاتے، اگر ہم سے تباہی زدوں کے	تختے کشتی کے پہنچتے لبِ ساحل دو چار
جیسی صورت ہے تری عالمِ ایجاد کے بیچ	شاید اس حسن کے ہوں شکل و شمائل دو چار
تیرے بیمار کو نسخہ کوئی لکھتا ہے مسیح	فلسفی تا نہ ہوں اس نسخے میں شامل دو چار

1۔ قزوین = ایران کے ایک شہر کا نام ہے	2۔ ج : اگر آزردہ ہوئے

رنگِ عاشق نہ ہو کیوں رشک سے اصفر[1] جب ہوں　　پھول گیندے کی بھی واں زیبِ حمائل دو چار
وادیِ قیس سے کیا جنسِ جنوں لاوے گی　　ساتھ لیلیٰ کے جو خالی بھی ہیں محمل دو چار
سبز پوشی کا تری دیکھ کے عالم شبِ قتل　　سو رہے پی کے وہیں جامِ ہلاہل دو چار
ناقۂ لیلیٰ کا کرے وجد نہ کیونکر جب ہوں　　ساتھ مجنوں کے چلے بندِ سلاسل دو چار
مصحفی ایک غزل اور بھی پڑھ مجلس میں
تیرے سننے کے لیے بیٹھے ہیں قابل دو چار

142

خنجرِ ناز سے اک سمت ہیں بسمل دو چار　　اک طرف کھینچتے ہیں حسرتِ قاتل دو چار
جس میں لیلیٰ تھی وہ محمل نہ نظر آیا حیف　　یوں تو سو بار گئے نجد سے محمل دو چار
چھوڑ دے دام سے صیاد اسیروں کے تئیں　　ان کو رکھ لے تو جو ہوں قید کے قابل دو چار
کون سے روز کہ تعویذوں کے ضامن ہو کر　　اس کو ہیکل میں پروئے نہ گئے دل دو چار
کیا ستم ہے کہ یہ جاتے ہیں طرف مقتل کی　　روز اس کو سے گرفتارِ سلاسل دو چار
تیرے کشتے کے نکل آنے کا خطرہ ہی رہا　　اس کے مرقد پہ نہ جب تک کہ رکھیں سل دو چار
ان سے احوالِ غریقاں کی خبر میں نے سنی　　ڈوبتے ترتے جو پہنچے لبِ ساحل دو چار
بیچ میں اس کے دل آیا ہے یہ اپنا جس کے　　پیچ بگڑی کے گلے میں ہیں حمائل دو چار
مصحفی عشق کے صحرا کا جو انجام نہیں
روز در پیش رہا کرتی ہیں منزل دو چار

ڑ

143

اس نے شعلہ سا دیا ہے جو تری جان میں چھوڑ　　تو بھی اے آہ نہ طاقت دلِ سوزاں میں چھوڑ

1۔ اصفر = زرد

جب وہ یوسف کو گئی خانۂ زنداں میں چھوڑ دیے سو چاک زلیخا نے گریباں میں چھوڑ
کچھ نہایت[1] نہیں جس کا ترے دیوانے کو لا کے وحشت نے دیا طرفہ بیاباں میں چھوڑ
سخت ناشاد قفس میں ہے گرفتارِ قفس کاش صیّاد تو دے اِس کو گلستاں میں چھوڑ
جس تجلّی سے ہوئے طور کے پتھر سب ریت اس کا اک ذرّہ دیا ہے دلِ انساں میں چھوڑ
طعمۂ شیرِ غم اب آپ میں ہو جاؤں گا میرے نالوں نے دیا مجھ کو نیستاں میں چھوڑ
میرے ہی سر کی قسم ہے تجھے اے دستِ جنوں اب کے اک تار بھی ثابت نہ گریباں میں چھوڑ
مجھ کو یہ بات پسند آئی جو ناقے سے اُتر ناقہ لیلیٰ نے دیا نجد کے میداں میں چھوڑ
مصحفی کی نہ خبر ہم کو ملی پھر یا رب ق ہم گئے تھے اُسے احوالِ پریشاں میں چھوڑ
چاہِ زنداں میں کہیں قید ہوا وہ کم بخت
یا دیا بخت نے غربت کے بیاباں میں چھوڑ

144

اے صبا، اب کے تو اک گل نہ گلستاں میں چھوڑ سب کو چُن چُن قفسِ مرغِ خوش الحاں میں چھوڑ
وائے رسوائی کہ جو مرغ چمن آوے ہے ہاتھ کر کے بسمل اُسے یاں دیتے ہیں میداں میں چھوڑ
آہ کس منھ سے میں اب نام محبت پھر لوں مرضِ عشق تو طاقت نہ گیا جاں میں چھوڑ
طفل و کنجشک کی صحبت ہے مری اور اس کی لیوے[2] اک دم میں پکڑ، دیوے پھر اک آن میں چھوڑ
ان اسیروں کے بھی مرجانے پہ رحم آوے ہے جو گئے اسبابِ سفر خانۂ زنداں میں چھوڑ
خوگرِ باغ و چمن ہے یہ مرا طائرِ دل تو نہ صیاد اسے لے جا کے بیاباں میں چھوڑ
تب مزہ ہو جو کبابِ جگر سوختہ کو دے وہ میخوارِ ملامت کے نمکداں میں چھوڑ
اشک امنڈے ہوئے ان سے جو چلے آتے ہیں کس نے دریا یہ دیا دیدۂ گریاں میں چھوڑ
مصحفی خالِ لب اس کے کا یہ عالم دیکھا
مُور کو جوں کوئی دیوے شکرستاں میں چھوڑ

1۔ نہایت = حد، کنارہ 2۔ ج :لا دے

145

مطرب پسر نے دی ہے جو مجھ پر زبان چھوڑ
دیتا ہے گالیاں مجھے ہر لحظہ تان چھوڑ

آئے تھے اس جہان میں جو وہ جہان چھوڑ
جز سنگِ قبر کچھ نہ گئے یاں نشان چھوڑ

ناقہ ہوا جو نجد میں تنہا تو عشق نے
لیلیٰ کے گردِ ناقہ دیے پاسبان چھوڑ

ثابت تو رہ جفا پہ، میں قائم وفا پہ ہوں
میں اپنی بان چھوڑوں، نہ تو اپنی آن چھوڑ

اس سادگی پہ اور بھی ہم ذبح ہو گئے
دس دن دیے جو اس نے محرم میں پان چھوڑ

اخفائے گریہ کا مرے باراں سبب ہوا
دیتے ہیں برشگال میں جوں ناودان[1] چھوڑ

بارے ہو کچھ تو بلبلِ پر بستہ کی خوشی
دیوے روش پہ بھی جو اسے باغبان چھوڑ

کشتہ جو تیری تیغ کا ہوں، میں سگِ عذاب
جاتا ہے سونگھ کر کے مرے استخوان چھوڑ

واماندہ مثلِ نقشِ قدم ہوں میں وہ غریب
پیچھے سبھوں سے جس کو گیا کاروان چھوڑ

کہہ شستہ رفتہ اور بھی اک مصحفی غزل
اس بحر میں تو لیک نہ اپنی زبان چھوڑ

146

اوپر سے سیل فتنہ نہ اے آسمان چھوڑ
ہم خاکیوں کا کچھ تو زمیں پر نشان چھوڑ

مرجا، اسی کے در پہ وہیں اپنی جان چھوڑ
جوں نقشِ پا و لے نہ تو اپنا مکان چھوڑ

مانند گردباد ہے سرگشتہ میری خاک
جس دن سے میں گیا ہوں ترا آستان چھوڑ

صیاد کچھ خبر ہے تجھے اس ضعیف کی
جو مشتِ پر قفس میں گیا استخوان چھوڑ

کاوش سے رمح[2] آہ کی پہنچا جو اس کو رنج
آخر دیا ہی قطبِ فلک نے مکان چھوڑ

کم کم کہوں ہوں قصۂ غم جیسے قصہ خواں
دیتے ہیں بہرِ روز دگر داستان چھوڑ

شب ہو چکی ہے اور ہیں ستارے گریز پر
اے نالہ اب تو ان کی طرف کوئی بان چھوڑ

پہنچے ہے جب کہ نجد میں لیلیٰ کہے ہے قیس
اے کاش ناقہ جاوے یہیں ساربان چھوڑ

1۔ ناوداں = پرنالہ 2۔ رمح = برچھی

آئے جو پھر چمن میں تو بھولے سے رہ گئے — جانا نہ یہ گئے تھے کدھر آشیاں چھوڑ

دل بستگی کا فائدہ دنیا سے مصحفی
جب یہ کہن[1] سرا گئے پیر و جوان چھوڑ

ز

147

جس نگہ سے کہ ہوئی تھی نہ حیا[2] محرمِ راز — سرمہ تیرہ دروں کیونکہ ہوا محرمِ راز
ہے تری تیغ کا کشتہ انھی معدوموں میں — استخوانوں سے نہیں جن کے ہُما محرمِ راز
مارتا دم وہ نہیں خون جگر کھاتا ہے — ہے بلاکش کی ترے جب[3] سے بلا محرمِ راز
جس کے کوچے میں نہ تھا پیک تصور کا گزر — کیونکہ اس گل کی ہوئی بادِ صبا محرمِ راز
ہائے وہ خونِ شہیداں میں بھرے پاشنہ تک — جس کفِ پا کی کبھی تھی نہ حنا محرمِ راز
لب پہ لاتے ہی نہیں حرف دعا کو ہم لوگ — تا اجابت کا نہ دستِ دعا محرمِ راز

وے بھی کیا دن تھے کہ جب خلوت یک رنگی میں
مصحفی میرے سوا کوئی نہ تھا محرم رااز

س

148

اہلِ معنی کب پہنتے ہیں زنانوں کا لباس — چاہیئے ہووے توانا ناتوانوں کا لباس
گردِ صحرا کے بھی وہ ممنوں نہیں ہوتے کبھی — جامۂ عریاں تنی ہے جن دوانوں کا لباس
سرخ و سبز اور اودے[4] پیلے سے انھیں کیا کام ہے — چاہیے جوں موئے سر ابیض پُرانوں کا لباس

1۔ ج کہیں سے آگئے (صریحاً غلط) 2۔ ت صبا 3۔ ج جی سے 4۔ ج نیلے پیلے

اورسا[1] یا صحن ہو یا تھان محمودی کوئی　لے کے ململ کیا کریں وہ ہے جوانوں کا لباس
پہنے وہ چنکی کا پاجامہ جو چنکی دل میں لے　کیونکہ یہ مشروع ہے اکثر کندہ رانوں کا لباس
باندھنو[2] کی پگڑی پر کیا کیا بندھیں گے باندھنو[3]　گر اسی رنگت کا ہے ہم بے زبانوں کا لباس
گوٹا اور پیلام سے کیا کام شاعر کے تئیں　یہ چمک والوں کا ہے اور چار شانوں کا لباس
مصحفی پیری کے باعث ہوں میں مشتِ استخواں
کاش ہوتا عیب پوش ان استخوانوں کا لباس

149

حیا سے بیٹھے وہ شب سر جھکا کے میرے پاس　خجل کمال ہوئے جی میں آ کے میرے پاس
اثر یہ نالۂ شب گیر نے کیا کہ اسے　لے آیا تھوڑی سی شب سے چھکا کے میرے پاس
اُٹھائی شب کو جو خفت کسی کی مجلس میں　تو صبح[4] آئے وہ تیوری چڑھا کے میرے پاس
جو دوستی کے مزے سے ذرا[5] بھی ہو آگاہ　کسی کے پاس نہ جاوے وہ آ کے میرے پاس
مجھے جہاں سے اُٹھا یہ قبول ہے لیکن　ق　فلک اُٹھا نہ تو اس کو بٹھا کے میرے پاس
یہ اُس کا مجھ پہ ہو احساں کمال اس کے تئیں　جو تیرہ شب میں لے آوے چھپا کے میرے پاس
میں ان کی چشم کا دنبالہ دیکھ مر ہی گیا　کہ شب وہ آئے تھے کاجل لگا کے میرے پاس
مزہ تو تب ہو کہ جا کر مرے موکل جب　پلنگ اس کا لے آویں اُٹھا کے میرے پاس
بڑا کرم یہ کیا جو قفس تلک کئی پھول　صبا چمن سے لے آئی اُڑا کے میرے پاس
یہ جی میں ہے کہ کروں خوب اس سے رنگ رلیاں　کہ سو رہا ہے وہ معجون[6] کھا کے میرے پاس
تو سادگی پہ نظر کر کہ مصحفی شبِ دوش
مرا ہی دل وہ لے آئے چُرا کے میرے پاس

1۔ اورسا، صحن، محمودی = نفیس ململ کپڑے کی قسمیں ہیں　2۔ باندھنو = بند باندھ کر چنری کی طرح رنگی گئی
3۔ باندھنو = الزام　4۔ ج : تو آئے صبح　5۔ ج : بھی ہو ذرا آگاہ　6۔ معجون = مراد افیون

150

داغوں سے میں ہوں ہوش رُبائے پرِ طاؤس
ہے بر میں مرے تنگ قبائے پرِ طاؤس

زخمی تری شمشیرِ نزاکت کے چمن میں
گُل ہاتھ سے باندھیں ہیں بجائے پرِ طاؤس

طالب ہے زبس حُسن کا میرا دلِ بیتاب
سیماب سا دوڑے ہے قفائے پرِ طاؤس

میں داغ بہ دل جاؤں ہوں دنیا سے، چڑھانا[1]
یارو، مری تربت پہ ردائے پرِ طاؤس

لیتے ہیں خواصی کے لیے مورچھل ان کا
شاہوں کے بھی سر میں ہے ہوائے پرِ طاؤس

داغوں پہ مرے گرد فشاں ہے تری رفتار
یوں خاک میں ملتی ہے صفائے پرِ طاؤس

دیکھے جو وہ عالم ترے اس بندِ حنا کا
خود ہو کفِ افسوس حنائے پرِ طاؤس

افسوس کہ گلباز گُل اس چشم پہ ماریں
جو ہو نہ نزاکت سے سزائے پرِ طاؤس

سو داغ نظر آتے ہیں اب مصحفی اس میں
جس دل کو لگی تھی نہ ہوائے پرِ طاؤس

151

دیکھے وہ جسے ہووے ہوائے پرِ طاؤس
برسات کے موسم میں صفائے پرِ طاؤس

نیرنگیِ الفت سے مرا رنگِ شکستہ
اُڑتا ہوا پھرتا ہے قفائے پرِ طاؤس

بے چارے کے پَر کس نے بکھیرے ہیں چمن میں
جو پھول ہیں سب چہرہ کشائے پرِ طاؤس

حیرانِ کبودی ہوں میں جا لپٹے ہے کیونکر
رہتے ترے ہونٹوں کے قفائے پرِ طاؤس

کون آئے گا گلشن میں جو جاروب کشاں ہے
ہر نخلِ چمن آج بجائے پرِ طاؤس

دیکھا ہے مرا داغِ جگر جب سے علم ہے
از بہرِ شفا دستِ دعائے پرِ طاؤس

اے مصحفی کیا اس کا عجب داغ ہے وہ بھی
ہووے دلِ عاشق جو فدائے پرِ طاؤس

1۔ ج : اُڑھانا

ش

152

میں خس ہوں اور مزاجِ دلبر آتش جلا دے پھر نہ مجھ کو کیونکر آتش
نہیں یہ دوں مری آہِ سحر نے بیاباں کو لگا دی یکسر آتش
دلِ شوریدہ میری کف پہ یوں ہے رکھیں جوں ہاتھ پر بازی گر آتش
جو مجھ سا دوزخی جنت میں جاوے مری خاطر ہو آبِ کوثر آتش
گزر ہے کس بلا کا دل میں یارب اسی گھر سے لگی ہے اکثر آتش
نہ بھولو اس کی تم افسردگی پر مرا دل ہے بسانِ اخگر آتش
کلیجا جل گیا[1] تو نے یہ ساقی بھر تھی کیا میانِ ساغر آتش
جلانا دل کا کیا دشوار اس کو کرے ہے سنگ کو خاکستر آتش
دھواں دل کا نہ کیوں ہونٹوں سے نکلے چلم کی طرح ہے یاں سر پر آتش
خجل ہو تیرے روے لالہ گوں سے ہوئی پنہاں میانِ مجمر[2] آتش

فراق یار میں اے مصحفی ہے
مرا بالیں شرر اور بستر آتش

153

ہے لختِ دل آنکھوں میں وہ پرکالۂ آتش پلکیں ہوئیں جس سے چمنِ لالۂ آتش
وہ[3] ماہ پھرانے جو لگا رات بنہٹی قربان ہوا اس پہ وہیں ہالۂ آتش
اے نالہ، تری گرم روی کام نہ آئی یک شب بھی ہوا تجھ سے نہ دنبالۂ آتش

1۔ ج : شب تو نے ساقی 2۔ مجمر = انگیٹھی 3 ۔ ج : لے کر وہ پھرانے جو لگا......

تا پھیرے ترے سوختہ کی قبر پہ چونا شعلہ ہے کفِ شمع میں گل مالۂ آتش
دیکھی دمِ رقص اس کے جو دامن کی کناری پابوس [1] ہوا شعلہ جوالۂ آتش
حیران رہے دیکھ ترا رنگِ طلائی تھے وہ جو پرستندۂ گوسالۂ آتش
میں سوختنی قہر کا مورد بھی اگر ہوں تو برسیں زراعت پہ مری ژالہ آتش
دیکھے مری آنکھوں میں مرے اشک شفق رنگ وہ جس نے نہ دیکھے ہوں کہیں ژالہ آتش

ہے مصحفی نالوں سے مرے بسکہ کہ وہ نالاں
سنتے ہیں مقیمانِ فلک نالۂ آتش

154

کیونکر نہ کہوں رنگِ رخِ یار کو آتش دی جس نے لگا لالۂ گلزار کو آتش
اک برگِ گل آیا تھا چمن سے سو گیا بھاگ دے کر قفسِ مرغِ گرفتار کو آتش
باقی نہ رکھا کچھ بھی نشاں عشق نے میرا جوں صاف جلا دیوے خس و خار کو آتش
جب کفر پرستی بھی مجھے راس نہ آئی جوں شمع لگ اُٹھی مرے زنّار کو آتش
یہ سرخی ہے کچھ اس میں کہ حسرت کی نظر سے دیکھے ہے ترے لالۂ رخسار کو آتش
کیا حسن سے یوسف کے اُٹھا پردہ [2]، لگی ہے جو چار طرف مصر کے بازار کو آتش
پابوسی میں لب اپنے جلا بیٹھا وہ غافل سمجھا جو نہ رنگِ کفک یار کو آتش
گزرا جو ادھر ہو کے کبھی دوزخی مجھ سا جنت کے لگ اُٹھی درو دیوار کو آتش
آیا جو جنوں شعبدہ بازی پہ تو اس نے کر ٹکڑے لگا دی مری دستار [3] کو آتش
خُم بستہ، قدح لب بہ زمیں، شیشہ نگوں تھا کیدھر سے لگی خانۂ خمار کو آتش
وہ گرم نوا ہوں میں کہ جل جانے کے ڈر سے مس کر نہیں سکتی مری منقار کو آتش

اے مصحفی ہے طورِ تجلّی سے یہ روشن
ایک پل میں جلا دیتی ہے کہسار کو آتش

1۔ ج : مایوس ہوا 2۔ ج راہ 3۔ ج :مری تلوار

155

محمل نشین یار کی جو ہے زباں خموش
جاتا ہے آج ناقہ لیے ساربان خموش

زندانیانِ عشق کو کیا موت آگئی
کیوں رہ گئے الٰہی یہ اہلِ فغاں خموش

عبرت[1] ہو ہم صفیروں کو کیونکر نہ باغ میں
بلبل موئی پڑی ہے تہِ آشیاں خموش

فریاد نے کی طرح کریں گے بروزِ حشر
یوں ہی رہیں گے کیا یہ مرے استخواں خموش

مجھ سا بھی اہلِ ہوش نہیں روزگار میں
پاتے ہیں دوست مجھ کو گہ امتحاں خموش

بس بس صفیر زیرِ لبی کب تلک دلا
قاتل، نہ بے دماغ ہوا ے نیم جاں خموش

پہنچا جو رات در تلک اس رشک مہ کے میں
دانستہ مجھ کو دیکھ ہوا پاسباں خموش

سحرِ حلال میں مرے جاے سخن نہیں
ہاں ہیں مسیح کے لبِ معجز بیاں خموش

فریاد قیس[2] پر تری فریاد سے ہے کوفت
لیلیٰ کہے ہے "اے جرسِ کارواں خموش"

اپنی تو ہے یہ موت کہ اس ارتباط پر
چاہیں ہیں زندگی میں مجھے دوستاں خموش

شاید کہ اس گلی میں موا رات مصحفی
جو صبح تک ہوئے نہ لبِ نوحہ خواں خموش

ص

156

معشوق لوگ رکھتے ہیں گل پھول کا خواص
بالوں میں ان کے ہووے ہے مکنول کا خواص

فریاد کرنے لگتی ہے کھولا جہاں اُسے
دیکھا عجب میں در کی ترے چول کا خواص

چشمِ سیہ کے سرمۂ دنبالہ دار میں
دیکھا تو کچھ پٹے کے سے ہے ہول[3] کا خواص

جاؤں کدھر کہ خوبیِ طالع سے ان دنوں
پاتا ہوں مشتری سے دساسول[4] کا خواص

1۔ ج غیرت 2۔ ج قیس ہے مری 3۔ ہول = ضرب 4۔ دساسول = رجال الغیب، جو نظر نہ آئے

مانندِ شمع ہم کو سراپا گھلا دیا		دیکھا شبِ فراق ترے طول کا خواص
ڈوبا ہوا عرق میں جو نکلا تھا گھر سے یار		بالوں میں تھا بریشم مغسول[1] کا خواص
یہ درد مار ڈالے ہے اک دم میں مصحفی
دردِ فراق یار میں ہے سول[2] کا خواص

157

اس وضع سے ہرگز نہ کرے حور و پری رقص		جوں باغ میں کرتی ہے نسیمِ سحری رقص
رفتار کو اس کی جو کہوں میں تری رفتار		خوش ہو کے ابھی کرنے لگے کبکِ دری رقص
سوندھے کی سی بو، لائی صبا رات چمن سے		کرتا تھا کوئی کیا بہ لباسِ اگری رقص
ہاں سچ ہے یہ دولت ہی کہاں ملتی تھی اس کو		قاصد نہ کرے کیونکہ دمِ نامہ بری رقص
دامن کو کہروے[3] کے لیے تم نہ چھڑاؤ		ہوتا ہے میاں دشمنِ نازک کمری رقص
اس فندق پا کو میں اگر خواب میں دیکھوں		مژگاں پہ کرے قطرۂ خونِ جگری رقص
ٹک سوچ کہ ستھراؤ ہوئی جاتی ہے مجلس		قاتل نہیں زیبندہ بہ ایں کج نظری رقص
اے مصحفی وہ نخل ہوں میں باغِ جہاں میں
ہر شاخ کرے جس کی پے بے ثمری رقص

ض

158

اس ماہ رو نے جب نہ سنی مصحفی کی عرض		پھر ہووے کس طرح سے پذیرا کسی کی عرض
کہتا ہے کوئی شخص ز خود رفتہ حالِ دل		حیرت سوا پھر اور ہے کیا آرسی کی عرض

1۔مغسول = دُھلا ہوا، غسل دیا ہوا   2۔سول = بہت زیادہ سوال کرنے والا (سائل)   3۔کہروا = رقص ایک قسم

اے بادشاہِ حسن جو گا ہے قبول ہو — جز یک نگاہ صاف نہیں آرسی کی عرض
حاجت روا ہے تو ہی دو عالم کا اے[1] کریم — ہے دمبدم تجھی سے فقیر و غنی کی عرض
ہر چند شمع بزم میں یکسر زباں ہوئی — تو بھی سنی کسی نے نہ اُس دل جلی کی عرض
گر عاشقی کرو ہو تو اس طرح جل بجھو — یوں ہے یہ سوے اہلِ نظارہ ستی کی عرض
تو بھی سوال لکھ کے دے اک روز مصحفی
پہنچے ہے اس کے ہاتھ میں آخر سبھی کی عرض

159

سنتا نہیں ہے وہ شہ خوباں کسی کی عرض — واں گر چہ روز لگتی ہے حور و پری کی عرض
وہ غنچہ میں نہیں کروں وقت صبح دم — باد صبا کے سامنے دل بستگی کی عرض
پردہ اُٹھادے اپنے خط سبز سے کہ گل — آیا ہے دیکھنے تری لشکر کشی کی عرض
مجلس میں بار یاب ہیں اس گل کی مسخرے — کرتا ہے کون اس سے بھلے آدمی کی عرض
یہ جزو و کل پہ لاویں گے کیا جانے کیا بلا! — کانوں میں اس کے کرتے ہیں جو جزرسی کی عرض
بد بھی کہیں نہ اس کو نہ تعریف اگر کریں
خدمت میں دوستوں کی ہے یہ مصحفی کی عرض

160

اے شوخ نہ کر میرے دلِ زار سے اعراض[2] — کرتا ہے مسیحا کوئی بیمار سے اعراض
تو قتل کو آوے تو مری جان نہ ڈرنا — کرنے کے نہیں ہم تری تلوار سے اعراض
گزری بھی[3] پھر اک دم نہ سیہ بخت کی اس بن — ہر چند کیا زلف نے رخسار سے اعراض
پامال بھی ہونا ہے قبول اپنے تئیں تو — ہم کر نہیں سکتے تری رفتار سے اعراض
مانا میں کہ میں خار ہوں تو گل ہے چمن کا — لازم نہیں گل کو کہ کرے خار سے اعراض
رشتے نے محبت کی جگہ دل میں جو پائی — عاشق نے کیا سبحہ و زنّار سے اعراض

1۔ ج : یا کریم 2۔ اعراض = روگردانی، منہ پھیر لینا 3۔ج : تھی

ہو جو کہ فروشندہ متاعِ دل و جاں کا کیونکر وہ کرے اپنے خریدار سے اعراض
گرمی ہے ترے حُسن میں کچھ ایسی کہ اب تو کرتی ہے نظر رخنۂ دیوار سے اعراض
میں مصحفی منصور کی ہمت کا ہوں عاشق
سر اپنا دیا اور نہ کیا دار سے اعراض

ط

161

ہرچند کہ ہو مریض محتاط کیا کر سکے با فساد اخلاط
ادریس کی سالہا رہی ہے کوچے میں ترے دکان خیاط
رخ پر ترے دیکھ سبزۂ خط حیران ہیں سب جہاں کے خطاط
جتنی مرے دل میں ہے تیری چاہ کم ہوگی نہ اس سے نیم قیراط[1]
خوں سے ترے بسملوں کے دیکھی کوچے میں ترے بچھی سقر لاط[2]
قد اس کا نہیں اگرچہ کوتہ ہے جسم کی لاغری بہ افراط
اے یارو، نہ مصحفی کو کوئی
سمجھو نہ کم از رشید وطواط[3]

162

دیکھ کے میں یار کے روئے دل آرا کا خط طاق پہ تہ کر رکھا طرز شفیعا[4] کا خط
آوے تھی ہر سطر سے اس کی مجھے بوئے خوں تھا جو لکھا یار کے دستِ حنّا[5] کا خط
مردمکِ دیدہ ہے نقطۂ ثانی کی شکل کیوں نہ ہو واں منتہی دل کے سویدا کا خط

1۔ قیراط = ایک وزن 2۔ سقر لاط/سقرلات = بالوں کا کپڑا جس کو بانات کہتے ہیں
3۔ رشید وطواط: دونوں فارسی زبان کے شاعر ہیں۔ 4 شفیعا = ایک خط 5۔ دستِ حنّا = مہندی لگا ہاتھ

نسبت اطراف میں آوے ہے کب انفکاک　　سطح سے کیونکر جدا ہو لبِ دریا کا خط
نامے کے پرزے کیے یار نے کس جرم پر　　ہم نے کب اس کو لکھا عرضِ تمنا کا خط
اپنی دکھا کر ادا قتل ہمیں کر گیا　　کیا دمِ شمشیر تھا اس کففِ پا کا خط
پڑھ کے لفافہ گیا اس کا وہ مضموں سمجھ　　اس نے نہ کھولا کبھی عاشقِ شیدا کا خط
مے سے رہائی ہے کب جوں فلکِ متدیر[1]　　طوقِ گلو یاں تو ہے گردنِ مینا کا خط

دام میں اس کے اسیر ہم نہ ہوئے مصحفی
گرچہ فریبندہ تھا سبزۂ صحرا کا خط

ظ

163

ڈھونڈتا ہے بے خبر دن رات کیا جس تس میں حظ
گو مے و ساقی ہوں حاضر، اس میں حظ نے اس میں حظ

بسکہ خوباں میں رہیں دو دو پہر گل بازیاں
شب اُٹھایا ہم نے جا کر یار کی مجلس میں حظ

باغ سے کیوں ہم کو لائے شہر میں احباب ہائے
ہم کو ملتا تھا حجابِ دیدۂ نرگس میں حظ

ناچ کی مجلس میں خوباں تھے سبھی سرمستِ ناز
کیا کہوں پایا نگاہِ شوق نے کس کس میں حظ

کیوں خریداری کرے شہد لب خوباں کی وہ
مصحفی ملتا ہو جس بیمارِ غم کو بِس[2] میں حظ

1۔ متدیر = گول، مدوّر　　2۔ بِس = زہر

ع

164

یاں نت شب وصال رہی آرزوئے شمع دیکھا نہ خواب میں بھی کبھی ہم نے روئے شمع
یا رب نصیبِ گردن دشمن نہ کر کبھو جو داغ سینہ سوز ہے طوق گلوئے شمع
عاشق سے تیرے مار سیہ ہم بغل رہا تو بھی شب فراق نہ کی جستجوئے شمع
گر شمع ہے پری بہ رخِ شعلہ ور تو پھر یہ از دھوئیں کی لٹ میں کہاں گیسوئے شمع
سوز و گداز عشق سے خو کر دالا کہ ہے جلنے سے انجمن میں سدا آبروئے شمع
کھاتی ہے تاب ضربتِ دست اجل سے روح ہوتا ہے جیسے باد کا جھونکا عدوئے شمع
جب تک کہ انجمن میں تو بیٹھا ہو شعلہ رو پروانہ جا سکے تب کوئی روبروئے شمع

ساکت ہوا نہ میں شب ہجراں میں مصحفی
تا صبح دم زباں پہ رہی گفتگوئے شمع

165

ترے اس داغ دل پہ آفریں شمع جلے آتش میں تجھ سا نازنیں شمع
جو تجھ پر مر گئے وہ داغ دل سے گئے ساتھ اپنے لے زیر زمیں شمع
جلے پروانے آ شعلے پہ لاکھوں نہ ذرہ بھی ہوئی چیں بر جبیں شمع
مرا احوال سن روئی بہت سا رکھ اپنی چشم تر پر آستیں شمع
نہ رکھ اے شعلہ تو یہ تو روا یار کہ پروانے پہ کھینچے تیغ کیں شمع
نہ راس آئی ہوا جب اس کو یاں کی ہوئی فانوس میں عزلت گزیں شمع
غرور حسن کب یہ چاہتا ہے کہ پروانے سے ہووے ہم نشیں شمع
لگی جب کھینچنے دیکھ اس کی صورت بھری مجلس میں آہ آتشیں شمع

سحر پروانہ گفت ایں مرا سوخت　　ہمیں شمع، ہمیں شمع، ہمیں شمع

جلی آخر بہ داغ نا امیدی
اگرچہ مصحفی تھی دوربیں شمع

166

عالم ہے ترا اے بت بے پیر مرقع　　کیونکر نہ کہوں میں اسے تصویر مرقع
نقشہ جو میں کھینچوں ہوں ترے خطِ سیہ کا　　بن جاوے ہے کاغذ گہ تحریر مرقع
قبضے کی سجاوٹ سے پری چہرہ کشا ہے　　ہے آج تو قاتل تری [1] شمشیر مرقع
دکھلا کے تماشا ورقِ حسن کا آخر　　آنکھوں سے چھپا لیوے ہے تقدیر مرقع
تصویر جسے لیلی و شیریں کی رہے دیکھ　　صانع نے بنایا یہ رُخ ہیر مرقع
شیریں کی نظر جاوے اگر اس کی صفا پر　　قصرِ دلِ خسرو کی ہے تعمیر مرقع
دیکھے جو کوئی دل کا مرے عالمِ نیرنگ　　ہے صورتِ صندوقِ تصاویر مرقع
تصویر بتاں دیکھنی اچھی نہیں زاہد　　کر جاے ترے دل میں نہ تاثیر مرقع
کچھ شکلِ صنم خانہ نہیں شاخ کماں ہے　　تصویر ہے گر تیری تو زہ گیر مرقع
تم سا ہی ہو جب کوئی جڑت کاٹنے [2] والا　　کیونکر نہ بنے آپ کا پھر تیر مرقع
حسنِ دلِ پر داغ کا عالم جو دکھاؤں　　تہ اپنا کرے یہ فلک پیر مرقع
زخموں سے لہو لے کے پونچھا ہے جو اس پر　　زندانِ الفت کی ہے زنجیر مرقع
گر ہاتھ میں لے اپنے قلم فکرِ مدبّر　　ہوسکتا ہے تیار بہ تدبیر مرقع

اے مصحفی ہے لب پہ مرے مہرِ خموشی
تھا ورنہ مرا نالۂ شب گیر مرقع

1۔ ج تصویر　　2۔ جڑت کاٹنے والا = مرصع ساز

غ

167

کب ہراک سفلے سے اپنا کرتے ہیں خالی دماغ
مصحفی جو صاحبِ تقدیر ہیں عالی دماغ

سچ ہے کب رنگِ شفق کو لاوے ہے خاطر میں وہ
عارضِ گل کی رکھے ہے عرش پر لالی دماغ

بھول جاوے صاحبِ اقبال اپنی سرکشی
اس کو دکھلاوے اگر میری بد اقبالی دماغ

نو بہار آئی ہے میں اس کا بیاں کس سے کروں
آج جو رکھتی ہے ہراک پھول کی ڈالی دماغ

اس ہوا میں ہووے جب زاہد کرے کی طلب
کیوں [illegible]ستوں کا کرے تر یہ گھ[illegible] کالی دماغ

نطق سے انساں ہے انساں ورنہ اے بربستہ لب
رکھتی ہے تجھ سے زیادہ صورتِ قالی[1] دماغ

یہ غنیمت ہے کوئی دم جاؤں میں صحرا کی سمت
خوش کرے میرا ہوائے سبزۂ شالی دماغ

مصحفی کو شعر کا غرّا ہے کتنا دیکھیو
کس قدر رکھتا ہے اے یارو یہ ولوالی[2] دماغ

ف

168

دامنِ دل کھینچے ہے وحشت بیاباں کی طرف
کیوں کے میں دیوانہ جاؤں پھر گلستاں کی طرف

اپنے بس جاتا نہیں میں ہوں گرفتارِ بلا
لے چلے ہے کھینچ کر زنجیر زنداں کی طرف

ایسے قاتل کا میں کیونکر کشتۂ احساں نہ ہوں
جب لگائی تیغ تب دیکھا نمکداں کی طرف

1۔ صورتِ قالی = قالین پر بنی شکل 2۔ ولوالی = عالی

جس قدر چاہے تو اے بے صرفہ[1] گو بک لے، ترا — کوچ ہوگا عاقبت شہر خموشاں کی طرف
بسکہ میدان کماں سے پائی ہے تیرے شکست — جاتے شرماتا ہے اب رستم بھی میداں کی طرف
اپنے میں دستِ تاسف کا ہوں دیوانہ کہ یہ — جب اُٹھا زانو سے تب دوڑا گریباں کی طرف
پڑھ لفافہ خط کا میرے یار حیراں رہ گیا — دیکھ کر قاصد کا منھ دیکھا جو عنواں کی طرف
ایسا نظروں سے دو عالم کے گرا میں یا نصیب — یاد بھی آتی نہیں اس خانہ ویراں کی طرف
پانی پانی ہو کے بہہ جاوے گدازِ رشک سے — شمع گر دیکھے ہماری چشمِ گریاں کی طرف
کس کی خاطر کو مقدم رکھوں میں حیران ہوں — گبر کی جانب ہوں یارب یا مسلماں کی طرف
چشمِ لیلیٰ کا جو عالم ہے اُنھوں کی چشم میں — دیکھے ہے دو دو پہر مجنوں غزالاں کی طرف
طوق ہے قمری کی گردن میں تو عشقِ سرو کا — کیوں کھنچی جاتی ہے اس سروِ خراماں کی طرف
چشم کے پردوں میں اب نامِ طروات ہی نہیں — کھنچ گیا خونِ جگر سب اپنا مژگاں کی طرف

مصحفی نظمِ غزل کے گرچہ عالم ہیں کئی
دل مرا مائل ہے لیکن پاس و حرماں کی طرف

169

نہ ہو خلق کو کیوں تمنائے یوسف — فزوں کر دیا ہم نے سودائے یوسف
صبا برگِ گل سے بچانا مبادا — خراشیدہ ہووے کفِ پائے یوسف
حیا چاہتی ہے یہ کب گوش مالک — ہو ممنون لعلِ شکر[2] خائے یوسف
زلیخا نے جب اس کو زنداں میں بھیجا — وہ کہتی تھی میں کیوں نہیں جائے یوسف
بہ بازارِ مصر اس کو جس وقت لائے — نہ تھا گرچہ کوئی شناسائے یوسف
زلیخا نے دیکھی جو وہ جنسِ اعلیٰ — لگی جاں لگانے بہ سودائے یوسف
پری زاد یاں انگلیاں کاٹتے ہیں — نہیں ایسا آساں تماشائے یوسف
خبر مرگ کی سن کے یعقوب بولا — میں دیکھو گا اب کس کو اے وائے یوسف

1۔ بے صرفہ گو = فضول بکنے والا 2۔ شکر خا = شکر خور

مری چشم میں مصحفی حُسن معنی
دکھاتا ہے حسن سراپائے یوسف

ق

170

کیوں پھینک نہ دوں توڑ کے نوکِ قلمِ شوق لکھنے سے بھی آخر نہیں ہوتی رقمِ شوق
زاہد مرے ساتھ آتو کہ میں کعبۂ جاں میں دکھلاؤں تجھے جلوۂ بیت الصنمِ شوق
کیا عرشِ معلّٰی کے اُسے طوف کا دھن ہے نالے نے جو کاندھے پہ دھرا ہے علمِ شوق
تو کاہلی اپنی سے ہے وامانده وگرنہ ہے منزلِ مقصود تو زیرِ قدمِ شوق
ایسا نہ ہو خط کھول کے وہ چیں بہ جبیں ہو کچھ نہ رخ اس کے تئے خجل اے رقمِ شوق
حاصل نہ ہوا وصلِ بتاں، اس پہ بھی ہم نے کیا کیا نہ محبت میں اُٹھائے ستمِ شوق
عاشق سے صنم ملنے کا وعدہ نہ کیا کر وعدے سے ترے ہووے ہے افزوں الِمِ شوق
اس زلف کے پھندے سے میں پائی نہ رہائی گردن پہ رہا میری سدا پیچ و خمِ شوق
آواز پہ ڈھولک کی اگر آنکھیں بھر آویں ہم کو گہرِ اشک کی جا ہے وہ نمِ شوق
معجز نے ترے لب کے یہ کیا سحر کیا ہے ناصح کی جو سنتا نہیں گوشِ اصمِ شوق
تا مصحفی آوارۂ صحرائے طلب ہے
پانو سے جدا اس کے نہ ہوگا یہ رمِ شوق

171

جب تلک تعمیر ویانے کرے معمارِ عشق سر پہ میرے رہیو یارب سایۂ دیوارِ عشق
ترشیِ روئے نکویاں گرچہ ہے صفرا شکن کھو نہیں سکتی ہے ہرگز زردیِ رخسارِ عشق

باغباں پانی سے اس کو سینچتا ہرگز نہیں خون[1] سے بڑھتا ہے نخلِ لالۂ گلزارِ عشق
ان طبیبوں سے نہیں امید صحت کی اُسے مرگ کو سمجھا ہے اپنا چارہ گر بیمارِ عشق
ہر سرِ موتن پر اس کے ہے زبان کشف راز مردِ عاشق کو نہیں کچھ حاجتِ اظہارِ عشق
عہدِ پیری میں لباسِ تن مرا گر ہو سیاہ غم نہیں کچھ اس کا یعنی ہوں میں ماتم دارِ عشق
اس کے چپ ہوتے ہی یکسر ہوگئی ہٹ تال[2] آہ
مصحفی کے دم سے تھی بس گرمیِ بازارِ عشق

ک

172

شب کو جوں[3] ہو ستارگاں کی چمک یوں ہے کشتوں کے استخواں کی چمک
جل گئی شمع رات جو دیکھی اس کے سینے پہ عطرداں کی چمک
یوں نمایاں ہے ابر میں مہِ عید گرد میں جیسے[4] ہو سناں کی چمک
نہ لگے زنگ اس کے آئنے کو نہ مٹے سطح آسماں کی چمک
وہی پرویں وہی بنات النعش اور ویسی ہی کہکشاں کی چمک
جب سے پہلو سے اٹھ گیا ہے وہ شوخ ہے وہی درد استخواں کی چمک
شمع رو، کوندتی ہے بجلی سی تیرے ہونٹوں پہ رنگ پاں کی چمک
آکے تیری صفائے دنداں کے کس قدر برق بے زباں کی چمک
مصحفی داغ سجدہ دیکھ کہ ہے
اس میں اس سنگ آستاں کی چمک

1۔ ج خوں سے بھر رہتا ہے 2۔ ہٹ تال = ہڑتال (ہاٹ (بازار) کو تالا لگانا)
3۔ ج ہو جوں 4۔ ج ہووے جوں

173

یار ہوتا ہے مرا لالہ عذار ایک نہ ایک
داغ دے جاتی ہے ہر سال بہار ایک نہ ایک

بیٹھ رہ نجد کے رستے[1] پہ تو مجنوں کی طرح
آ ہی نکلے گا[2] ادھر ناقہ سوار ایک نہ ایک

گل فروشوں کی تو دوکان پہ جایا مت کر
ورنہ ہووے گا گلے کا ترے ہار ایک نہ ایک

سنگِ تربت کو مرے سمجھو نہ بے سوزِ جگر
آخر اس سنگ سے نکلے گا شرار ایک نہ ایک

بزمِ حیرت میں تو بیٹھا ہوں پہ ہے مجھ کو یقیں
یاں بھی ہووے گا مرے آکے دوچار ایک نہ ایک

ناخنِ دستِ جنوں کی ہے اگر یہ کاوش
اس سے الجھے گا گریباں کا تار ایک نہ ایک

گرچہ مسدود ہے مدت سے رہِ وادیِ عشق
تو بھی اس راہ سے کرتا ہے گزار ایک نہ ایک

گل عذاروں سے میں جتنا کہ بچاتا ہوں اسے
چبھے جاتا ہے دلِ زار میں خار ایک نہ ایک

تیر نالے کے مرے بے پر و پیکاں ہیں تو کیا
سینۂ چرخ سے ہو جائے گا پار ایک نہ ایک

کیا خبر ہے تجھے کافر کہ ترے کوچے میں
روز کر رہتا ہے جاں اپنی نثار ایک نہ ایک

گہ ملالِ غمِ ہجراں و گہے فکرِ وصال
صافی دل کے مقابل ہے غبار ایک نہ ایک

دامِ گیسو کے تئیں گو تو لپیٹے رکھے
عاقبت آن ہی پھنستا ہے شکار ایک نہ ایک

ایک دن گورِ غریباں کی طرف جا تو سہی
نظر آوے گا وہاں تازہ مزار ایک نہ ایک

مصحفی عشق کا کوچہ ہے عجب سیر کی جا
آ ہی رہتا ہے جہاں سینہ فگار ایک نہ ایک

174

جس رنگ ہے رخسارہ ترا گل سے بھی نازک
زلفوں کے ترے بال ہیں سنبل سے بھی نازک

ہم کو تو غش آجائے ہے اک خندۂ گل میں
ہے بسکہ دل اپنا دلِ بلبل سے بھی نازک

ساقی نہ کہیں ٹھیس لگے شیشے کو اس کے
یہ دل ہے حبابِ قدحِ مل سے بھی نازک

1۔ ج : رستے میں 2۔ ج : آہی نکلے ہے

یہ حسن کا عالم ہے کہ نسبت سے ہوا کی سنبل کی ہر اک شاخ ہے کاکل[1] سے بھی نازک
ہردم دمِ شمشیر پہ کیونکر نہ قدم ہو ہے راہِ فنا حشر کے کچھ پل سے بھی نازک
ہر بال ہے چوٹی کا تری اپنی نظر میں موے کمر تار تامّل سے بھی نازک
اے مصحفی ہم نے نظرِ لطف کو اس کی
پایا نگہٗ چشم و تغافل سے بھی نازک

گ

175

عشق و حسن و سرود میں ہے لاگ سچ جو پوچھے کوئی یہ تینوں ہیں آگ
کیا کہوں عالم اس کے جوڑے کا کنڈلی مارے ہو جیسے کالا ناگ
اس کے تلووں سے جا لگی غافل عید کی شب حنا کے جاگے بھاگ
پیس ڈالے ہزار شیشۂ دل توسنِ نازکی نہ لے جو وہ باگ
نیند آئی نہ مجھ کو تا دمِ صبح شب یہ مطرب بجے نے گایا بھاگ[2]
یار بالیں پہ تیری بیٹھا ہے اب تو اے بختِ خفتہ اک دم جاگ
تجھ کو دعویٰ ہے گر تجرّد کا
مصحفی اپنے سایے سے بھی بھاگ

176

نالے نے میرے شب جو لگادی چمن کو آگ یکبار لگ اُٹھی وہیں سرو وسمن کو آگ
پروانے واں تلک بھی جو پہنچے تو جل بجھے گرمی نے تیری شمع[3] کی دی ہے لگن کو آگ
کرتا ہے عشق پیر میں پیش از جواں اثر خوش خوش جلانے لگتی ہے چوبِ کہن کو آگ

1۔ ج : سنبل 2۔ بھاگ / بہاگ = ایک راگ جو رات کو گایا جاتا ہے 3۔ ج : شمع کیا ہے

ہے سخت برفروختہ رنگِ عذارِ شمع فانوس کے لگی نہ کہیں پیرہن کو آگ
آتش فشاں ہو جب دم گرم سماعیاں کیونکر نہ پھونک دیوے صفِ انجمن کو آگ
دوزخ میں گو جلاویں اسے پاس دیکھیو کشتے کے تیرے مس نہیں کرتی کفن کو آگ
جنگل تمام پھنکنے لگا دودِ آہ سے
اے مصحفی لگے ترے دیوانہ پن کو آگ

ل

177

مرد قانع کو پسند آئی جو خود رنج کی چال قاسمِ رزق چلے کیونکہ نہ شطرنج کی چال
خلق آہِ شرر افشاں کا مری دیکھ انداز رہ گئی دنگ ستاروں کے وہیں گنج کی چال
خوں ہے دلِ لالہ صفتِ کجروئ گردوں سے شکلِ رخ گرچہ ہے خورشید کے نارنج کی چال
ناخنِ خارِ بیابانِ جنوں چلتا ہے تارِ دامن پہ مرے زمزمۂ سنج کی چال
حاجبِ کعبہ لگا دستِ تاسف ملنے دیکھ کر راہ میں زاہد کی ملی بنج[1] کی چال
باغ میں دیکھ کے نالے کی مرے تیز روی رہی ششدر نفسِ مرغِ نوا سنج کی چال
مصحفی حق میں عدو کے یہ غزل ہے وہ طلسم
جس کے ہر حرف میں ہے افعیِ نیرنج[2] کی چال

178

پرے سرک کہ نہ تڑپے گا روبرو بسمل رکھے ہے پاسِ ادب اے ستیزہ خو بسمل
ہزار خون ہیں گردن پہ تیری تیغِ حیا ہوئی ہے تجھ سے ہزاروں کی آرزو بسمل

1۔ بنج = درخت خراسانی اجوائن کا 2۔ نیرنج = معرب نیرنگ بمعنی فریب، جادو

کچھ احتیاج شہادت نہیں غریقوں کو بغیر تیغ ہی ماہی کا ہے گلو بسمل
شہید کوئی نہ ہو کیونکہ اس نمازی کا کرے نہ صید کو اپنے جو بے وضو بسمل
یہ بزمِ وجد کا عالم ہے کچھ کہ گویا یہاں تڑپ رہے ہیں نگاہوں کے چارسو بسمل
بغیر یار ہے مے خانہ قتل گاہ ہمیں کہ جام حلق بریدہ ہے اور سبو بسمل
دِلا نہ اس بتِ کافر کے سامنے جانا مباد ہو کہیں تیغ ادا کا تو بسمل
ہے شہر حسن کا اے مصحفی وہ نادر شاہ
تڑپ رہے ہیں وہاں تب تو کو بہ کو بسمل

م

179

بسکہ دن رات مری آہِ شرر بار ہے گرم جوں تنور اپنے مکاں کی در و دیوار ہے گرم
ہر طرف کشتوں کے پشتے ہی نظر آتے ہیں بسکہ کوچے میں ترے موت کا بازار ہے گرم
کس گُلِ سرخ کی گرمی کا نظر کردہ تو تھا اب تلک نالہ ترا مرغ گرفتار ہے گرم
تیرے اندازِ خرامش کو وہ کب پاتے ہیں کبک و طاؤس کی ہر چند کہ رفتار ہے گرم
شمع پر دیکھیو پروانے کی بیتابی کو جان دینے پہ بھی کتنا یہ جلن ہار ہے گرم
باغ میں گر وہ سنے نالۂ آتش نفساں نہ کہے پھر کبھی بلبل مری منقار ہے گرم
کہہ دو شیریں سے نہ جانے کا ادھر قصد کرے کہ ہوائے طرفِ دامنِ کہسار ہے گرم
تیر تودے سے کھنچے[1] کیا کہ جلے جاتے ہیں ہاتھ گرمیِ شست سے از بس لبِ سوفار ہے گرم
واں تو بھرتا ہے دمِ سرد کسی کی خاطر یاں تپ ہجر سے عاشق کا تن زار ہے گرم
مصحفی رویتِ باری سے تو نومید نہ ہو
روزِ محشر خبرِ وعدۂ دیدار ہے گرم

1۔ ج : چلے کیا

180

خوی[1] سے ہے زلف کے یوں پیچ و شکن میں شبنم
جیسے سنبل پہ پڑی ہووے چمن میں شبنم

جامہ زیبانِ چمن کیوں نہ کریں جیب کو چاک
کھب رہے اے گُلِ تر جب ترے تن میں شبنم

جوش ایسا ہے پسینے کا بھری تھی گویا
کوٹ کوٹ اس گُلِ رعنا کے بدن میں شبنم

اس کے دانتوں کی لطافت سے تعجب ہے مجھے
کیونکہ ٹھہری ہے یہ غنچے کے دہن میں شبنم

تو مباف اس کے میں آویزۂ گوہر نہ سمجھ
باندھ رکھی ہے یہ کافر نے رسن میں شبنم

تیرے عاشق نے کیا اس کو نیازِ گُل قبر
تھی جو اشکوں کی گریبانِ کفن میں شبنم

گورے پیٹ اس کے پہ جالی کی جو کرتی دیکھی
پھر تو ٹھہری نہ خیابانِ سمن میں شبنم

مصحفی عالم ترصیع نہ کیوں آوے نظر
برسے اس زلف کی جب باغِ سخن میں شبنم

181

محرم کے حباب اور ہیں وہ محرم گُل و شبنم
تا ہوں چمنِ دہر میں خرم گُل و شبنم

کیوں تم میں جدائی نہ ہو باہم گُل و شبنم
دم صبح کا تو تیغ کا ہے دم گُل و شبنم

رنگ چمن دہر پہ مغرور نہ ہونا
یاں فرصتِ ہستی ہے بہت کم گُل و شبنم

یاقوت کے پیالے میں جڑے جیسے ہوں ہیرے
مے کش کو دکھاتے[2] ہیں یہ عالم گُل و شبنم

آیا تھا تمازت میں وہ گلگشتِ چمن کو
دیکھ اس کی جبیں ہو گئے بے دم گُل و شبنم

سورج اُسے دے چین نہ چھوڑے اِسے گلچیں
کس طرح رہیں باغ میں بے غم گُل و شبنم

بے سودہ الماس نہ دیکھا کہ بتاویں
بلبل کے دلِ ریش کا مرہم گُل و شبنم

پاتے ہیں سدا جنبشِ بادِ سحری سے
اجزاے نشاط اپنے کو درہم گُل و شبنم

رہنے سے ہمارے یہ چمن تم پہ قفس تھا
لو خوش رہو تم دونوں چلے ہم گُل و شبنم

کیا مستِ مے بے خبری اتنے پڑے ہو
ٹک چونکو کہ اب رات رہی کم گُل و شبنم

1۔ خوی = اس کا تلفظ ثی ہے بمعنی پسینہ 2۔ ج دکھاتی ہے

زائل نہیں ہوتا کبھی قسمت کا نوشتہ گو مہر کا ہونا ہے تمھیں سم گل و شبنم
اک رات کی رخصت ہے تمھیں، صبح کے ہوتے اس باغ سے جانا ہے مسلّم گل و شبنم
خاور کا یہ میداں ہے، میں حیراں ہوں، کدھر کو خورشید کے سایے سے کریں رم گل و شبنم
ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں، کرتے ہیں چمن میں کیا تیرے طرب کشتہ کا ماتم گل و شبنم
کس کان کا جھمکا نظر آیا ہے یہ ان کو اتنے خویِ خجلت میں جو ہیں نم گل و شبنم
دنداں پہ جگر رہتے ہیں ہر شب جو چمن میں کس کے لب و دنداں سے ہیں مُلزم گل و شبنم
ایک رات ہیں مہمانِ چمن، صبح کے ہوتے ہے عزمِ سفر ہم کو مصمم گل و شبنم
اے مصحفی شنگرف[1] سے ہی کاغذ پہ تو لکھنا
یہ[2] شعر کے لکھنے میں ہوں باہم گل و شبنم

182

شرمندہ ترے رو[3] سے ہیں اے زخمِ جگر ہم قابل ہے رفو کے تو نہ شائستۂ مرہم
مل جا کہیں آ کر کہ تصور میں کہاں تک ہاتھوں کو شبِ ہجر کریں طوقِ کمر ہم
تلوار پہ تلوار پڑی تو بھی نہ سر کے میدانِ محبت میں رہے سینہ سپر ہم
بیٹھے تو اگر آکے سر و رو پہ ہمارے تجھ سے تو مکدّر نہ ہوں اے گردِ سفر ہم
اک[4] بالِ قلم جوفِ قلم[5] سے نکل آیا بھولے جو سراپا میں ترے موے کمر ہم
ہے سوچ یہی ہم کو کہ پھر ہوتے کہاں کے فوجِ صفِ مژگاں پہ نہ پاتے جو ظفر ہم
جی الجھے ہے اپنا کہ نظر ان کو نہ لگ جائے ہیں موے پریشاں جو ترے درہم و برہم
دیکھا نہ، گرفتار کیا زلف نے تیری کرتے نہ تھے اس ڈر سے ترے رخ پہ نظر ہم
ایذا ہمیں آ آکے نہ دے کنجِ قفس میں مشتاقِ گلستاں نہیں اے بادِ سحر ہم
اے مصحفی ہے جی میں غزل اور بھی لکھ کر
نقشِ خطِ مسطر کو کریں سلکِ گہر ہم

1۔ شنگرف = سرخ 2۔ج : یہ شیشہ (سہو کاتب) 3۔ج ۔ رخ 4۔ج : اک نالہ قلم
5۔ جوفِ قلم = قلم کے نیزے کے اندر کا ریشہ

183

اشکِ سرِ مژگاں تھے جو اے دیدۂ تر ہم　ٹک آنکھ جھپکتے ہی پھر آئے نہ نظر ہم
منزل ہے بڑی اور ہمیں چلنا ہے دمِ صبح　کیوں شب سے نہ پھر باندھ رکھیں رختِ سفر ہم
یہ اشک پیا پے کی ہے آمد تو کریں گے　ہر تار گریباں کو بہ از سلکِ گہر ہم
اس وقت تو شاید کہ ہمیں یاد کرے گا　جب جی سے تری یاد میں جاویں گے گزر ہم
منت کشِ عیسیٰ ہو سو کیوں زخمیِ الفت　نے سودۂ[1] الماس ہے نے حقۂ[2] مرہم
جوڑا لیا بالوں کا وہیں باندھ پری نے　شانے پہ پڑے دیکھ ترے گیسوے[3] درہم
آہن دلیِ چرخ سے آرام نہ پایا　ہر چند کہ پتھر میں رہے مثلِ شرر ہم
تو باغ میں آوے اگر اے سروِ خراماں　دکھلاویں[4] رگِ گل کو تری تابِ کمر ہم
لاگو ہے بہت جان کی شمشیرِ تغافل　کر دیویں گے اک دن اسے خوں اپنا نذر[5] ہم
تاریکیِ ہجراں ہی میں مرجاویں گے اک دن　یہ شب ہے تو بس دیکھ چکے روے سحر ہم

اے مصحفی سرکش ہے بہت شمع کا شعلہ
پروانہ صفت کیونکہ نہ ہوں سوختہ پر ہم

184

نکلی نہ قتل گہ میں کسی کی ہوس تمام　بسمل تڑپ تڑپ کے ہوئے پیش و پس تمام
ہوں داد خواہ کس سے ترے عہد حسن میں　فریاد کرتے پھرتے ہیں فریاد رس تمام
اس لطف کا ہوں کشتہ کہ صیّاد نے مرے　پھولوں سے بھر دیے ہیں شگافِ قفس تمام
مجنوں کو کیا خبر ہے کہ یاں دردِ عشق سے　نالاں ہیں گردِ محمل لیلیٰ جرس تمام
مقتل سے کس کے آوے ہے وہ ترکِ جنگجو　جو بھر رہے ہیں خون میں پاے فرس تمام
تھا جس چمن میں رنگِ نزاکت کا تیرے ذکر　واں گل نظر پڑے مجھے جوں خار و خس تمام

1۔ سودہ = گھسا ہوا　2۔ حقۂ مرہم = مرہم کی ڈبیا　3۔ج گیسوے پُرخم　4۔ ج دکھلاوے
5۔ نذر کو بروزن کمر باندھا ہے

ساکن تری گلی کے شبِ وصل، اے صنم　　میں دُزد ہوں گر ایک تو وہ ہیں عسس تمام
قلزم ہے اشک کا وہ مری چشمِ خوں فشاں　　جس نے کیا ہے قصہ دار و رسن تمام
شیرینیِ زباں کو مری دیکھ مصحفی
چاٹیں ہیں ہونٹ اپنے مرے ہم نفس تمام

185

کبھی پیدا کبھی ناپید ہیں ہم　　غرض دامِ وفا کے صید ہیں ہم
پری زادوں سے کب چھوٹے کہ ان کے　　اسیر دامِ مکر و صید ہیں ہم
کہیں کیونکر نہ ہم کو لوگ آزاد　　کہ عاشق پیشہ اور بے قید ہیں ہم
ہماری کید میں شاید وہ آوے　　اسی خاطر سراسر کید ہیں ہم
مٹا دیتے ہیں دم میں علّتِ شعر　　کہ اس فن میں دھنتر[1] بید[2] ہیں ہم
ہمیں نحوی کہے گا مصحفی کون
عبث مصروف عمر و زید ہیں ہم

186

ناحق کو محبت میں گرفتار رہے ہم　　کچھ درد نہ تھا پر یونہی بیمار رہے ہم
اے تارِ نفس کفر اگر تھا تو یہی تھا　　اک عمر ترے بستۂ زنّار رہے ہم
چلنے سے تھکے پانو تو تھک جانے دو ان کو　　رونے سے کب اے دیدۂ خونبار رہے ہم
کوچے میں ترے ہم کو کسی نے بھی نہ پوچھا　　ہر چند کہ گریاں پسِ دیوار رہے ہم
پاس اپنے تصور بھی ترا جب کہ نہ آیا　　ناچار شبِ ہجر میں من مار رہے ہم
جوں بادِ صبا پائی نہ واں گو کہ رسائی　　جی سے تری زلفوں کے ہوا دار رہے ہم
کاکل کے، تری زلف کے اور چشم سیہ کے　　جب تک رہے دنیا میں گنہگار رہے ہم
کوچے میں ترے گزرے تو واں دو دو پہر تک　　حیرت زدۂ صورتِ دیوار رہے ہم

1۔ دھنتر = قوی　　2۔ بید = وید (طبیب)

کیا جانیے رفتار میں کیا یار کی دیکھا   تا دیر جو حیراں دمِ رفتار رہے ہم
غش آیا تو ہشیاری بھی کچھ کام نہ آئی
اے مصحفی ہرچند کہ ہشیار رہے ہم

187

نے شہریوں میں ہیں نہ بیابانیوں میں ہم   آزاد ہیں پہ ہیں ترے زندانیوں میں ہم
جن کا نظیر دستِ قضا سے نہ بن سکا   انصاف ہو تو ہیں اُنہی لاثانیوں میں ہم
دریا کی لہروں سے یہ عیاں ہے کہ جوں حباب   رکھتے ہیں دل کو جمع پریشانیوں میں ہم
رشکوک[1] میرے اشک کے لے اس نے یوں کہا   ان موتیوں کو ڈالیں گے چودانیوں[2] میں ہم
اب طائرانِ دشت کے ہیں ہم نشید درد[3]   کرتے تھے زمزمے کبھی بستانیوں میں ہم
اے تیغِ ناز تو نے یہ کیسا ستم کیا   بے ذبح رہ گئے ترے قربانیوں میں ہم
جس جا پڑے ہیں کشتے ترے ان کے جو نسیم   بوسے ہی دیتے پھرتے ہیں پیشانیوں میں ہم
سو عیدیں[4] آئیں اور ہوا ہم کو حکمِ قتل   کیا نا قبول ہیں ترے زندانیوں میں ہم
اے شہسوارِ حسن عناں لے کہ پس گئے   تیرے سمند ناز کی جولانیوں میں ہم
مدرک ہیں جزو کل کے پہ رہتے ہیں رات دن   اس کارِ گاہ صنع کی حیرانیوں میں ہم
کشتی شکست خوردۂ دریائے عشق ہیں   جاتے ہیں ترتے ڈوبتے طوفانیوں میں ہم
محتاجِ مرگ، کاہے کو پھر ہوویں مصحفی
جیتے ہی جی جو بیٹھے ہوں روحانیوں میں ہم

1۔ رشکوک = چھوٹے موتی   2۔ چودانی = کان کا ایک زیور جس میں چار موتی لگے ہوتے ہیں
3۔ ہم نشید درد = درد بھرے گانے میں شریک   4۔ ج : عید (یہاں مراد عیدِ اضحیٰ ہے)

ن

188

لگتے ہیں نت جو خوباں شرمانے، باولے ہیں　　ہم لوگ وحشی خبطی دیوانے باولے ہیں
یہ سحر کیا کیا ہے بالوں کی درہمی نے　　جو اس پری پر اپنے بیگانے باولے ہیں
جی جھونکتا ہے کوئی آتش میں ناحق اپنا　　جلتے ہیں شمع پر جو پروانے باولے ہیں
عصمت کا اپنی اس کو جب آپھی غم نہ ہووے　　لگتے ہیں ہم جو ناحق غم کھانے، باولے ہم
اس مے کا ایک قطرہ سوراخ دل کرے ہے　　بھر بھر جو ہم پئیں ہیں پیمانے باولے ہیں
گردش سے پتلیوں کی سرگشتہ ہے زمانہ　　مستی سے اس نگہ کی میخانے باولے ہیں

جاتے ہیں اس گلی میں لڑکوں کو ساتھ لے کر
میاں مصحفی بھی یارو کیا سیانے باولے ہیں

189

ہم تو جوں سرمہ اسے [1] آنکھوں میں جا دیتے ہیں　　خاک کوچے کی ترے، اشک بہا دیتے ہیں
ان کے کشتے کا نشاں کیونکہ کوئی پاوے یہ شوخ　　کر کے قیمہ اسے مٹی میں ملا دیتے ہیں
نمک آلودِ تغافل جو ہیں رنجش کے سبب　　اب تلک زخم کہیں مجھ کو مزا دیتے ہیں
جس سے وہ گھورنے لگتا ہے مری جانب دیکھ　　ہم نشیں ایسی ہی کچھ اس کو سجھا دیتے ہیں
طرفہ کوتاہ ہے یہ مرگ کا دروازہ جہاں　　لوگ آتے ہوئے سب سر کو جھکا دیتے ہیں
عید اب کے بھی گئی یوں ہی کسی نے نہ کہا　　کہ ترے یار کو ہم تجھ سے ملا دیتے ہیں
خوبرویوں کی نہ صحبت میں کوئی بیٹھے یہ لوگ　　پیچھے انسان کے اک روگ لگا دیتے ہیں
زشت اور خوب یہاں ایک ہے آئینہ مثال　　دل میں ہر شخص کو جا اہلِ صفا دیتے ہیں

1۔ج : تری آنکھوں میں

حسن کا اس شہِ خوباں کے یہ عالم ہے جسے　راہ جاتے ہوئے درویش دعا دیتے ہیں
مصحفی ہے یہ زمیں زور ہی دلکش اس میں
اک غزل اور بھی ہم تجھ کو لکھا دیتے ہیں

190

اپنی مجلس میں بتاں جب ہمیں جا دیتے ہیں　پہلے اغیار کو پہلو سے اٹھا دیتے ہیں
لاشے جلتے ہیں جگر یہ ترے فریادیوں کے　استخواں ان کے جو جلنے میں صدا دیتے ہیں
عالم اس کارگہِ صنع کا ہے طرفہ کہ یاں　نقش بننے نہیں پاتا کہ مٹا دیتے ہیں
موسمِ گل میں ہوا جب انھیں لگ جاتی ہے　کہنہ زخموں کے الم طرفہ مزا دیتے ہیں
میں جو دل دینے میں تاخیر کروں ہوں تو بتاں　ناز و عشوہ کو مرے پیچھے لگا دیتے ہیں
ساحر ایسے ہیں زباں[1] لال رہے ہے اس کی　پڑھ کے کچھ پان میں یہ جس کو کھلا دیتے ہیں
اس طرف بھی کبھی آنا کہ اسیرانِ[2] قفس　اے نسیم سحری، تجھ کو دعا دیتے ہیں
نہ پھنسا ہو جو خمِ زلف میں وہ کیا جانے　جان کس طرح گرفتارِ بلا دیتے ہیں
مصحفی جب سے ہوا ہوں میں جدا اس بت سے
دل کے صدمے مجھے دن رات سزا دیتے ہیں

191

قریب شمع شب مل مل کفِ افسوس شیشے میں
ہوا پروانہ آخر جان سے مایوس شیشے میں
جو مجھ آتش نفس نے منھ لگایا اس کو اے ساقی
ابھی ہونے لگیں گے آبلے محسوس شیشے میں
تجلی حسن کی کس کے پڑی ہے اس پہ حیراں ہوں
حبابِ مے نے روشن کی ہے جو فانوس شیشے میں

1۔ زباں لال ہونا = خاموش رہنا نسخۂ انجمن (ج) میں لعل (صریحاً غلط)　2۔ج گرفتار قفس

نہیں ہم جانے دیتے دل سے باہر حسن خواہش کو
چھپا رکھا ہے ہم نے عشق کا ناموس شیشے میں

مرا داغ دروں شفافیِ دل کی لطافت سے
نظر آتا ہے باہر جوں پر طاؤس شیشے میں

بغل میں کس کی دل رنگ ریاکاری سے خالی ہے
بھرا ہر اک کے ہے یاں نقشۂ سالوس[1] شیشے میں

اُلٹ دیتے ہیں یہ طبقے کے طبقے کیا عجب اس کا
جو ہووے حکم عامل سے پری معکوس شیشے میں

وہ مے کش ہیں کہ گر ہم خاک ہوجاویں تو تلچھٹ ہو
ہماری خاک بھی مے کا کرے پابوس شیشے میں

بہ شوخی ہاتھ سے اس بت نے پٹکا رات جو شیشہ
وہیں پیدا ہوا اک نالۂ فانوس شیشے میں

تو بخش اے مصحفی وہ رنگ اب صہبائے معنی کو
کہ دکھلاوے وہ شب کو جلوۂ طاؤس شیشے میں

192

پری کس کے تصوّر سے میں کی محبوس شیشے میں
کہ پرچھائیں سی کچھ ہونے لگی محسوس شیشے میں

پڑے شیشے کے حقّے میں خیال لب میں اس گل کے
ملیں ہیں برگِ گل باہم کفِ افسوس شیشے میں

صفا سے اس گلو کے ہم نے دیکھا جعد کا عالم
نظر آئی ہمیں یاں گردن طاؤس شیشے میں

1۔ نقشۂ سالوس = فریب کا منصوبہ

نہ پوچھو عالم اس کی ساق کا ہم سے کہ وہ کافر
لیے پھرتی ہے برقِ خرمن ناموس شیشے میں
یہ موجِ رنگِ سرخ مے نے اس میں شمع روشن کی
کہ گویا چھپ گیا جا پردۂ فانوس شیشے میں
گر اس کو عالمِ بت خانۂ مے واں نظر آوے
بجاوے نالۂ دل سے پری ناقوس شیشے میں
خمِ مے میں وہ تیرے ہاتھ سے غوطے جو کھاتا ہے
ہوا جاتا ہے شیشے کا نفس محبوس شیشے میں
یہ کس کے رنگ کی زردی ہے عکس افگن خدا جانے
کہ رنگِ اصفر اب تک مے کا ہے ملبوس شیشے میں
خردمندوں کی خاطر رہ گیا ہے طاقِ دانش پر
شرابِ علمِ حکمت بھر کے جالینوس شیشے میں
نہیں سنگِ حوادث سے اسے اے مصحفی کچھ غم
فلاطوں وش بجاوے جو کہ بیٹھا کوس[1] شیشے میں

193

بھری ہے تو نے مے ساقی کہ رنگِ اوس شیشے میں
کرے ہے جس کی سرخی کا شفق پابوس شیشے میں
نہ نکہت گل کی آوے اور نہ واں بادِ صبا پہنچے
غضب ہے ہووے گر مرغِ قفس محبوس شیشے میں
مسیحا سے میں دردِ دل کی جا کر کیا دوا مانگوں
نہیں پاتا ہوں واں تو جز کفِ افسوس شیشے میں

1۔ کوس = نقارہ

پڑا ہے عکس اس پر آہ کس[1] چشمِ خماریں کا
کہ سبزی کر رہی ہے جلوۂ طاؤس شیشے میں
فلک کے گنبد بے در میں روزن ہو نہیں سکتا
کرے گو دخل فکرِ تیز جالینوس شیشے میں
جو واژوں بخت ہیں وہ نشۂ عرفاں سے خالی ہیں
شراب اے مصحفی رہتی نہیں معکوس شیشے میں

194

دامن کشی کی ہاتھ کو اپنے سزا نہ دوں | جس عضو سے گنہ ہوا اس کو جلا نہ دوں
اس نے جلا رکھا ہے مرا دودمانِ عیش | اک نالہ کر کے چرخ کو آتش لگا نہ دوں
ہوتی نہیں ہے دل کو تسلی کسی طرح | جب تک میں درمیان کا پردہ اُٹھا نہ دوں
اے نقشِ پا تو پانو سے اس کے دوچار ہو | اس رشک سے میں خاک میں تجھ کو ملا نہ دوں
اس جاں بلب کو جس نے کرم سے جلا لیا | یا رب میں اس کریم کو کیونکر دعا نہ دوں
ہوں میں ستم رسیدہ و مظلوم و بے گناہ | نالے سے اپنے عرش کو کیونکر ہلا نہ دوں
پیچھے پڑا ہے جان کے میری وہ مصحفی
کس طرح زندگی کا میں جھگڑا چکا نہ دوں

195

اس گوشۂ عزلت میں تنہائی ہے اور میں ہوں | معشوقِ تصور سے یکجائی ہے اور میں ہوں
یا گھر سے قدم میرا باہر نہ نکلتا تھا | یا شہر کی گلیوں میں رُسوائی ہے اور میں ہوں
جس دشت میں ناقے کا گزرا نہ قدم ہرگز | اس دشت میں مجنوں سا سودائی ہے اور میں ہوں
ناصح کی نہ میں[2] مانوں ہمدم کی نہ کچھ سمجھو | اس عشق و محبت میں خودرائی ہے اور میں ہوں

1۔ ج اس چشم خماریں 2۔ ج کچھ

ہر چند[1] جنونِ عشق ہوتا ہے خرد دشمن
اے مصحفی اس پر بھی دانائی ہے اور میں ہوں

196

جلوہ گر اس کا سراپا ہے بدن آئنے میں
نظر آتا[2] ہے ہمیں سرو چمن آئنے میں

سینہ صافوں سے خبر عالم علوی کی تو پوچھ
عرش و کرسی ہے یہاں عکس فگن آئنے میں

تاب آزردگی کب ہے دلِ عاشق کو یہاں
چینِ پیشانی سے پڑتی ہے شکن آئنے میں

چشمِ بیمار سے ٹپکے تھا لہو دیکھتے وقت
پلکیں ہلیاں تو پڑا زور ہی رن آئنے میں

لے لیا پیار سے عکس اپنے کا جھک کر بوسہ
اس نے دیکھا جو وہ پاں خوردہ دہن آئنے میں

ابرقِ سوختہ سا کیوں نہ نظر آئے جو ہو
آتشِ حسن تری صاعقہ زن آئنے میں

دام میں لاویں[4] وہ تا عکس کی تیرے تصویر
زلفیں پھینکیں ہیں دو جانب سے رسن آئنے میں

آبِ جو کا ہے یہ عالم کہ نظر آتا ہے
لعلِ رمّانی سا ہر گل کا برن[5] آئنے میں

دلِ مایوس کو پہنے ہوئے آتی ہیں نظر
سیکڑوں حسرتِ دیدار، کفن آئنے میں

آئنہ دیکھتے پیچھے سے جو میں آنکلا
عکس پر عکس ہوا سایہ فگن آئنے میں

تھی تو آزردگی مدّت سے پہ وہ روٹھے ہوئے
بن منائے گئے بے ساختہ من آئنے میں

مصحفی کیوں نہ کہے تجھ کو کوئی طوطیِ ہند
جب تو اس وضع کرے فکرِ سخن آئنے میں

197

پٹک دیویں زمین پر یا بہ سوے آسماں پھینکیں
یہاں سے ہم کو لے جا کر خدا جانے کہاں پھینکیں

بہ وقتِ گیندہ باز، گل رخاں، کیا ان کا نقصاں ہے
اگر دو چار گل سوے مزار بے کساں پھینکیں

1۔ ج : ہر چند کہ شورِ عشق 2۔ ج : نظر آیا ہے 3۔ ج : آویں 4۔ ج : بدن

قمر دیکھے تجھے گر چشمِ خواہش سے تو ہم ووں ہی
زمیں سے بھر کے چٹکی خاک سوئے آسماں پھینکیں

زیاں ہر خانے کا ہے مجھ سے میں وہ آبِ باراں ہوں
جسے ہاتھوں میں لے لے سب برونِ آستاں پھینکیں

تماشا لختِ دل نے اشک میں ہم کو یہ دکھلایا
کہ جیسے گل کی پتے بر سرِ آبِ رواں پھینکیں

توقع یہ نہ تھی ان باغبانوں سے کہ یہ کافر
مجھے پہلے اُجاڑیں باغ سے پھر آشیاں پھینکیں

کہے تھا قیس مجھ کو دفن ہونا کب گوارا ہے
سگِ لیلیٰ کے آگے کاش میرے استخواں پھینکیں

جدا تو کرچکے ہیں آپ سے یہ نونہال آخر
جدھر چاہیں ادھر اب مجھ کو جوں برگِ خزاں پھینکیں

ہمارے شیشۂ دل کے ہی کچھ دشمن ہیں یہ لڑکے
خمِ گردوں پہ بھی گا ہے تو اک سنگِ گراں پھینکیں

رہیں جا کر فلک پر مصحفی اس بت کے گر عاشق
تو واں بھی اس کے کوٹھے پر کمند کہکشاں[1] پھینکیں

198

جب تلک واں رہے جینے سے رہی یاس ہمیں
کوچۂ یار کی آئی نہ ہوا راس ہمیں

ہر کسی پاس ہم اب بیٹھتے بھی ڈرتے ہیں
بسکہ رہتا ہے تری طبع کا وسواس[2] ہمیں

ہم یہ جانیں[3] کہ ملی حور ہمیں دنیا میں
کوئی لے جا کے بٹھادے جو ترے پاس ہمیں

جا پڑی شب جو نظر خوشۂ پرویں کی طرف
یاد آئی ترے پازیب کی جھنکار ہمیں

1۔ ج: آشیاں 2۔ ہندی میں وشواس ہے 3۔ج: یہ جانے

زخم کھانے سے ترے ہم نہ ہوئے سیر کبھی آبِ خنجر ہی کی ہر لحظہ رہی پیاس ہمیں
بحرِ غم میں جو لگے ڈوبنے ہم اس ساعت حضرتِ خضر نظر آئے نہ الیاس ہمیں
تیری زلفوں نے دماغ اتنا کیا ہے خوش بو کہ خوش آتی ہی نہیں مشک کی بھی باس ہمیں
کس کی پلکوں کے یہ پیکاں ہوئے ہیں اس میں جمع نظر آتا ہے جو دل جیسے انناس ہمیں
مصحفی عمر ہوئی وصل سے محروم ہیں ہم
لیکن اس پر بھی لگی رہتی ہے اک آس ہمیں

199

میں پھروں گھر میں پڑا دل سے بات کرتا ہوں جب اس کے شکل و شمائل سے بات کرتا ہوں
بہ وقت ذبح بھی ہلتے رہیں ہیں لب میرے زبسکہ خنجرِ قاتل سے بات کرتا ہوں
مری زباں کو مرا ہمنوا ہی سمجھے ہے میں نیم ذبح ہوں بسمل سے بات کرتا ہوں
نہ ناقہ اور نہ محمل، رہا میں سودائی ہنوز ناقہ و محمل سے بات کرتا ہوں
ہے ان دنوں مری آواز میں یہاں تک ضعف کہ اپنے ساتھ بھی مشکل سے بات کرتا ہوں
سمجھ نہ موج مرے منہ میں ہیں ہزار زباں میں بحر ہوں لبِ ساحل سے بات کرتا ہوں
مزہ ملے ہے مجھے اس کی ہم کلامی کا میں اس کے در کے جو سائل سے بات کرتا ہوں
بوقتِ آئنہ دیدن بلاؤں میں تو کہے ”میں اپنے عاشقِ مائل سے بات کرتا ہوں“
جو مصحفی کی سفارش کریں تو بولے وہ شوخ
میں ایسے ننگِ قبائل سے بات کرتا ہوں

200

محبت نے کیا کیا نہ آنیں نکالیں کہ تارِ قلم نے زبانیں نکالیں
ہوا ہاتھ اس کا لہو سے حنائی زبس اس نے کشتوں کی جانیں نکالیں
وہ لڑکا تھا جب تک یہ سج دھج کہاں تھی جواں ہوتے ہی اس نے شانیں نکالیں

لگا تیر سا آ کے مانی کے دل پر　جب ان ابروؤں کی کمانیں نکالیں
شبہ کا گماں تھا نہ یاروں کو جس جا　میں واں لعل و گوہر کی کانیں نکالیں
پھسل ہی گیا کلکِ تصویرِ مانی　کمر کھینچ کر جوں ہی رانیں نکالیں
زہے کلکِ صنعت کہ جس نے زمیں پر　بہاریں بنائیں، خزانیں نکالیں
گلا ڈوک[1] میں گرچہ تھا مصحفی کا
پر اس پر بھی دوچار تانیں نکالیں

201

منھ چھپاؤ نہ تم نقاب میں جان　یوں ہی عاشق کی ہے عذاب میں جان
جوں سی چٹکی میں لے کے مل ڈالی　ہم سے عاشق کی ہے عذاب میں جان
خوبیِ حسن نے تری نہ رکھی　باقی اک ذرہ شیخ و شاب میں جان
کس کی زلفوں کے پیچ وتاب سے ہے　رات دن میری پیچ و تاب میں جان
سخت مشتاق ہے تمھارا دِل　منھ دِکھاؤ کبھی تو خواب میں جان
ایک دن تم نے کی نہ بات کبھو　مر گئے ہم تو اس حجاب میں جان
نت ترے انتظارِ غسل سے ہے　بحر کے دیدۂ حباب میں جان
مہ نے اے شہسوارِ عرصۂ حسن　عاقبت دی تری رکاب میں جان
اُس نے بھر کر نگاہ دیکھا تھا　نہیں، اس دن سے آفتاب میں جان
سرِ آتش جو اشک ریزاں تھا　کسی عاشق کی تھی کباب میں جان
مصحفی تھا، ز بسکہ عاشقِ شعر
مرتے مرتے رہی کتاب میں جان

202

گُہر اشک ہیں مژگاں پہ جو دو چار رواں　یہی ہوتے ہیں کوئی دم کو بہ رخسار رواں

1۔ گلا ڈوک میں ہونا = گلا بیٹھا ہونا

وہ متاعِ سرِ بازار ہے تو دنیا میں جس کی قیمت کو ہو سنتے ہی خریدار رواں
ناصحا، دور ہو چل مجھ سے تو بجّے مت کر سبق گریہ پڑھے ہے یہ دل افگار رواں
دودِ دل سے مرے وہ کوچہ زبس تھا شبِ تار واں سے گزرا تو ہوا دست بہ دیوار رواں
رہ گیا صحنِ قفس میں بہ ہوائے گل و باغ ہو کے دو چار قدم مرغِ گرفتار رواں
یہی عالم ہے مسیحائی کا تیری تو میاں ہوویں گے سوے عدم سیکڑوں بیمار رواں
صدمے کیا کیا دلِ مرغِ قفسی پر گزرے تو بھی قاصد نہ گیا جانبِ گلزار رواں
زور عالم ہے کہ پیچھے ترے دیوانے کے ہیں تماشائی ہزاروں سرِ بازار رواں
عمر صیّاد کی گزری اسی جاسوسی میں گل کو نامہ نہ کرے مرغِ گرفتار رواں
جاے عبرت ہے کہ مقتل کو ترے کوچے سے دست بر دوش ہوئے کتنے گنہگار رواں
عید کا دن ہے کرو آج مرے چہرے پر جتنا خوں تم سے ہواے دیدۂ خونبار رواں
گرچہ جاتا ہوں کہیں لیک وہ کوچہ ہے جدھر پانو ہوتے ہیں اُدھر ہی دمِ رفتار رواں
بدگمانی نے یہ گھیرا کہ بہت گھبرایا
کر کے قاصد کو اُدھر مصحفیِ زار رواں

203

اس گل پہ ہے بہار شب و روز ان دنوں آئینہ ہے دو چار شب و روز ان دنوں
کیا ہو گیا ہے اس دلِ حرماں نصیب کو رہتا ہے بے قرار شب و روز ان دنوں
خنجر بہ کف تصوّرِ خونیں نگاہِ دوست چھاتی پہ ہے سوار شب و روز ان دنوں
رہتی ہے حلقِ تشنۂ دریاے وصل پر شمشیر آب دار شب و روز ان دنوں
کس کو چمک دکھانے کا طالب ہے حسنِ دوست ہے غازہ و عذار شب و روز ان دنوں
رہتا ہے دیدہ باز جو تو تجھ کو مصحفی
ہے کس کا انتظار شب و روز ان دنوں

204

مثل یوسف گو پڑے پھر شہرزن کی قید میں — مرد کو اچھا نہیں رہنا وطن کی قید میں

دست و پا مارے ہے بہیترے، نکل سکتا نہیں — بسکہ ہے پروانہ گردابِ لگن کی قید میں

بلبلِ تصویرِ و دیوارِ چمن، ہوں[1] میں ملول — ورنہ کب آتا بہ ایں صورت چمن کی قید میں

ہر گھڑی جعد اور مباف اپنا دکھاتے ہو کسے — وے نہیں ہم، آویں جو دام ورسن کی قید میں

طائرانِ سدرہ جو آ آ کے نت پھنستے رہے — کیا مزہ تھا اس کی زلفِ پُر شکن کی قید میں

اضطرابِ دل یہی ہے ان کا تو کشتے ترے — ٹھہرنے والے نہیں ہرگز کفن کی قید میں

اُس نے کھینچا تھا تسلّی کے لیے دامِ خیال — ورنہ کب آتی تھی شیریں کوہکن کی قید میں

اس پہ تو موے سرِ شیریں نے اب مارا ہے جال — کوہکن کا دل نہیں ہے کوہکن کی قید میں

تال سے مطرب کی دل پر صدمہ تھا اے مصحفی
شب پھنسے تھے جا کے ہم زورِ انجمن کی قید میں

205

خواریاں[2]، بدنامیاں، رسوائیاں — عشق نے شکلیں یہ سب دِکھلائیاں

وہ ہی کیں باتیں جو تجھ کو بھائیاں — بل[3] بے اے ظالم، تری خودرائیاں

مر گئے لاکھوں ہی اور پروا نہ کی — کیا کہوں میں اس کی بے پروائیاں

ایک صورت کے لیے اس عشق میں — سیکڑوں صورت کی ہیں رسوائیاں

شوق میں آغوشِ تیغ[4] ناز کے — زخمِ دل لیتے ہیں سب انگڑائیاں

ہم سے پوچھے کوئی عزلت کا مزہ — گوشۂ صحرا ہے اور تنہائیاں

دل مشبّک[5] صورتِ بادام ہے — برچھیاں پلکوں کی کس کی کھائیاں

خانۂ دل پر ہمارے یا نصیب — بادلوں نے بجلیاں برسائیاں

1۔ ج: میں ہوں 2۔ ج: زاریاں 3۔ ج: بل بے ظالم تیری خودآرائیاں

4۔ ج: تیغِ یار 5۔ مشبّک = سوراخ دار

مصحفی بھی ہے پھنکیتوں[1] میں میاں
یاد ہیں اس کو بھی کتنی گھائیاں[2]

206

قیس اس مہِ عرب[3] کے ہے دنبالِ کارواں — غمزہ ہے جس کی چشم کا قتالِ کارواں
آیا کبھی جو قافلۂ حیّ بہ سوئے نجد — مجنوں نے لختِ دل کیے ارسالِ کارواں
یوسف سا ماہِ چاردہ ہاتھ اس کے یوں لگے — مالک کے بخت دیکھ اور اقبالِ کارواں
شہرِ عدم کو زندہ پہنچتا اگر کوئی — لکھ لکھ کے بھیجتا مجھے احوالِ کارواں
کھینچا کریں ہیں تیرے مقیمانِ دستِ عشق — آئینۂ خیال میں تمثالِ کارواں
مانندِ موج قلزمِ ہستی میں روز و شب — بن بن کے محو ہوتی ہیں اشکالِ کارواں
ناقہ کا پانو، سینۂ مجنوں پہ تا پڑے — ہوتا ہے اس ہوس میں وہ پامالِ کارواں
یہ جستجو ہے کس کی جو مشتِ غبارِ قیس — اُڑتا پھرے ہے اب تئیں دنبالِ کارواں

لکھ اک غزل تو اور بھی ایسی کہ مصحفی
روشن ہو جس سے خوب خط و خالِ کارواں

207

تنہا رووں سے پوچھو نہ کوئی حالِ کارواں — ہم پیشِ کارواں ہیں نہ دنبالِ کارواں
ناز و ادا کی فوج میں دل گھر گیا ہے ہاے — مورِ ضعیف ہووے ہے پامالِ کارواں
ہم دور دور سب سے چلے راہِ عشق میں — ہرگز ہوئے نہ واقف احوالِ کارواں
ہے موجبِ شفاعتِ حیّ گریہ قیس کا — دھویا ہے جس نے نامۂ اعمالِ کارواں
باریک بیں[4] وہی ہے نظر آئے ہے جسے — ہر نقشِ پاے مور سے تمثالِ کارواں
اے ناقہ راں زمام تو ناقے کی تھام لے — واماندہ اک غریب ہے دنبالِ کارواں

1۔ پھکیت = گتکے بازی کا ماہر، مراداً چالاک 2۔ گھائی = وار بچانا، فریب 3۔ ج . مہٗ عرب کے
4۔ ج ۰ وہ ہوں کہ

آنکھیں ہماری قرعۂ رمّال بن گئیں دیکھا کیے ز بسکہ سدا فالِ کارواں
غارت گروں کے ہاتھ سے رستے میں مصر کے ق سالم رہا اگرچہ زر و مالِ کارواں
پر ہم پہ کھل گیا مہِ کنعاں کی بیع سے مضمونِ تیرہ بختیِ اقبالِ کارواں
داخل ہوا تھا حج میں تو جس سال غم نہ کھا
آتا ہے مصحفی وہی پھر سالِ کارواں

208

جو جلوہ گر رہے ہے بتوں کے جمال میں وہ نور دیکھتا ہوں میں سنگ و سفال میں
چالاک دستی اس کے، میں غمزے کی کیا کہوں نشتر گڑو گیا ہے مرے بال بال میں
آ قاصدِ اجل نے ہمیں اور دی خبر کچھ دیر رہ گئی تھی زمانِ وصال میں
کس کی کمر کا دھیان تھا حدّادِ چرخ کو جو بال رہ گیا خمِ تیغِ ہلال میں
کر قتل اس نے کتنے گڑھے میں دیے ہیں پھینک پڑتا ہے ہنستے وقت گڑھا جس کے گال میں
کس کی نگاہِ گرم نے اس کو دیا فشار ڈوبا ہے سخت گل عرقِ انفعال میں
عارض کا خال زلف کی یاں پھینکے ہے کمند واں جی رہا ہے ڈوب زنخداں کے خال میں
آزردہ مجھ گدا سے ہے وہ بادشاہِ حسن بوسہ گیا تھا منھ سے نکل کل سوال میں
مجنوں ذرا تو اُٹھ کے تماشا تو اس کا دیکھ صوتِ حدی پہ ناقۂ لیلیٰ ہے حال میں
ہر دم میں عشقِ موکمراں سے کروں ہوں منع
پر مصحفی کے کچھ نہیں آتا خیال میں

209

سیں میں نے گو کہ اپنے گریباں کی دھجیاں کانٹوں سے کیونکہ مانگوں میں داماں کی دھجیاں
قسمت میں اس کی برہنہ پائی لکھی تھی حیف گو پائے قیس اور یہ بیاباں کی دھجیاں
مسّی لگا کے بعد اٹھا رکھتے ہیں ہمیں پونچھی ہوئی ترے لب و دنداں کی دھجیاں

اک پان[1] چار تیر میں اس شست صاف کی　　اُڑنے لگیں کمان کے میداں کی دھجیاں
دستارِ سرخ کی سرِ پُرخار کو عطا　　مجنوں نے کر کے دامن افشاں کی دھجیاں
آگے ترے جمال کے، اے ماہ چار دہ　　اُڑتی ہیں جوں کتاں مہِ تاباں کی دھجیاں
کچھ بڑھ چلی تھی مجھ سے وہ، میں نے بھی مصحفی
لیں خوب اس کی زلفِ پریشاں کی دھجیاں

210

سورج کے رُخ پہ کیونکہ نظر کی ہے کیا کہوں　　شب کن خرابیوں سے سحر کی ہے کیا کہوں
مو کہہ سکوں جسے نہ رگِ گل ہزار حیف　　مدّ نظر میں ایسی کمر کی ہے کیا کہوں
حلقے میں نتھ کے چنّی جو ہے موتیوں کے بیچ　　یہ بوند کس کے خون جگر کی ہے کیا کہوں
نخلِ خیالِ خام مرا خشک ہوگیا　　اس پر امید پختہ ثمر کی ہے کیا کہوں
اترا تھا آ کے کل ترے کوچے میں مصحفی
تیاری آج اس کے سفر کی ہے کیا کہوں

211

اس شوخ کی خاطر ہے مری سخت حزیں جان　　یارب اسی سودے میں نکل جاوے کہیں جان
ہاں اے ملک الموت مرا قصد نہ کیجیو　　جیتوں میں نہیں میں تو، مجھے زیر زمیں جان
ٹک جھانک کے تو دیکھ تو دیوار کے نیچے　　دیتا ہے کوئی اے صنم غرفہ نشیں جان
کم فرصتیِ عمر سے واقف ہے تو ناداں　　ہر ایک نفس کو نفسِ باز پسیں جان
ٹک اس کی عیادت تو کبھی جا کے تو کرتا　　اب کچھ ترے بیمارِ محبت میں نہیں جان
کہتا ہے یہی آئینے میں تجھ سے ترا عکس　　میں تجھ کو حسیں جانوں ہوں تو مجھ کو حسیں جان
اک دم اسے آرام نہیں سینے میں میرے　　جس دن سے گیا نالہ رہِ عرش بریں جان
بے وجہ نہیں اِس کا دِلا منھ نہ دکھانا　　صیاد تغافل کو تو ہردم بہ کمیں جان

1۔ ج　پانچ چار

اعجاز یہ صانع نے تری شکل میں رکھا ۔۔۔ دیتی ہے وہ مُر دے کے تئیں صورتِ چیں جان
عاشق ہے تو رکھ بر جگر سوختہ دنداں ۔۔۔ پھر ذائقے میں اس کو کبابِ نمکیں جان
روپوشی تری یہ ہے تو اک دن ترے در پر ۔۔۔ دیوے گا کوئی جان کو اپنی یہ یقیں جان
رسوائی الفت نہیں مٹنے کی کسی طرح ۔۔۔ عاشق ہے تو اس کو رقم لوحِ جبیں جان
گر ہوش ہے کچھ تجھ میں تو کر مُہر زباں پر ۔۔۔ یعنی کہ اسے رازِ محبت کا امیں جان
تو غیر کے گھر شب گیا پردے میں کسی کے ۔۔۔ ایسا تو بھلا وا بھی نہ دو میری تئیں جان
ہیں مہر کے اطوار بھلا کون سے ان میں ۔۔۔ دن رات ستاروں کے تئیں بر سر کیں جان

اے مصحفی وہ شوخ ہے ہر چند کہ کم رو[1]
تو مجلسِ خوباں کا اسے صدر نشیں جان

212

زیرِ نقاب آب گوں ہائے رے ان کی جالیاں ۔۔۔ ہم کو تو بس ڈبو گئیں نیل[2] کے کٹرے والیاں
تیغ جو رکھی سان پر، سدھ جو سنبھالی اس نے ٹک ۔۔۔ وضعیں نئی تراشیاں، طرزیں نئی نکالیاں
ہم پہ تو برسے صبح تک خنجر و تیغ و تیر ہی ۔۔۔ ابر بلا سے کم نہیں ہجر کی راتیں کالیاں
شعلے کی جوں مدد کرے دودِ نخست[3] خار و خس ۔۔۔ مسّی سے اور دھواں ہوئیں ہونٹوں کی اس کی لالیاں
مو کمر ان باغِ حسن لچکیں جو مثلِ شاخِ بید ۔۔۔ دل کو نہ کیوں ہلا دیں پھر ان کی یہ نونہالیاں
اک شررِ آہ کا مری باعثِ شور و شر ہوا ۔۔۔ جگنو کو دیکھ جس طرح لڑکے بجاویں تالیاں
صاحبِ نعمت اس طرح رہتے ہیں سب سے سر خرو ۔۔۔ سوے زمیں جھکی رہیں میوے کی جیسے ڈالیاں
کس سے پڑھاوے کوئی خط انشا ہی جس کا ہو غلط ۔۔۔ یعنی کہ اس نے بے نقط بھیجی ہیں لکھ کے گالیاں
کنجِ قفس میں باغ سے آئے تھے جو نئے اسیر ۔۔۔ صوتیں انھوں کی ساری رات میرے جگر میں سالیاں

1۔ کم رو = بدشکل 2۔ نیل کا کٹرا = دہلی چاندنی چوک کا ایک محلہ جہاں بازارِ حسن واقع تھا
3۔ نخست = پہلا

مصحفی اس کی بزم میں بھوکے ہیں ناز کے جو لوگ
گالیوں کی جگہ انھوں ملتی ہیں کیا سہالیاں[1]

213

دیکھے ہے دورِ چرخ جب آرام میں ہمیں — دیتا ہے زہر سو وہ ملا جام میں ہمیں
دن رات فکر شعر ہے یا ذکر روے خوش — کیا جانیے رکھا ہے یہ کس کام میں ہمیں
صیاد نے پھر آکے خبر بھی نہ لی دریغ — کر کے اسیر چھوڑ گیا دام میں ہمیں
بھولیں نہ واں بھی صبح بنا گوش کی بہار — لے جاوے گر یہ بختِ سیہ شام میں ہمیں
ٹھہرے وہاں جو دیر تو بس شام ہو گئی — سودائے خام زلف سیہ فام میں ہمیں
ہر عضو دل فریب ہے کس کے تئیں کہیں — یہ جا پسند ہے ترے اندام میں ہمیں
اغلب کہ بوسۂ حوراں میں وہ نہ ہو — لذت ملے ہے جو تری دشنام میں ہمیں
آتے ہی اس گلی میں جو مستی سی آگئی — لغزش ہوئی قدم کے ہر اک گام میں ہمیں

ہم مصحفی بہ کفر تو مشہور ہو چکے
آنا قبول اب نہیں اسلام میں ہمیں

214

ٹھکرا کے چل بتوں کو نہ اے دل کنشت میں — کاہے کو مارتا ہے تو لاتیں بہشت میں
دیکھا جو چاک کر کے اسے میرے بعدِ مرگ — داغِ فراق تھا دلِ حرماں سرشت میں
اک دن یہ کاسۂ سرِ بوسیدہ نے کہا — یعنی یہ کچھ لکھا تھا مری سرنوشت میں
کیا وے بھی دن تھے خوب کہ پھرتے تھے ہم اسیر — مثلِ نسیم سبزہ[2] و گلزار و کشت میں
موسیٰ نے کوہِ طور پہ دیکھا جو کچھ وہی — آتا ہے عارفوں کو نظر سنگ و خشت میں
دامن کشی کو ہاتھ بڑھایا تو تھا و لے — ہم رہ گئے شب اس بتِ کافر کی ہشت میں
کر جیتے جی تو لولی[3] دنیا سے دل جدا — اچھا نہیں کہ دھیان رہے اس پلشت[4] میں

1۔سہالی = میٹھی روٹی 2۔ ج :سبزہ و بازار (صریحاً غلط) 3۔ لولی = فاحشہ، کوچہ گرعورت 4۔پلشت =پلید

یکساں ہے نیک و بد سے دلِ صافِ مصحفی
اس آئینے کو فرق نہیں خوب و زشت میں

215

رکھتی ہے صبا پانو جو مستانہ چمن میں کس گل نے دیا ہے اسے پیمانہ چمن میں
شبنم کی صفا کا ہے یہ عالم کہ میں دیکھا ہر قطرہ بہ از گوہر یک دانہ چمن میں
گوندھے جو صبا جعد کو سنبل کی کھجوری زنجیر گسل[1] کیوں نہ ہو دیوانہ چمن میں
کس نورِ مقدّس کی وہاں شمع ہے روشن جانے نہیں پاتا ہے جو پروانہ چمن میں
انگشت حنائی کی تری شمع پہ گلبرگ ہیں چرخ زناں صورتِ پروانہ چمن میں
ہر نخل نے گیندے کے کیا جنگ کا ساماں گلبازی کو آیا جو وہ طفلانہ چمن میں
لیلیٰ کا تصوّر اسے بہتر ہے چمن سے کیا جا کے کرے ساکنِ ویرانہ چمن میں
مشاطہ کی طاقت ہے اسے ہاتھ لگاوے جس جعد کا ہو پنجۂ گل[2] شانہ چمن میں

اے مصحفی افسوس کہ ہم صحبتِ گل سے
محروم ہیں جوں سبزۂ بیگانہ چمن میں

216

مژگاں نے کس کی پھینکے ہیں یہ تیر آب میں جو عکسِ مہ ہے صورتِ کف گیر آب میں
جاتا ہے نالہ اپنے کسوں[3] پر چڑھا ہوا ٹوٹی ہے شیر مست کی زنجیر آب میں
دریا کی تہ سے دوڑیں ہیں ساحل کو مچھلیاں دھوئی تھی کس نے سرخیِ شمشیر آب میں
کیا پوچھتا ہے اپنے تو غرقے کی سرگزشت خود وا ہیں موج کی لبِ تقریر آب میں
شانِ صفا تو دیکھ کہ اس ارتفاع پر ہے قصرِ آسمان کی تعمیر آب میں
حیراں رہا ز بس کہ فلاطوں سوائے خم سوجھی کچھ اس کو اور نہ تدبیر آب میں
چھاتی پہ بحر کی ہیں پھپھولے حباب کے ہے کس کے سوزِ دل کی یہ تاثیر آب میں

1۔ زنجیر گسل = زنجیر شکن 2۔ج : غنچۂ گل 3۔ کسوں پر = زور میں

آہن دلوں کو سیلِ حوادث سے ڈر نہیں ویراں نہ ہوئے خانۂ زنجیر آب میں
بہر تلاشِ گوہرِ مقصود مصحفی
پھر غوطہ زن ہے خامۂ تحریر آب میں

217

کھولی ہے کس نے زلفِ گرہ گیر آب میں ہے بے قرار موج کی زنجیر آب میں
اہلِ صفا ہیں دشمنِ نقش و نگارِ حسن جاتی رہے ہے رونق تصویر آب میں
گر سیلِ اشک اپنا مقابل ہو بحر کے دے موج کا مٹا خطِ تقدیر آب میں
جو غرقہ یاں سراب سے کھینچے ہے جوں حباب دیتی ہے پھر بٹھا اسے تقدیر آب میں
ہنگامِ گریہ مجھ پہ نہ کیوں مہرباں ہو یار ہر اک مژہ ہے یاں خطِ تسخیر[1] آب میں
کس وقت جوشِ گریۂ خونیں نہیں ہے یاں آتش کو دل کی رکھتی ہے تقدیر آب میں
کچھ کل سے بیقراریِ دریا فزوں ہے آج تڑپے ہے کس کے تیر کا نخچیر آب میں
کشتی مری گراں ہے، بہت مجھ کو ہے یہ ڈر لنگر کے ساتھ ہو نہ زمیں گیر آب میں
عکسِ بتانِ ہند کی جمنا میں سیر کر پیدا ہے سومنات کی تعمیر آب میں
طوفان گریہ اپنا جو یہ ہے تو مصحفی
بہتا پھرے گا دفترِ تدبیر آب میں

218

لیلیٰ سے کی تھیں قیس نے کس دن عدولیاں[2] جو تشنہ اس کے خوں کی ہیں کانٹوں کی سولیاں
سبزے کے بیچ آئیں نظر مجھ کو ناگنیں زلفیں جو اس کے روئے مخطط[3] پہ جھولیاں
پائے جنونِ عشق ہے اب عزلت آشنا پھرتا تھا جن میں اس نے وہ گلیاں ہی بھولیاں
تجھ بن شبِ فراق میں بے درد کیا کہوں جو تھتیاں[4] کہ مجھ پہ گھٹاؤں نے ہولیاں[5]

1۔ ج خطِ تقدیر (صریحاً غلط) 2۔ عدولی = حکم عدولی، روگردانی 3۔ روئے مخطط = چہرہ جس پر خط آچکا ہو 4۔ تھتیاں = انبار 5۔ ہولنا = حملہ آور ہونا

غماز کو جو میں نے کیا رات در بہ گیر　　جو جو کہی تھیں اس نے وہ باتیں قبولیاں
سرسبز تو رہے کہ ترا کشتہ کر کے دفن　　لوگ آئے واں سے ہاتھ میں لے لے کے مولیاں
عاشق کے اشکِ سرخ سے اے نو بہارِ حسن　　کیا کیا نہ کیاریاں ترے کوچے میں پھولیاں

شعر و سخن کا مرتبہ ہے دور مصحفی
تجھ کو میاں روا نہیں اتنی فضولیاں

219

دیکھی ہیں انگلیاں جو تری گوری گوریاں　　کتنوں کی تیغِ رشک سے کٹتی ہیں پوریاں
دستِ جنوں نے تار گریباں کیے ہیں جمع　　بٹنے[1] کو اس پری کے چھپر کھٹ کی ڈوریاں
بہتی ہیں اس طرح مری آنکھیں کہ اہلِ شہر　　جوں کھول دیویں موسمِ باراں میں موریاں
ناز و ادا و عشوہ یہ عیار ہیں سبھی　　ہوتی ہیں دن کو کشورِ خوباں میں چوریاں
ہو جب تلک کہ صبح یہی مشغلہ رہے　　ساقی تو مے پلا مجھے بھر بھر سکوریاں
سلطانِ عشق کا نہیں ہوتا دماغ ساز　　با آنکہ بدلی جاتی ہیں ہر دم کٹوریاں
پھرتا ہے کس گرسنہ کی یا رب تلاش میں　　خورشید و مہ کی چرخ رکھے سر پہ غوریاں[2]
مت نعلِ داغِ دل کو لگا ہاتھ تو کہ یاں　　کیا کیا جواں کہ کر نہ گئے سینہ زوریاں

کیں سب وہ اس نے وصفِ خط و خال میں سیاہ
تھیں مصحفی کے پاس بیاضیں جو کوریاں

220

گیسو کی تیرے چین کو دیکھیں جو چینیاں　　خود نقش چین کرنے لگیں نکتہ چینیاں
مجھ کو یقین ہے کہ ترے عہدِ حسن میں　　ہوویں گی زاہدوں سے نہ عزلت گزینیاں
صورت کو تیری زہرہ جبیں ہم نے دیکھ کر　　دیکھیں نہ مہر و ماہ کی روشن جبینیاں
عکس آئینے میں آنکھیں لڑانے لگا وونہی　　دیکھیں جو چشمِ یار کی ناز آفرینیاں

1۔ ج : بٹنے کو اس پلنگ کے جھلیوں کی ڈوریاں　　2۔ غوری = سالن کھانے کا کنگورے دار پھیلا ہوا اور کم گہرا کٹورے نما برتن

کو، آدم و فرشتہ کجا یہ مجال ہے ہوں آسمانیوں کے برابر زمینیاں
کرسی پہ اہلِ جاہ جو بیٹھیں تو ڈر نہیں ہیں خاص انہی کے واسطے بالا نشینیاں
آخر قضا سے کچھ نہ گئی پیش ایک کی کیا کیا خرد وروں نے نہ کیں دور بینیاں
کلکِ خیال تیز ہے تیرا تو مصحفی
اب دوسری غزل میں دکھا کارچینیاں

221

آئیں پسند ہم کو تو عزلت گزینیاں گر ہمدموں کے ساتھ نہ ہوں ہم نشینیاں
ان انگلیوں کو فندقِ آتش ہوئی نصیب جن انگلیوں سے کی تھیں کبھی لالہ چینیاں
اس مست کی گزک کے لیے بزم میں مدام رہتی ہیں مہر و ماہ کی حاضر دو سینیاں
ابرو میں بل وہی، وہی ماتھا چڑھا ہوا ویسا ہی غصہ اور وہی گرم کینیاں
مجلس سے دور ہم کو بٹھاتے ہیں مدعی کیونکر اُٹھاوے ان کی کوئی بے قرینیاں
گر جانتے ہیں یہ میں سخن میں بزرگ ہوں پھر خورد مجھ پہ کرتے ہیں کیوں خوردہ بینیاں
کلیاں رخِ صبا پہ جو منھ کھولتی نہیں لالوں کو داغِ دل کو ملیں کیا امینیاں
دو تین عورتوں سے لگا دل تو مصحفی
قسمت سے ہم کو وہ بھی ملیں مت کی بہنیلیاں[1]

222

سمجھو نہ پیالیاں مے گلگوں کی پی لیاں مستوں کی اس کے آپ ہیں آنکھیں نشیلیاں
مرغِ اسیر پٹکے ہے سر گل کی یاد میں خوں سے قفس کی سرخ نہ ہوں کیونکہ تیلیاں
ہم کیوں نہ کودکانِ کلہ پوش پر مریں چبھتی ہیں دل میں ان کی ادائیں نکیلیاں
جانبر ہوں کیونکہ اس صنمِ دلفریب سے ویسی ہی ضد ہے اور وہی باتیں ہٹیلیاں
اپنی تو مارگیری گئی تھی وہاں نہ پیش شانے نے ناگنیں تری زلفوں کی لیلیاں

1۔ بہنیلیاں = سہیلیاں یا منھ بولی بہن

تونے ہوا بتائی انھیں بھی جنھوں نے شوخ کانپیں تری پتنگ کی اک عمر چھیلیاں
جی چاہے خاک اپنا بنارس کی سیر کو کھترانیاں وہاں کی ہیں رنگت میں پیلیاں
پریوں کا ساتھ دیکھ کے کوٹھے پہ وقتِ صبح بے اختیار اپنی نگاہیں ضفیلیاں
کیوں اس سے منھ پھراتے ہو تم مصحفی کے ساتھ
اک بوسے پر روا نہیں کرنا بخیلیاں

223

جس جعد کا ہو گوہر دلِ سنگ فلاخن پھر لعل کو سمجھے نہ وہ کیوں تنگِ فلاخن
کیا مزرعۂ ابر کا ہے رعد نگہباں بجلی کی کڑک میں ہے جو آہنگِ فلاخن
خط بھیجوں میں کیا طفلِ جفا کار کو ایسے جو سر کو کبوتر کے کرے سنگِ فلاخن
شب لعل جو دیکھا تری چوٹی کا چمکتا کیا کیا نہ ستاروں میں ہوئی جنگِ فلاخن
اس مزرعِ دنیا میں طیورانِ بہشتی کھا کھا کے موے سیکڑوں سر چنگِ فلاخن
شہباز کے پنجے میں پھنسا مرغِ دل اپنا پائے یہ اسیرِ قفسِ تنگِ فلاخن
بلبل کا گزر باغ میں کیا ہووے کہ ہر گل ڈالی پہ نظر آوے ہے ہم رنگِ فلاخن
اے مصحفی تیلی میں ہے گر سنگ کا نقشا
مژگاں بھی ہیں اس شوخ کی نیرنگِ[1] فلاخن

224

ہم وہ نہیں کہ عشق بے دردِ سر کریں اپنا ہی دم بھرے[2] جو پری پر نظر کریں
مشکل بڑی تو یہ ہے کہ گر چشم تر کریں آنسو ہمارے جاتے ہی اس کو خبر کریں
پھرتی ہے بے قرار یہ کس گل کے شوق میں ہم بھی تو ٹک سراغِ نسیمِ سحر کریں
یا رب کبھی تو یہ نفسِ سرد بھی مرے ہو گرم، دل میں سنگ دلوں کے اثر کریں
موجِ نسیم سلسلہ جنباں ہوئی ہے پھر سودائیانِ عشق کو جاویں خبر کریں

1۔ ج ۔ اورنگ 2۔ ج بھریں

وہ مرگئی تو فصلِ بہاراں میں باغباں گلشن سے دور کاش نہ بلبل کے پر کریں

جن پاس مصحفی رگِ گل کا قلم نہ ہو
کیونکر رقم نزاکت موے کمر کریں

225

گل کا گلہ نہ شکوۂ بادِ سحر کریں یک چند ہم اسیرِ قفس میں بسر کریں
تیرا تو دیکھنا ہمیں دشوار کچھ نہیں پر چاہیے یہ حال پر اپنے نظر کریں
خوبی یہ سر نوشت ہماری کی دیکھیو ہووے وہی رقیب جسے نامہ بر[1] کریں
نقشِ قدم کی طرح مٹا دیویں آپ کو قصہ ہی اپنا، چاہیے ہم مختصر کریں
تو نے تو خشک و تر کو اجارے میں لے لیا کچھ اپنا فکر ہم بھی تو اے چشمِ تر کریں
خوباں کو کچھ بناؤ کی حاجت نہیں یہ لوگ منظور ہو انھیں جو کسی دل میں گھر کریں
یک کوزہ آب ڈال کے سر پر بہ وقت غسل چاہیں تو بال بال کو سلکِ گہر کریں

کچھ مصحفی سے خوب نہیں یہ لڑائیاں
جانے دیں قصہ آپ بھی اب درگزر کریں

226

پکڑا گیا میں عشقِ بتاں کے گناہ میں نقصانِ مال و جاہ ہوا ان کی چاہ میں
اے رشکِ مہ کیا ترے اعجازِ حسن نے خورشید کو عیاں شبِ زلفِ سیاہ میں
ضبطِ نفس کروں ہوں ترے ڈر سے ورنہ میں چاہوں تو دو جہاں کو جلا دوں اک آہ میں
صحرا کے عاشقی کی ذرا سیر کر کہ واں اخگر چمک رہی ہے ہر اک برگِ کاہ میں
سنبل نے تیری زلف کی سبزے پہ کی نقاب سبزے نے خط کے گل کو چھپایا گیاہ میں
مارا ہے اک نگاہ سے جس نے مجھے وہ شوخ چاہے تو پھر بھی زندہ کرے اک نگاہ میں
یارو یہ دشت نجد کی منزل کہیں نہ ہو ناقہ جو چلتے چلتے گیا بیٹھ راہ میں

1۔ غالب: دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

دیوانہ ہے یہ کس گل رنگیں لباس کا
نکلے ہے شکلِ چاک گریباں جو ماہ میں

کہتا ہے کون اس کی تمامی، لگا ہے واں
جائے سنجاف ماہِ مقرض کلاہ میں

لاکھوں کھڑے ہیں منتظرِ یک نگاہِ لطف
ہنگامہ حشر کا ہے تری وعدہ گاہ میں

دولاب[1] چرخ سے ہے گلہ مجھ کو مصحفی
جس نے ڈبو دیا مہِ کنعاں کو چاہ میں

227

مژگاں کو تو دیکھ اس کی ہم تیر اسے کہتے ہیں
ابرو کو نظر کر ٹک شمشیر اسے کہتے ہیں

گوشِ شنوا ہو تو، حیراں تری صورت کے
گویا ہیں خموشی میں، تقریر اسے کہتے ہیں

نقشہ جو تصوّر کا اس گل کے کھنچا ہم سے
مانی کو دکھاویں گے تصویر اسے کہتے ہیں

نالوں کو مرے سن کر رونے لگا شب وہ بت
پتھر کو کیا پانی تاثیر اسے کہتے ہیں

تھی دشمنِ جاں کب کی یہ دل کی گرفتاری
ہم چھوٹے نہ جیتے جی، زنجیر اسے کہتے ہیں

شب وصل کے ہوتے ہی جی تن سے ہوا رخصت
طالع اسے کہتے ہیں، تقدیر اسے کہتے ہیں

مدّت سے ارادہ تھا اس در ہی پہ مر رہیے
سو آج ہوا حاصل تدبیر اسے کہتے ہیں

ہر چند شکست اس پر لاکھوں ہی پڑیں لیکن
ٹوٹا نہ یہ قصرِ دل تعمیر اسے کہتے ہیں

اک اور غزل بھی میں اے مصحفی لکھی ہے
تو اس کو اگر سمجھے تحریر اسے کہتے ہیں

228

بے زخم مجھے مارا شمشیر اسے کہتے ہیں
بے دام پھنسا رکھا زنجیر اسے کہتے ہیں

یہ جو کفِ قاتل میں شمشیرِ برہنہ ہے
ہم عاشقِ بسمل کی تقدیر اسے کہتے ہیں

قلبِ مسِ قلب اپنا ہو جس سے زرِ خالص
سو فہم وہ اپنا ہے اکسیر اسے کہتے ہیں

نے تیر لگا اس کے، نے تیغ کوئی آپ ہی
دل خوں میں تڑپتا ہے نخچیر اسے کہتے ہیں

1۔ دولاب = چرخ، رہٹ

باتوں میں لگا کر ہم ایسے بتِ وحشی کو کیا دام میں لائے ہیں تدبیر اسے کہتے ہیں
بوسے کی طلب پر تم بندے سے ہوئے ناخوش انصاف کرو صاحب تقصیر اسے کہتے ہیں
مر کر بھی نہ ہم چھوٹے زندانِ تغافل سے ہاں جرمِ محبت کی تعذیر اسے کہتے ہیں
صورت ترے مجنوں کی مانی نے جو کل دیکھی حیران رہا وہ بھی تصویر اسے کہتے ہیں
حسن اپنا دکھا وہ بت مانی کو لگا کہنے کھینچی ہے کبھی تو نے تصویر اسے کہتے ہیں
خامے کی جگہ ہم نے انگشت قلم کر کر خوں سے اسے خط لکھا تحریر اسے کہتے ہیں

اے مصحفی اس مہ کے اک تار نظر میں یاں
پابند ہیں سو وحشی تسخیر اسے کہتے ہیں

229

جو صورتیں تھیں صفا کی غبار میں آئیں کدورتیں بہت اس روزگار میں آئیں
جنوں کے ہاتھ سے جیب[1] اپنا یہ ہوا صد چاک کہ دھجیاں بھی نہ اس کی شمار میں آئیں
کیا شکار انھیں دزدِ حنا کی مچھلی نے جو مچھلیاں نہ کسی کے شکار میں آئیں
چمن سے سوئے قفس بہر بلبلاں صد بار ہوائیں آمدِ فصلِ بہار میں آئیں
نہ پوچھو ہم نفساں، کیا کہوں میں بعد از مرگ جو میرے ساتھ بلائیں مزار میں آئیں
شکستِ خانۂ زنجیر کے سبب مت پوچھ خرابیاں جو جنوں کے دیار میں آئیں
غرور و ناز نے ان کے پھکا دیا ہم کو وہ انگھڑیاں جو کسی دن خمار میں آئیں
شبِ وصال میں نازل ہوئیں وہ سر پہ مرے جو آفتیں نہ شبِ انتظار میں آئیں

میں محوِ حسن ہی اے مصحفی رہا، کس دن
مری نگاہیں مرے اختیار میں آئیں

230

آہ کس زلفِ پریشاں کا پریشاں ہوں میں کیوں کے سلجھے دلِ سودازدہ حیراں ہوں میں

1۔ ج : جب (غلط)

شعلہ کہتا ہے کوئی، برق کوئی، میرے تئیں ۔۔۔ بے قراری سے زبس دست و گریباں ہوں میں
اس قدر ظلم و ستم مجھ پہ روا کب رکھتا ۔۔۔ گر سمجھتا وہ بتِ شوخ کہ انساں ہوں میں
آہ کرتا ہے تو دانستہ تغافل پیارے ۔۔۔ ورنہ اب تک نگۂ لطف کے شایاں ہوں میں
بوس و آغوش کی صورت تو بنا بیٹھا ہے ۔۔۔ اتنی رخصت دے کہ اُٹھ کر ترے قرباں ہوں میں
باغباں، پنبہ بہ گوشی نہی اتنی بھی روا ۔۔۔ پسِ دیوارِ چمن دیر سے نالاں ہوں میں
سر کو زانوں سے اُٹھاؤں نہیں میرا مقدور ۔۔۔ کہ تصوّر کا ترے کشتۂ احساں ہوں میں
اے نسیم سحری، مجھ کو چمن سے نہ نکال ۔۔۔ جوں گلِ صبح ترا سلسلۂ جنباں ہوں میں
آشنا خندے سے ہونا نہیں قسمت میں مری ۔۔۔ لب افسوس کی صورت تہِ دنداں ہوں میں
نقشِ مجنوں یہی لیلیٰ سے سدا کہتا تھا ۔۔۔ ٹک ادھر دیکھ ترا عاشق بے جاں ہوں میں
دیکھ رفتار تری کبکِ دری کہتا ہے ۔۔۔ کیوں نہ عاشق ترا اے سروِ خراماں ہوں میں
پاس آنے کا میں انکار کیا کب تیرے ۔۔۔ کہ نگاہوں کا تری تابعِ فرماں ہوں میں
بادِ صرصر ہے مری دشمنِ جاں کیوں اتنی ۔۔۔ آسماں کا تو چراغِ تہِ داماں ہوں میں

جوں چراغِ سحری مجھ میں ہے اب کیا باقی
مصحفی سچ ہے کوئی دم ہی کا مہماں ہوں میں

231

اس تیغ کے ہیں زخم مرے تن میں ہزاروں ۔۔۔ جوں پھول کھلے ہوں کسی گلشن میں ہزاروں
تو دیکھے نہ دیکھے پہ ترے منتظروں کی ۔۔۔ گتھیاں ہیں نگاہیں ترے چلمن میں ہزاروں
مضمونِ فصیحانِ چمن گر کوئی سمجھے ۔۔۔ ہیں رمز کی باتیں گل و سوسن میں ہزاروں
واں پھولوں کی پتی کا بناتا ہے وہ گل ہار ۔۔۔ یاں لختِ جگر ہیں سرِ سوزن میں ہزاروں
کانٹوں سے رفو کیا ہوں کہ دیوانے کے تیرے ۔۔۔ دریا کی طرح چاک ہیں دامن میں ہزاروں
کب سیر کو آتا ہے کوئی ان کے چمن سے ۔۔۔ گو پھول کھلے ہیں مرے مدفن میں ہزاروں

گر سنگ کے تختے کو کوئی کھول کے دیکھے — آہیں بھی گڑی ہیں مرے مدفن میں ہزاروں

اے مصحفی کشتہ ہوں میں کس رشکِ پری کا
آتی ہیں جو حوریں مرے شیون میں ہزاروں

232

اک مشت استخواں کے سوا مجھ میں کچھ نہیں — یعنی بجز غذائے ہُما مجھ میں کچھ نہیں

گو جوں حباب ہوں لبِ دریا پہ چرخ[1] زن — ظاہر ہے یہ کہ غیر ہوا مجھ میں کچھ نہیں

کیا میری مشتِ خاک کو دیتی ہے دردِ سر — چل[2] دور بھی ہو بادِ صبا مجھ میں کچھ نہیں

ریگِ رواں کا قافلے میں خاکسار ہوں — فریاد و شور و رنگ و درا مجھ میں کچھ نہیں

میرا لہو تو تو نے پیا باز آ کہیں — باقی بس[3] اے فراق ذرا مجھ میں کچھ نہیں

طاقت تو جا چکی ہے تنِ زار کی مرے
جز نام مصحفی کے رہا مجھ میں کچھ نہیں

و

233

غم سے دل کی مرے کونپل نہ جلے خشک تو ہو — آہ سے نالے کے نرسل[4] نہ جلے خشک تو ہو

وقتِ نظارہ ترے اے مہِ خورشید جمال — نگہِ دیدۂ احول نہ جلے خشک تو ہو

اشکِ پروانہ نے تر اس کو کیا ہے اے شمع، — تجھ سے فانوس کا آنچل نہ جلے خشک تو ہو

گزریں[5] برسات میں واں سے جو ہم آتش نفساں — کوچۂ یار کی دلدل نہ جلے خشک تو ہو

آتشِ رنگِ حنا سے ترے اے غیرتِ گل، — زیرِ پا سبزے کا مخمل نہ جلے خشک تو ہو

سفرِ کعبہ ہے درپیش اسے، زاہد کی — تابِ خورشید سے چھاگل نہ جلے خشک تو ہو

1۔ ج : موج زن 2۔ ج : چل دور ہو بھی 3۔ ج : باقی بس اب تو رنگِ حنا
4۔ نرسل = سرکنڈا 5۔ ج : گزرے

برقِ آہِ شرر افشاں سے تری، اے مجنوں، وادیِ نجد کا جنگل نہ جلے خشک تو ہو
خونِ گرم اپنا اگر اس میں کرے شعلہ زنی کشتگاں کا ترے مقتل نہ جلے خشک تو ہو
وصل کی شب ہے یہ اے مصحفی کر کچھ تو بخور[1]
عود غرقی سر مقتل نہ جلے خشک تو ہو

234

یہ کہاں اشک میں پانی کہ گریباں تر ہو یہ بھی بس ہے کہ ذرا دامنِ مژگاں تر ہو
وہی مقتول ہے ناجی ترے کشتوں میں میاں جس کے غم میں مژۂ گبر و مسلماں تر ہو
دمِ شمشیر کو سرخی نہ جہاں ہاتھ آوے خوں سے اس کشتے کے دشوار ہے پیکاں تر ہو
موم جامے میں مرے خط کو تو رکھنا قاصد دن ہیں برسات کے ایسا نہ ہو عنواں تر ہو
اشک[2] نے میرے تفِ دل پہ تو پانی چھڑکا کاش سینے کی بھی اب آتشِ سوزاں تر ہو
سیرِ گلشن کو تو اس شدّتِ گرما میں نہ جا تا عرق سے نہ ترا سیبِ زنخداں تر ہو
برگِ گل دیکھ لیں ہم تیری بھی سیرابی کو مے لعلیں سے جو لعلِ لب جاناں تر ہو
اے سحابِ کرم اس میں ہے ترا کیا نقصاں تیری دولت سے اگر کشتِ غریباں تر ہو
ناقہ جاتا ہے طرف نجد کی اے ابر بھلا وادیِ نجد کا ٹک آج تو میداں تر ہو
عیدِ قرباں کے چلے آتے ہیں دن، عاشق کا یہ بھی نزدیک ہے لوہو سے گریباں تر ہو
مصحفی کھولے وہ کیا زخمِ کہن سے پٹی
جس کا ناسور سدا موسمِ باراں تر ہو

235

ہم تلک آؤ اب اتنی نہیں فرصت تم کو ہوگئی غیر سے شاید کہ محبت تم کو
میرے کینے پہ کمر باندھی ہے جو اتنی آہ نہیں معلوم کہ ہے کس کی حمایت تم کو
غم مجھے یہ ہے کہ اس دوستی و الفت پر دوست اپنا نہیں پاتا کسی صورت تم کو

1۔ بخور کرنا = دھونی دینا 2۔ ج: آہ شعلے پہ تو

ہم کو کیا ان کو مبارک ہو کہوں کا آنا ساتھ لے جاویں گے جو بہرِ زیارت تم کو
جس طرح رنج واذیت میں مجھے رکھتی ہے کاش اس طرح ستاوے شبِ فرقت تم کو
چھین کر دیویں[1] مجھے آپ کی بے پروائی اور عوض اس کے میں سونپیں مری حالت تم کو
بس نہ پوچھو مرے احوال کو جاؤ صاحب سچ کہوں گا تو ابھی آوے گی رقت تم کو
ایسے ہی آہوے وحشی کے ہوئے وارفتہ
کیوں نہ ہو جاوے میاں مصحفی وحشت تم کو

236

آتا[2] ہے طپانچوں کو سجے آن تو دیکھو ہے دشمنِ جاں خلق کا انسان تو دیکھو
کج باز مجھے کہتے ہو تم رُخ پہ ٹک اپنے گاہے کجیِ زلف پریشان تو دیکھو
ہر تار کو پیوند ہے اک چاکِ جگر سے دیوانے کا تم اپنے گریبان تو دیکھو
کیا خاک کے پتلے کو جلاوے ہے بخوبی خالق کا غریبوں پہ ٹک احسان تو دیکھو
تم مقتلِ عشاق سے آتے ہو صریحاً انکار عبث ہے زہِ داماں تو دیکھو
نامہ میں اسے جھاڑو کی سینکوں سے لکھا ہے شوریدوں کے خط لکھنے کا عنوان تو دیکھو
کیا دیدۂ حیراں پہ مرے غور کرو ہو اپنی بھی ذرا نرگسِ فتّان تو دیکھو
تلوار میں کھا کر کے لیا بوسہ تو بولا کم بخت کے اس وقت میں اوسان تو دیکھو
عارض کہے یہ خط ہے مرا سیر کے قابل غبغب کہے یہ خال زنخدان تو دیکھو
جو جادہ ہے وہ چاکِ گریبان کفن ہے منزل گہہ یارانِ بیابان تو دیکھو
شک رکھتے ہو کیوں آہ مری خستہ دلی میں ٹک لوہو بھرے تیروں کے پیکان تو دیکھو
عاشق مجھے بتلاتے ہیں وہ اور کسی کا بہتان سا بہتان ہے بہتان تو دیکھو

1۔ ج : دیویں ہمیں 2۔ ج میں مطلع اس طرح ہے: جی سے نہیں جاتی ہے کبھی آن تو دیکھو
داخل ہوئی ہے شان میں اک شان تو دیکھو

بالیں پہ وہ بیٹھا ہے ذرا کھول دو آنکھیں
میاں مصحفی تم اس کو کوئی آن تو دیکھو

237

اک روگ سا رہتا ہے لگا نت مرے جی کو　　کیا جانیے کیا لاگ ہے مجھ ساتھ کسی کو
فندق ترے ہاتھوں کی بلا شوخ ہے کافر　　جو پیسے ہی ڈالے ہے وہ لالے کی کلی کو
وہ شوخ ہے انسانوں میں تو نور کا بکّا　　نسبت ہے ترے حسن سے کیا حسنِ پری کو
اغوائے[1] حریفاں سے وہ ناچار ہے ورنہ　　چاہے ہے حیا کب مری آزردہ دلی کو
دل شاد بھی ہوتا ہے تو ڈر سے تری خو کے　　کرتا ہوں میں ہونٹوں ہی میں ضبط اپنی ہنسی کو
تو بھی نہ رکا اس سے وہ لب خندۂ پنہاں　　گو شرم سے کافر نے کیا ضبط ہنسی کو
اے سیرِ چمن تجھ سے میں شرمندہ ہوا ہاے　　پانو اپنے تو جاتے ہیں چلے اس کی گلی کو
دل خوش تو کیا تھا بتِ کافر نے مرا لیک　　چاہا نہ زمانے نے مرے دل کی خوشی کو

اے مصحفی اس بت کا ہوا جب سے میں عاشق
اک عمر اُٹھایا الم کم نگہی کو

238

اتنے ہی میں دنیا سے گزر کر گئے ہم تو　　ٹک آنکھ دکھاتے ہی ترے مر گئے ہم تو
تا کھول لیں نامے کے تئیں اس کے پروں سے　　دوڑے ہوئے دنبالِ کبوتر گئے ہم تو
اس مہ کو کبھی ہم نے سرِ بام نہ دیکھا　　راتوں کو بھی اس کوچے میں اکثر گئے ہم تو
وہ جعد کچھ اینٹھی ہی رہی گرچہ کئی بار　　دنبالِ خیالِ دل ابتر گئے ہم تو
ہر چند ہوا کُنجِ لحد خواب گہ اپنا　　پر کوچۂ ہستی سے نہ باہر گئے ہم تو
تو نے نہ کیا یاد کبھی اس پہ بھی افسوس　　بے درد، ترے ہجر میں مر مر گئے ہم تو
اس شاخِ گلِ تازہ تک آئین ادب سے　　جوں بید لیے ہاتھوں میں خنجر گئے ہم تو

1۔ اغوا = بہکانا

قصات ہیں منصور کے منصور سے پوچھو سو گام رہِ عشق میں بے سر گئے ہم تو
کرنے کو سلام آئے تھے پر ہاتھ نہ اُٹھا کچھ بھوں کے چڑھاتے ہی تری ڈر گئے ہم تو
آنسو نے کمی کی تو لہو اس میں چوایا پیمانۂ عمر اپنے کو یوں بھر گئے ہم تو
اے مصحفی چھوٹے جو پسِ عمر قفس سے
گلشن کی طرف صورتِ صرصر گئے ہم تو

239

یا دل کی بے کلی سے دل آرام رام ہو یا اس شبِ فراق کا قصہ تمام ہو
دیکھے جو تیرے حسن کا عالم تو اے صنم سو جان و دل سے یوسفِ مصری غلام ہو
نے عشق دیوے چین مجھے اور نہ اس کو حسن میں کوتہی کروں تو ادھر سے پیام ہو
رنگِ کفک سے ٹپکے ہے خوں اس کے ہر قدم کیونکہ نہ کوئی کشتۂ طرزِ خرام ہو
اے جسمِ ناتواں، جو تو پہنچے قریبِ گور دو دو قدم پہ چاہیے تیرا مقام ہو
اس زلفِ تابدار کا کیا وصف کیجیے ہر حلقہ جس کا طائرِ سدرہ کا دام ہو
اے آسماں تو اس کا دماغِ غرور دیکھ نالے کا جس کے عرشِ معلیٰ مقام ہو
بیٹھے ہیں کب سے منتظرِ یک نگاہِ[1] شوق آوے تو بام پر تو ہمارا سلام ہو
پروانہ وش چراغ کا جویا ہے مصحفی
یا رب کہیں یہ روزِ مصیبت کا شام ہو

240

خاک میں مل رہے ہم، ہم سے نہ تم ہنسا کرو جاؤ کسی کو ڈھونڈ لو اور ہی آشنا کرو
ہم ہیں اسیرِ صد بلا، فائدہ اس میں تم کو کیا ہاتھوں کی کھول کر حنا فصدِ شکستِ پا کرو
اپنی جگہ میں شب انھیں کرنے لگا نصیحتیں سن کے یہ ناز سے کہا پھیر کے منہ "بکا کرو"

1۔ ج : نگاہِ لطف

گر وہ جفا کرے کرے، مصحفی تم کو چاہیے
جب تئیں دم میں دم رہے اس سے وہی وفا کرو

241

جانے دو مجھے بر سرِ تقریر نہ لاؤ
نزدیک مرے خامۂ تحریر نہ لاؤ

دیکھا جو تڑپتے مجھے بن زخم ہی خوں میں
یاروں سے یہ بولا مری شمشیر نہ لاؤ

اے طالع دوں! یوں جو کرو چاہو سو لیکن
تم میرے مقابل مری تقدیر نہ لاؤ

لیلیٰ نے کہا "دیکھ کے بھر آتی ہیں آنکھیں
مجنوں کی مرے سامنے تصویر نہ لاؤ"

جی میرا جلاؤ نہ تم اے شعلہ عذارو
نالے کو مرے بر سرِ تاثیر نہ لاؤ

بیٹھا جو مرے دل پہ تو یاروں سے یہ بولا
مت کھینچو کوئی واں سے مرا تیر نہ لاؤ

وہ آپ گرفتار ہے دامِ رگِ گلبن
بلبل کے لیے حلقۂ زنجیر نہ لاؤ

کیا فائدہ، سودا زدۂ عشق کے آگے
مذکور خمِ زلف گرہ گیر نہ لاؤ

جانے دو میاں مصحفی پس چپ ہی رہو تم
افسانہ مرا بر سرِ تفسیر نہ لاؤ

242

یہ زیبِ حسن ہے اسے بہرِ خدا نہ کھو
رو رو کے اپنی چشم کا تو توتیا[1] نہ کھو

چہرے کو اپنے دست زدِ ہر نگہ نہ کر
یہ تازہ گل ہے اس کی تو حسن و ضیا نہ کھو

کہنا بھی مان ہدیۂ[2] سنبل نہ کر اسے
تو اس کی بوے زلف کو بادِ صبا نہ کھو

مت میلِ استخوانِ شہیداں یاس کر
قدر اپنی، اپنی قوم میں تو اے ہُما نہ کھو

پہنچا کسی نزار تلک سب کو اے نسیم
موے گسستۂ خمِ زلفِ رسا نہ کھو

پیشِ نظر صحیفہ ترے گر نہ ہو نہ ہو
تو ہاتھ سے صحیفۂ دستِ دعا نہ کھو

جاتی ہے کوئی مرکبِ کشتی سے کج روی
اوقاتِ عمر اپنی[3] تو اے ناخدا نہ کھو

1۔ توتیا = سرمہ 2۔ ج : تحفۂ بلبل 3۔ج : اس پہ تو

خونِ شہیدِ ناز کو تو ہاتھ سے [1] نہ مل ظالم تو اس سے سرخیِ رنگِ حنا نہ کھو
صیّاد روے گل بھی دکھا عندلیب کو کُنجِ قفس میں جانِ اسیرِ بلا نہ کھو
ہووے گی طے نہ عشق کی منزل تو مصحفی
اس راہ میں تو آپ کو جوں نقشِ پا نہ کھو

243

اس بات کا کیا غم ہے جو بسمل کا بُرا ہو یا رب نہ کف و بازوے قاتل کا بُرا ہو
سب پہنچے ولے قافلۂ ہم نفساں سے ہم دور رہے دوریِ منزل کا برا ہو
رستہ وہ جو تھا نجد کا چھوڑا اسے بائیں کیا ظلم کیا رہبرِ محمل کا بُرا ہو
عکسِ رخِ معشوق کو زنجیروں میں جکڑا دریا تری لہروں کے سلاسل کا برا ہو
پا بوسی کرے پاے حنائی کی وہ تیرے ہوتے مرے لب کے لبِ ساحل کا برا ہو
پھر فتنۂ خوابیدۂ الفت کو جگایا کیا کام کیا یہ طپشِ دل کا بُرا ہو
گو کاسہ فلک اس کا کرے سنگ سے ٹکڑے ہرگز درِ لیلیٰ کے نہ سائل کا بُرا ہو
وہ کام کراے مصحفی اب تو بھی کہ جس میں
دل تجھ سے نہ اس حورِ شمائل کا بُرا ہو

ہ

244

کہتا نہیں کہ یار کے داماں سے دور رہ دستِ جنوں تو میرے گریباں سے دور رہ
گر ہم اسیرِ کُنجِ قفس ہیں تو تجھ کو کیا اے مرغِ نالہ تو نہ گلستاں سے دور رہ
رنگینیِ مزاجِ محبت نہ فاش ہو یک چند اشکِ خوں بنِ مژگاں سے دور رہ
بے صبری [2] اس قدر بھی نہیں خوب اے نگاہ دو چار دن تو تو رُخِ جاناں سے دور رہ

1۔ج : یوں 2۔ ج بے صبری میری فاش نہ کر اس پہ، اے نگاہ

حرماں نصیب روزِ ازل ہے یہ دل مرا کیونکہ اسے کہوں کہ تو حرماں سے دور رہ
جانا ہی اس کے کوچے میں ہرگز بھلا نہیں کب تک کوئی سنے لبِ درباں سے "دور رہ"
یوں پاس بیٹھ ان کے و لے دل سے مصحفی
آزاد ہے تو گبر و مسلماں سے دور رہ

245

اے داد خواہ ٹک درِ سلطاں سے دور رہ جاے ادب ہے منظرِ شاہاں سے دور رہ
اس کو شفق نہ جان تو اے دامنِ فلک یہ بد بلا ہے، خونِ شہیداں سے دور رہ
دامن کو گرد ہو کے بس اس کے لگے نہ جا قمری تو میرے سروِ[1] خراماں سے دور رہ
نافر ہے جیسے صاحبِ اسلام گبر سے ہے دل میں گبر کے تو مسلماں سے دور رہ
محمل نشیں کا پردۂ محمل نہ چاک ہو ناقے کو ٹک کہو کہ مغیلاں سے دور رہ
رنگِ سپید میں ترے آجائے گا خلل اے صبح[2] تو مری شبِ ہجراں سے دور رہ
فوارے خوں کے چھوٹے ہیں ہر موے تن سے یاں قاتل تو اپنے زخمیِ پیکاں سے دور رہ
جانِ بلب رسیدہ وہ وعدے سے گر ٹلا[3] تو تو نہ اپنے وعدہ و پیماں سے دور رہ
میں وہ پتنگ ہوں کہ جسے یاس نے کہا ناچیز ہے تو شمعِ شبستاں سے دور رہ
اے داغِ عشق تجھ کو نہ لگ جائے اور داغ مت پاس آ مرے، دلِ سوزاں سے دور رہ
مت پانو رکھ تو مجلسِ خوباں میں مصحفی
پروانۂ ضعیف چراغاں سے دور رہ

246

شب کا جاگا ہوا آیا وہ خمار آلودہ لب بخوں تشنہ و رخسار بہار آلودہ
آتشِ عشق زبس دل میں نہاں تھی دمِ مرگ منھ سے نکلا نفسِ سرد شرر آلودہ
اس کے پاسنگ میں تلتی نہیں پھولوں کی چھڑی ان دنوں مدِّ نفس ہے یہ شرار آلودہ
مان کہنا کہ بُری ہوتی ہے یہ تہمتِ عشق خونِ بلبل سے رگِ گل کے ہوں تار آلودہ

1۔ ج : سروِ چراغاں 2۔ج :ظلمتِ شبِ ہجراں 3۔ج :جب ٹلا

سر کو ٹکرا گئے سب یار مری تربت سے خوں سے کس کس کے نہیں سنگِ مزار آلودہ
خاکساروں کا ترے نالہ جو سر کھینچے ہے دامنِ چرخ کو کرتا ہے غبار آلودہ
مصحفی اور غزل ایسی تو اب لکھ رنگیں
جس کے ہر شعر سے ہو صفحہ بہار آلودہ

247

گو مرے خون سے ہو دامنِ یار آلودہ دست و خنجر تو نہ ہو اس کا غبار آلودہ
چشم سے قلزمِ خوں گرتے ہیں جب آوے ہے یاد موجِ رنگِ شفقِ دستِ نگار آلودہ
ایسے دل سوختہ کو دیجیے کیا مژدۂ وصل جس کا ہو ہر نفسِ گرم شرار آلودہ
زلف کا قصہ ہے یا ذکر ہے رخسارے کا ہم اسی کام میں ہیں لیل و نہار آلودہ
سمجھے کیا مجلسِ شادی کو وہ، بٹنے[1] سے کبھو جس کا ہرگز نہ ہوا ہووے عذار آلودہ
تیرہ بختی کو مری حسن دیا جس نے کہ ہیں چشمِ انجم بہ سوادِ شب تار آلودہ
جا کے یہ تربتِ فرہاد پہ روئی شیریں کہ سرشکوں سے کیا سنگِ مزار آلودہ
سر کو فتراک سے باندھا تھا یہ کس نے جو ترا دامنِ زین ہے با خونِ شکار آلودہ
قیس کے دیدۂ گریاں سے کوئی جا کے کہے ناقہ اس دشت سے جاتا ہے غبار آلودہ
مصحفی گر نہ لگے میرے قلم کی مضراب
نغمۂ تر سے نہ ہو دامنِ تار آلودہ

248

آیا وہ تلے تیغ کے جھٹ جس پہ پڑی آنکھ ویسی ہی بڑی ابرو تو ویسی ہی بڑی آنکھ
اک جنبشِ مژگاں میں ہوا شیشۂ دل چور آئی نظر اس کی مجھے پتھر سے کڑی آنکھ
مدت سے تصور میں ترے سبزۂ خط کے یاں موندے ہوئے بیٹھی ہے ہر بوٹی جڑی آنکھ
بے وجہ نہیں اتنا یہ پانی کا اُبلنا شاید کسی عاشق کی کنویں میں ہے گڑی آنکھ
کم ہووے نہ عاشق کے کبھو اشک کا باراں ممکن ہی نہیں کھولے یہ ساون کی جھڑی آنکھ

1۔ بٹنا = ابٹن

تو مائلِ نظارہ جو تا دیر رہے ہے شاید تری آئینے میں تجھ سے ہے لڑی آنکھ
نظارے کی آنکھ اب کوئی بازار سے لاویں گریے سے تو خالی ہی نہیں ایک گھڑی آنکھ
بازارِ قیامت میں بھی تم چھپتے پھروگے دریوزۂ دیدار کو جس وقت اڑی آنکھ
یہ لختِ جگر آئے کہ کثرت سے انھوں کی فرقت میں تری بن گئی پھولوں کی چھڑی آنکھ
دم بند نہ ہو کیونکہ اسے دیکھ پری کا پھرتی ہے لیے ہاتھ میں سرمے کی چھڑی آنکھ
ہے رنگ دھواں اس کا عجب کیا ہے کہ اس دم سرمے سے لڑا دے تری مسّی کی دھڑی آنکھ
نظروں سے گرا مصحفی کب سنبھلے ہے سچ ہے
نرگس کی عصا سے بھی نہیں ہوتی کھڑی آنکھ

249

اے جی نہ گرے جواں ادھر دیکھ مرتا ہے یہ نیم جاں اِدھر دیکھ
اس گردشِ چشم کے نہ منھ چڑھ اے گردشِ آسماں اِدھر دیکھ
چپ مرغِ چمن یہ شور کیا ہے کرنے دے ہمیں فغاں اِدھر دیکھ
جاتا ہے کدھر تو اے سگِ یار کس کے ہیں یہ استخواں اِدھر دیکھ
کیاری میں تڑپ رہی ہے بلبل کیا سیر ہے، باغباں، اِدھر دیکھ
صیدِ سرِ تیر ہے مرا دل مت ہاتھ سے رکھ کماں اِدھر دیکھ
عاشق یہ کھینچ تیغِ بیداد اچھا نہیں امتحاں اِدھر دیکھ
ہے جسم میں اس کے کچھ بھی باقی غارت گرِ جسم و جاں اِدھر دیکھ
ٹھکرا کے نہ چل تو مصحفی کو
سر کس کا ہے یہ میاں اِدھر دیکھ

250

کہنے میں [1] رہا نہیں ہے دل آہ ہے نالہ بہ چرخ متصل آہ

1۔ ج: کہنے میں نہیں رہا ہے

ہم آہ جگر میں کب رکھیں تھے ہو گئے دمِ گرم چند مل آہ
اس کوچے میں اشکِ چشم تر سے جاتے ہی ہوا ہُن پا بہ گل آہ
مانندِ سپند دل جلے ہے اس رخ پہ رکھا ہے کس نے تل آہ
بلبل ترے آشیاں سے آخر اک شعلہ ہوا ہے مشتعل آہ
ہر دم دمِ واپسیں کے مانند چھاتی کی مرے ہوا ہے سل آہ
طاقت نہیں دم کی مصحفی میں
کیا بات کرے یہ مضمحل آہ

251

نکلا سوار ہو جو وہ قاتل کٹار باندھ فتراک زیں سے ووں ہی لے آیا شکار باندھ
حالت نہیں کچھ اب تو گریباں میں اے جنوں رکھے کہاں تلک کوئی تاروں سے تار باندھ
آئی جو روحِ لیلیٰ زیارت کو قیس کی دی عشق نے قنات بہ گردِ مزار باندھ
صیاد ہے یہ موسمِ[1] گل تجھ سے کہ دیا باندھے ہے پر مرے تو ذرا استوار باندھ
اس چشم سرمہ ناک کی خاطر یہ گرد ہے اے گرد باد تو تو نہ میلِ غبار باندھ
فصلِ جنوں میں ہم کوئی رہتے ہیں گھر کے بیچ زنجیر سے ہمیں کوئی رکھے ہزار باندھ
کیا فائدہ ہے اب وہ نہ آوے گا مصحفی
کہہ چشمِ وا سے اپنا درِ انتظار باندھ

252

جان گئی یار کی یاری کے ساتھ عمر کٹی ذلت و خواری کے ساتھ
قالبِ مجنوں ہے یہ یا گرد باد جاوے ہے لیلیٰ کی عماری کے ساتھ
کل گئے تھے ہم بہ طرف کوہ و دشت روئے بہت ابرِ بہاری کے ساتھ
غنچۂ دل میں ہیں خراشِ الم گل ہے کب اس سینہ فگاری کے ساتھ

1۔ ج : موسمِ فصلِ جنوں

سوے چمن مرغِ گرفتار کی جان گئی بادِ بہاری کے ساتھ
دیکھ کے صورت نو تیری آفتاب محو ہو آئینہ داری کے ساتھ
اُٹھ گیا پھر وہ جسے ہم مصحفی
لائے تھے سو منّت وزاری کے ساتھ

253

کیا فائدہ کھڑا ہوا محصول کوٹ باندھ پہلے تو اس تفنگِ اجل کی تو چوٹ[1] باندھ
پہلو میں اپنے حور و پری کو جگہ نہ دے بازو سے بازو اس[2] کے ملا کر تو جوٹ باندھ
گل چیں چمن سے بھرتے ہیں پھولوں کی جھولیاں بلبل سے کہہ دو جاکے کوئی تو بھی پوٹ باندھ
کنجشکِ دل کو رشتہ بپا کر کے یوں نہ چھوڑ پنجوں میں اس کے اپنے تو محرم کی گوٹ باندھ
دل میں خیالِ سیرِ منازل ہے گر ترے جوں ماہ پہلے اپنی کمر سے تو روٹ باندھ
چوکھٹ سے کوئی سر کو پٹک مر ہی جائے گا جوڑا صنم نہ ہو کے کھڑے پٹ کی اوٹ باندھ
تحت الحنک[3] سمجھ[4] نہ اسے بہرِ یادگار رکھی ہے ہم نے ہاتھ کی اس گل کے جوٹ باندھ
بس کر زیادہ فکرِ قوافی نہ مصحفی
دِل کی تڑپ کو طائرِ بسمل کی لوٹ باندھ

254

لحد میں کھول نہ اے ہم نشیں ہمارا منھ کہ بازِ دید کے قابل نہیں ہمارا منھ
ہم آفتابِ طبیعت وہی ہیں گوہرِ شام چھپے ہے زیرِ نقابِ زمیں ہمارا منھ
خفا ہے ہم سے یہاں تک کہ روزِ محشر بھی نہ دیکھے گا وہ مہِ خشمگیں ہمارا منھ
غبارِ کوچۂ دلبر ہے یہ نہ پوچھ اس سے تو یوں ہی رہنے دے اے آستیں ہمارا منھ
ہزار حرفِ شکایت بھرے ہیں اے فریاد خدا کو مان نہ کھلوا کہیں ہمارا منھ

1۔ اصل: پوٹ 2۔ ج: اس کے جو ہو تیرے 3۔ تحت الحنک = ٹھوڑی کے نیچے عمامے کا پیچ
5۔ ج . سمجھ کے

ہوئے ہیں دشمنِ جاں اپنے آشنائے حرف — سیہ کرے ہے برنگِ نگیں ہمارا منھ
جہاں رکھے ہے قدم اپنا وہ بتِ طنّاز — رہے ہے دو دو پہر تک وہیں ہمارا منھ
اگر ہم آئنہ بن کر بھی جاویں اس کے حضور — نہ دیکھے وہ نگۂ شرمگیں ہمارا منھ
جب اس کا مصحفی ہم بوسہ دوڑ کر لے لیں
تکے نہ کیوں دلِ محنت قریں ہمارا منھ

ی، ے

255

دل خوں میں لٹاتے ہیں عاشق کا حنا والے — شوخی سے نہیں خالی یہ ناز و ادا والے
ترکانِ خطائی کی سج دھج کے دوانے ہیں — ہم لوگ، کہ آفت ہیں یہ تنگ قبا والے
ہے ہے وہ کن آنکھوں سے دیدار ترا دیکھیں — جاتے ہیں موے آپھی خجلت سے حیا والے
دردِ دلِ عاشق کو کھویا نہ کسی نے بھی — سر مار رہے کتنا آ آ کے دوا والے
ہے شوقِ ہم آغوشی کس کا انھیں جو اکثر — کھولے ہوئے رکھتے ہیں ہاتھوں کو دعا والے
دیکھے ہوئے ہیں اپنے گلیوں میں جو پھرتے ہیں — اک پیچ سجے سر پر یہ دائی دوا والے
کب فرضِ خدا ان سے ہوتا ہے ادا یارو — رہتے ہیں قضا ہی میں ہیں وہ جو قضا والے
لا باز کے چنگل میں صیّاد نے رکھا ہے — کیا جانے گئے کیدھر پنجرے وہ قضا والے
تا خلق کی آنکھوں میں قدر ان کی زیادہ ہو — تا دیر عبادت میں رہتے ہیں ریا والے
اس کاکلِ مشکیں نے کی عفوِ خطا ان کی — پکڑے ہوئے آئے تھے آہو جو خطا والے
ابرو کے اشارے میں جاتے ہیں گزر جی سے — دیکھے ہیں کہیں ہم[1] سے میاں دوست وفا والے
جوں نقشِ قدم اپنے مٹ جانے پر عاشق ہیں — کیا خاک سمجھتے ہیں ہستی کو فنا والے

1۔ ج ہم نے

ہر خاک کے ذرّے میں خورشید جھلکتا ہے از بسکہ ہوئے مٹی یاں حسن و صفا والے
دربارِ امیراں میں جب چغد کی ارزش[1] ہو
اے مصحفی واں آ کر کیا خوش ہوں ہُما والے

256

تنہا نہ قصدِ دل میں ہیں ناوک فگن کئی باندھے پھریں ہیں اس پہ کمر تیغ زن کئی
جب تیرھویں برس میں قدم شوخ نے رکھا بس تھوڑے ہی دنوں میں نکالے چلن کئی
کوسوں ہی ہم سے دور رہے اس سفر میں ہائے تھے دوست دار اپنے جو اہلِ وطن کئی
ہم نے جو جیب گل کی طرح اس بہار میں دستِ جنوں کی نذر کیے پیرہن کئی
رُخ سے خجل جنھوں کے تھی پتّی گلاب کی دیکھے ہیں ہم نے ایسے بھی نازک بدن کئی
پروانہ گر کے شمع کے شعلے پہ جل گیا پوچھیں تھے اس سے شب روشِ سوختن کئی
ناسور پڑگئے ہیں دلِ داغدار میں یا ہیں یہ بہرِ[2] عرضِ تمنّا دہن کئی
پڑھ اس زمیں میں اور بھی کچھ شعر مصحفی
عاشق تری زباں کے ہیں اہلِ سخن کئی

257

نالے سے میرے چاک ہوئے پیرہن کئی گریے سے میرے غرق بخوں ہیں چمن کئی
استاد سے تو اپنے دغا کھا گیا صریح کشتی کے فن میں اس نے کیے تجھ سے فن کئی
عریاں تنوں کے تیرے جہاں تن ہوئے ہیں دفن واں ہو گئے ہیں ایک کفن کے کفن کئی
اے جانِ تلخ کام نہ نومیدِ وصل ہو بوسے کا وعدہ کرتے ہیں شیریں دہن کئی
اس کس صفائے سینۂ محرم میں دیکھ کر پردے میں ساری رات رہے سینہ زن کئی
شوخی تو اس کی دیکھ کہ قبضے پہ ہاتھ رکھ اس نیچے نے ہم سے کیے بانکپن کئی
کرنے کو سوزِ غم کا بیاں گرچہ مصحفی ق جوں نے ہمیں خدا نے دیے تھے دہن کئی

1۔ ارزش = بہتات، فراوانی 2۔ ج: بہرِ عرضِ تمنا

پر وقتِ نزع آ کے جو دیکھا تو زیرِ لب
خوں ہو کے رہ گئے تھے زباں پر سخن کئی

258

برگشتہ نگہ کا جو تری تیر اُلٹ جائے
ساتھ اس کے مزہ ہو وہیں نخچیر اُلٹ جائے

وہ صید زبوں ہوں میں جسے دیکھ کے ووں ہی
منھ پھیر لے خنجر، دمِ شمشیر اُلٹ جائے

پانو، کو جو لپٹے ہے تو یہ ڈر ہے نہ مجھ کو
ناگن کی طرح ڈس کے یہ زنجیر اُلٹ جائے

ہووے[1] جو شب ہجر دراز اتنی نہ کیونکر
رستے سے مرا نالۂ شب گیر اُلٹ جائے

اس نے تو مجھے اور کیا نعل درِ آتش
ایدھر ہی کو کیا نالے کی تاثیر اُلٹ جائے

سیدھی نہ پڑی تیغ تری کشتے پہ تیرے
تو کیا کرے جب اس کی ہی تقدیر اُلٹ جائے

تو ذبح نہ کر مجھ کو کہ خطرہ مجھے یہ ہے
شاید ترا خنجر دمِ تکبیر اُلٹ جائے

مارِ سیۂ زلف کا کشتہ ہوں میں، کوئی
تربت پہ مری یک قدحِ شیر اُلٹ جائے

ہر چند کہ تھا نقشِ مراد اپنے ہی کف میں
پر کیا کریں جو قرعۂ تدبیر اُلٹ جائے

واژونیِ[2] بخت اپنی رقم کیجیے تو کیا دور
گر ہاتھ میں نامہ دمِ تحریر اُلٹ جائے

کاغذ پہ اگر تیرے گنہگاروں کا نقشا
سیدھا بھی رقم کیجیے تو تصویر اُلٹ جائے

فرقت سے تری مصحفی ہے نزع میں اس شب
دم اس کا نہ کیوں اے بت بے پیر اُلٹ جائے

259

لگ کر مرے سر پر جو تری تیغ اُلٹ جائے
شاید کہ خوشی سے کوئی دم زیست کا کٹ جائے

بے طاقتیِ عشق سے میں سخت بہ جاں ہوں
یا رب یہ محبت کہیں دو دن کو تو گھٹ جائے

اس زلف کا عالم ہے یہ تحریک ہوا سے
جوں موج کہ پھیلے کبھی اور گاہ سمٹ جائے

میخانے سے آتا ہے تو برسات کی شب ہے
ڈرتا ہوں نشے میں نہ ترا پانو، رپٹ جائے

1۔ ج : ہووے نہ　　2۔ واژونی بخت = اُلٹی تقدیر، خرابیِ قسمت

چال اپنی سے باز آئے نہ وہ سروِ خراماں — جوں نقشِ قدم گو کہ کوئی خاک میں اَٹ[1] جائے
وا رفتۂ شمشاد قداں کیا عجب اس کا — جاتے ہی اگر سروِ گلستاں سے لپٹ جائے
اللہ رے ترا حسن پری دیکھ کے جس کو — از راہِ ادب پچھلے قدم پیچھے کو ہٹ جائے
ہر اک تری تصویر کا خواہاں ہے، یہ ڈر ہے — کاغذ تو کہیں اس کا کشاکش میں نہ پھٹ جائے

اچھا تو ہے اے مصحفی گر خوانِ معانی
یکبار انہی قافیوں میں پھیر سے بٹ جائے

260

آنکھیں وہ بلا جن سے دم آہو کا اُلٹ جائے — چہرہ وہ پری جس کو پری دیکھ کے کٹ جائے
تسمے سے تری تیغ کے اندیشہ یہی ہے — عاشق کے گلے سے تو یہ ناگن نہ لپٹ جائے
ہے کشتوں کا ہی دماغ اس کے میں سودا — لاشوں سے کہیں رشتۂ بازار نہ پٹ جائے
اس طفلِ دبستاں کے مزہ وصل کا تب ہے — وصلی کی طرح سینے سے جب سینہ چمٹ جائے
وا شد کی طمع رکھتے تھے ہم، کس کو خبر تھی — مسّی سے ترا غنچۂ لب اور سمٹ جائے
فریاد یہ کرتی ہے بہت دوریِ گل سے — بلبل کا کلیجہ نہ قفس میں کہیں پھٹ جائے
یا رب کہ بلا ہے شبِ ہجراں کی درازی — یا عمر گھٹے یا کہیں یہ رات ہی گھٹ جائے
اس غصّے سے تو تاب نہ دے چینِ جبیں کو — جو دیکھ کے عاشق کا دل آیا ہوا ہٹ جائے
ناقے سے بھڑا اشک فشاں جاوے ہے مجنوں — تا محملِ لیلیٰ نہ کہیں گرد میں اٹ جائے
کیا دوش تجھے دیجے، نصیبوں کا گلہ ہے — کیا مجھ پہ ہی تلوار تری لگ کے اُچٹ جائے

اے مصحفی کرتا تو ہے وہ وصل کا وعدہ
پر ڈر ہے نہ وعدے سے کہیں پھیر پلٹ جائے

261

گر اس کے پانو کی مہندی سے اپنا دل لپٹے — تو اشکِ خوں بُنِ مژگاں سے متصل لپٹے

1۔ ج : لٹ

ہیں پیچ اس کی جو پگڑی کے متصل لپٹے — مجھے یہ ڈر ہے نہ ان میں کسی کا دل لپٹے
ہمارا نامۂ اعمال وا کا وا ہی رہا — کبھی ہوا نہ کہ یکبار یہ سجل [1] لپٹے
تو میرے اخگرِ افسردہ کو نہ چھیڑ صبا — مبادا تجھ سے ابھی ہو کے مشتعل لپٹے
رہے کھنڈے [2] ہی ستارے فلک کے بوریے میں — نہ ایک رات کبھی یہ سپید تل لپٹے
روئی سے بند نہ ہوویں گے اس کے روزنِ در — نہ خوب جب تلک اوپر سے ان کے گل لپٹے
کوئی گلی میں گرا، کوئی در پہ، کوئی اندر — ز بسکہ کشتے ترے تجھ سے متصل لپٹے
بنا ملاطفہ [3] لے جاویں تاجراں اس کو — جو سنگِ صورتِ شیریں کی ان سے سل لپٹے
جڑی ہیں تب تو ستاروں کی ان میں گل میخیں — فلک ہیں جوں ورقِ نقرہ متصل لپٹے
ترے جمال کی غیرت سے چہرے حوروں کے — نقابِ شرم میں ہو ہو کے منفعل لپٹے
دکھاویں گر اسے کاغذ شبیہِ لیلیٰ کا — وہ اس کے حسن و ملاحت سے ہو خجل لپٹے

گیا وہ آخرِ شب اُٹھ کے مصحفی شبِ وصل
کہ تا قلق میں پڑا مجھ سا مضمحل لپٹے

262

گریہ کس کام کا وہ جس میں کہ مژگاں ڈوبے — رو یہ اے قیس کہ ہر خارِ بیاباں ڈوبے
تکمۂ لعل جو اس گل نے کیا زیبِ گلو — قلزمِ خون میں ہم تا بہ گریباں ڈوبے
دیکھ کر چاہِ زنخداں کو ترے کہتی ہے خلق — اس کنویں میں بھی ہر اک گبر و مسلماں ڈوبے
ہے وہ گردابِ بلا ناف تری اے ظالم — جس میں جا کشتیِ اندیشۂ انساں ڈوبے
دیکھیے صبح دکھاتی ہے منھ اپنا کہ نہیں — ہم اسی فکر میں ہیں اے شبِ ہجراں ڈوبے
دل کہیں، جان کہیں، ہائے یہ اپنے ہمدم — قلزمِ عشق میں ڈوبے پہ پریشاں ڈوبے
حاجتِ اشک انھیں کیا ہے کہ آئینہ مثال — خود بخود آب میں ہیں دیدۂ حیراں ڈوبے
ان تباہی زدوں کے حال پہ رونے کی ہے جا — جو پہنچ کر بلبِ ساحلِ عماں ڈوبے

1۔ سجل = اچھی طرح، نیز پانی لگا کے 2۔ کھنڈنا = بکھرنا 3۔ ملاطفہ = پروانہ

حلقۂ زلف کا چھٹتا ہی نہیں ان سے خیال کیا چکاپو میں ہیں یہ دیدۂ گریاں ڈوبے

مصحفی کیونکہ رہِ کعبہ ہو طے مجھ سے کہ یار
آبلوں میں ہیں مرے خارِ مغیلاں ڈوبے

263

کشتیِ چرخ نہ اے نوح کے طوفاں ڈوبے یہ سلامت رہے اور آب میں یوناں ڈوبے
دلِ بلبل سے مٹے یا قلقِ نالۂ شب یا پڑے اوس کہ جس میں یہ گلستاں ڈوبے
ڈوبنے کا مجھے کچھ اپنے نہیں اندیشہ تیری کشتی کہیں اے گنبدِ گرداں ڈوبے
سیلِ اشک اپنا گلستاں کی طرف آتا ہے باغباں، دیکھیو گل کی نہ خیاباں ڈوبے
گریہ اس صرفے سے کرنا نہیں عاشق کو روا جس میں موخشک رہیں اور بُنِ مژگاں ڈوبے
زلف وخط کی ترے کرتی ہے حکایت جو صبا کیا مزے میں ہیں بہم سنبل و ریحاں ڈوبے
گھر میں دشمن کے تو برسات کی شب کاٹے ہے تجھ کو کیا غم جو مرا خانۂ ویراں ڈوبے
بحرِ ہستی[1] سے نکلنا تو بہت مشکل تھا تیغ کے گھاٹ تو ہم ڈوبے پر آساں ڈوبے
بام پر آئے جو[2] تو سیر کو اے ماہِ تمام عرقِ شرم میں روے مہ تاباں ڈوبے
حلقہ نتھ کا ہے وہ گرداب صنم رُخ پہ ترے جس میں جی دیوے پری اور وہیں انساں ڈوبے
یہ بھی بس ہے کہ لبِ زخم پہ سرخی آوے اتنا خوں کس میں ہے جو تیر کا پیکاں ڈوبے
دیکھیو میں بھی شبِ ہجر میں کیا لاؤں ہوں سانگ آج سورج کہیں اے شامِ غریباں ڈوبے

مصحفی نیل کے کٹرے میں تو جاتا ہے بہت
مجھ کو ڈر ہے نہ ترا جی کہیں ناداں ڈوبے

264

باہم ز بسکہ مہر و محبت نہیں رہی کچھ ہم کو اس سے جاے شکایت نہیں رہی
دم بند یہ کیا ہے ہجومِ سرشک نے جو ہم کو بات کہنے کی قدرت نہیں رہی

1۔ ج: سے عبور آہ 2۔ ج: جو بے پردہ تو

تصویر[1] سے ہی تیری میں خالی کیا ہے دل ۔۔۔ چھاتی سے وہ جدا شبِ فرقت نہیں رہی
پانو کی خوش قدوں کے جو کھائی ہیں ٹھوکریں ۔۔۔ شکل نخست[2] پر مری تربت نہیں رہی
دیکھی ہے کیا وہ شکل کہ دو دو پہر تلک ۔۔۔ آنکھوں کے میری سامنے حیرت نہیں رہی
یاں چھاتیاں خیال میں رگڑا کیے ہیں ہم ۔۔۔ ملنے کی روزِ عید کے حسرت نہیں رہی
بیٹھا ہے کب تو مجلسِ اغیار میں کہ واں ۔۔۔ چھاتی پہ دردِ رشک کی شدت نہیں رہی
چھوٹیں جو ہم قفس سے تو پھر کس طرح اُڑیں ۔۔۔ اپنے تو بال و پر میں وہ طاقت نہیں رہی
کیا ہوگیا ہے اس کو جو اس نو بہار میں ۔۔۔ دستِ جنوں کی[3] جیب سے الفت نہیں رہی
آصف[4] کے مرتے وہ بھی سفر دوں ہی کر گئی ۔۔۔ اب لکھنؤ میں رسمِ سخاوت نہیں رہی

قسمت کا کیا گلہ ہے کہ ہے واجبی تو یہ
اب کے امیر زادوں کی ہمت نہیں رہی

265

نہ کرتے پھریں آپ سیل اور سپاٹے ۔۔۔ خطا پایئے گا کہیں پاٹے گھاٹے
ترے آستاں کی اُٹھا لائے وہ سِل ۔۔۔ جو تہ خانۂ قبرِ عاشق کو پاٹے
چھوا ہو اگر میں نے کاکل کو تیری ۔۔۔ الٰہی مرے ہاتھ میں سانپ کاٹے
سنے جب وہ راتوں کو فریادِ بلبل ۔۔۔ گلِ صبح کی کیونکہ چھاتی نہ پھاٹے

جو لے مصحفی لعلِ شیریں کا بوسہ
لب اپنے بھلا کیونکہ خسرو نہ کاٹے

266

سبزہ اب تربتِ مجنوں سے تو کیا خاک اُگے ۔۔۔ واں مگر سلسلہ بر پا شجرِ تاک اُگے
استخواں جمع ہوں گر میرے پسِ دفن تو پھر ۔۔۔ زخم پر زخم جمیں چاک پر اک چاک اُگے
زاہدا ہے یہ اثر خاک میں خوش چشموں کی ۔۔۔ بنے نرگس کی قلم واں سے جو مسواک اُگے

1۔ ج تصویر سے تری ہی 2۔ نخست = پہلی 3۔ ج سے جیب کی
4۔ نواب آصف الدولہ فرماں روائے اودھ

ہے مقدر جو مجھے دھوپ میں جلنا پسِ مرگ تاک تربت پہ مری بوویں تو واں ڈھاگ اُگے
ہے خطِ پشتِ لب اس کے میں یہ سیرابیِ حسن جوں لبِ جو پہ کبھی سبزہ طرب ناک اُگے
دشت گردی نہ ترے آبلہ پا چھوڑیں کبھی گر جگہ خار کی واں نشترِ چالاک اُگے
کشتۂ عشق کا قاتل کوئی چھپتا ہے، اُسے خاک میں دابیں تو واں سے سرِ فتراک اُگے
کیفیِ چشم خماریں کی جہاں تربت ہو بوویں نرگس تو وہاں سے گلِ تریاک اُگے
مصحفی قربِ سفیہاں[1] سے مری قدر ہے کم
ہوں میں وہ گل کہ میانِ خس و خاشاک اُگے

267

زیبِ دامانِ مژہ سلک لآلی کیجے دو گھڑی دل تو کہیں بیٹھ کے خالی کیجے
مسّی مل کر جو دھڑی خوب سی کالی کیجے اس کا روپوش بھی پھر پانو کی لالی کیجے
آیۂ گریۂ رنگیں پہ تو بیٹھے بیٹھے تار جامے کا ہر اک تارِ نہالی کیجے
ہمدماں موسمِ پرواز میں یہ خوب نہیں عذر کوتہ دمی و ریختہ بالی کیجے
رشتۂ آہ درازی تو بہت رکھتا ہے اپنے لٹو کی صنم گر اسے جالی کیجے
آیئے دیکھیے چلنے کو کواکب کے ذرا بام پر سیرِ چراغانِ دوالی کیجے
دل ہے بے صبر بہت جب تئیں تم آپ آؤ لکھ کے خط ہی میں روانہ کوئی گالی کیجے
یہی ڈر ہے کہ نہ غصّے میں کہیں آوے مزاج درد اپنا جو کوئی رسمِ جلالی کیجے
لاکھ جل جل کے گرے اس پہ بس اب اے فراش پاک پروانوں سے یہ شمع کی تھالی کیجے
مصحفی ہے یہی وحشت تو ہمیں لازم ہے
اب کے موسم میں تخلص بھی غزالی کیجے

268

عرصۂ حشر میں شکل اپنی جو کالی کیجے سب گنہگاروں سے فریاد نرالی کیجے

1۔ سفیہہ = کمینہ، کم عقل

تیرا احسان بڑا مجھ پہ ہو گر اے صیاد — گل کو لا کر کے قفس کی مرے پیالی کیجے
سخت دشوار ہے گو دھویئے سو بار اُسے — دمِ خنجر سے جدا خون کی لالی کیجے
یوں روئی روزنوں میں بھریے، ولے مٹی سے — بند رخ پر مرے غرفے کی نہ جالی کیجے
اکبر آباد میں جانا ہو اگر اب کے تو واں — انتخاب[1] اب رُخِ خوباں کی جمالی کیجے
مے کشی کچھ نہیں دشوار پس از مرگ بھی گر — کاسۂ سر کے تئیں جامِ سفالی کیجے
جی نہ بھر آوے مرا کیونکہ جب[2] اس چاہ پر آپ — الفتِ غیر سے دل اپنا نہ خالی کیجے
شوقِ ابرو میں ترے ماہ یہی کہتا ہے — یعنی تن اپنا گھٹا کر کے ہلالی کیجے
یار سے روئے مخطط پہ نہ کھلوایئے زلف — تیرہ بختی مری شب اور نہ کالی کیجے

یا علیؑ رنگِ رخِ مصحفی ہے غم سے تغیر
اس کے چہرے کو بھی فرمان بحالی کیجے

269

کس بہانے سے ترے در تلک آوے کوئی — اور جو آوے بھی تو کیا بات بناوے کوئی
بے قراری سے تو پردہ ہی اُٹھا جاتا ہے — کیونکہ چاہت کو تری دل میں چھپاوے کوئی
اس کی مجلس میں جو بیٹھے ہیں سو تصویر بنے — قہر آوے جو ذرا لب کو ہلاوے کوئی
خامشی خوب ہے پر کہتی ہے شرم اس کی یہی — اپنی رسوائی کا قصہ نہ سناوے کوئی
چاہتا ہوں کہ جو سو جائے تصوّر تیرا — میری آغوش میں، اس کو نہ جگاوے کوئی
حیف ہے کشتۂ شمشیر تغافل ہو جو شخص — منہ میں اس کشتے کے پانی نہ چواوے کوئی

مصحفی کا تو کہیں ٹھور ٹھکانا ہی نہیں
ایسے وحشی کو کہاں ڈھونڈنے جاوے کوئی

270

رفتہ رفتہ دل میں چاہ اس کی جو مفرط ہوگئی — اک پری تختِ سلیماں پر مسلّط ہوگئی

1۔ ج : انتخاب آپ بھی اک آدھ   2۔ ج : جب اس چاہت پر

خط سے جب اس کے شبیہِ حسن نوخط ہوگئی فوجِ زنگی روم پر گویا مسلّط ہوگئی
جب یہ جانا سرکشی ہے بزمِ مستاں میں گناہ ہو کے خم مے کی صراحی گردنِ بط ہوگئی
سب ورق بادِ اجل نے اس کے برہم کردیے ایک جھونکے میں کتابِ عمر اغلط ہوگئی
سادگی کے دن تو تھے ہی لیک اس عالم کو دیکھ آرسی خود والہٗ روے مخطط ہوگئی
تھا جہاں مدفن شہیدوں کا ترے، فصلِ بہار وہ زمیں قالیں سے لالے کی مسمّط ہوگئی
کی جو ساقی سے تغافل مطربِ ناساز نے نالہ کرنے میں بطِ مے آب بربط ہوگئی
یاد میں بغدادِ دہلی کی در ایامِ فراق
چشمِ طوفاں جوش تیری مصحفی شط ہوگئی

271

روتے روتے ہجر کی شب آنکھ جو شط ہوگئی تھی پر زاغ اپنی گر مژگاں پر بط ہوگئی
خونِ بلبل اس ہوا میں کیوں نہ ہو نشتر کا باب نکہتِ گل باعثِ سودائے مفرط[1] ہوگئی
قبرِ عاشق پر دیا پردہ جو اس نے منھ سے کھول لاکھ جلووں کی وہ مشتِ خاک مہبط[2] ہوگئی
عرش تک جانے کی کیا ہے احتیاج اب روح کو گھر میں بیٹھے بیٹھے ہی سیر بسایط ہوگئی
لوحِ دل پر قیس کے لکھتی ہے کیا کیا حرفِ ناز لیلی مکتب نشیں کچھ اب تو خوشخط ہوگئی
پھر خیالِ رفتہ اس کا جانشینِ دل ہوا ملک پر پھر اپنے نوشابہ مسلّط ہوگئی
مصحفی تجھ سے کرے کیا ذکر اس کا ان دنوں
یک قلم جو بات تھی انشا سو اَلقط[3] ہوگئی

272

لہو سے شعلہ جوالہ جب وہ خود بن جائے نہ کیوں کے برق بہ قربانِ دورِ دامن جائے
بلا سے قتل ہی کر ڈالے گر کوئی مجھ کو میں چھوٹوں قید سے اور بارِ طوقِ گردن جائے
ہر اک اسیرِ قفس ارمغاں لیے جاوے اگر کوئی طرفِ ساکنانِ گلشن جائے

1۔ مفرط = بے افراط 2۔ مہبط = وارد ہونے کی جگہ 3۔ القط = رد

میں ضبط نالہ میں کوشش تو کر رہا ہوں بہت　ولے یہ ڈر ہے مبادا کہیں جگر چھن جائے
تمام سال محرم رہے ہے مجھ کو تو آہ　نہ میری نالہ وزاری نہ دل کا شیون جائے
ہزار رخنے نکالیں ہیں چاہ میں بدبیں　جو بھولے سے بھی نظر میری سوئے روزن جائے
فغانِ بلبلِ شیدا سے تو میں تنگ نہیں　زباں درازی کہیں تیری برگِ سوسن جائے
ہمارے روزِ سیہ کا وہ گر سنے مذکور　نہ اس طرف کو کبھی آفتابِ روشن جائے
برہنگانِ عدم بے کفن ہیں، لازم ہے　جو جاوے واں وہ لیے رشتہ اور سوزن جائے
نہ جل کے راکھ ہو کیونکر جو سوئے شعلہ پتنگ　پروں سے مرگ کا مل کر کے اپنے روغن جائے
وہ بلبل بہ قفس مردہ ہوں کہ بعد از مرگ　نسیم بھی نہ کبھی جس کے سوئے مدفن جائے

رہے نہ صید بیاباں میں مصحفی کوئی
اگر شکار کو میرا وہ صید افگن جائے

273

انسان سے گہ جن سے ہمیں کام پڑا ہے　کیا کہیے کہ کن کن سے ہمیں کام پڑا ہے
محرومیِ طالع کا بیاں کیجیے کس سے　معشوقۂ کم سن سے ہمیں کام پڑا ہے
بیٹھے ہیں مرے سامنے وے اور میں کہوں ہوں　یوں ہاتھ اُٹھا ان سے ہمیں کام پڑا ہے
کیا کہیے صنم چشمِ حیاناک سے تیری　ہیں سوچ میں جس دن سے ہمیں کام پڑا ہے
ہر وقت میں پاتا ہوں اُنھیں چیں بجبیں ہاے[1]　کم جن[2] سے نہیں، جن سے ہمیں کام پڑا ہے

مذکور میاں مصحفی کچھ میں جو نکالا
یوں ہنس کے کہا ان سے ہمیں کام پڑا ہے

274

رہے دوپٹے میں ہر عضوِ تن چُرائے ہوئے　گر آئے بھی تو وہ بیٹھے بدن چُرائے ہوئے
بہ صورتِ لبِ تصویر اس پری رو کا　رکھے ہے موجِ تبسّم دہن چُرائے ہوئے

1۔ اصل ہی　2۔ یعنی وہ انسان نہیں جن ہیں

خجل ہے چشم سے کس کی جو آج جاتا ہے ہمارے آگے سے آنکھیں ہرن چرائے ہوئے
عجب چمن تھا کہ ہم جس کے بیچ پھرتے تھے کسی کا خواب میں سیب ذقن چرائے ہوئے
گلے لگے کوئی کیا اس کے جو ہوا سے بھی رکھے بدن کو تہِ پیرہن چرائے ہوئے
برابر اس کے سے گزرا ہے کون سا شمشاد کھڑا ہے شانہ جو سروِ چمن چرائے ہوئے
دل اس کا چاہے ہے مجھ ساتھ بولنے کو ولے رکھے ہے شرم تہِ لب سخن چرائے ہوئے
فلک لباس بھی مردوں پہ چھوڑتا نہیں ہائے بکیں ہیں گزری میں لاکھوں کفن چرائے ہوئے
تمھارے طرّۂ طرّار کی گرہ میں ہیں ہزار نافۂ مشکِ ختن چرائے ہوئے
بہ جوے شیر نہاتی تھی جس گھڑی شیریں نظر کرے تھا اُدھر کوہکن چرائے ہوئے
خبر نہیں ہمیں مجلس سے کس کی آخرِ شب یہ دزدِ ماہ ہے جاتا لگن چرائے ہوئے
دل ایسی زلف سے کیونکر رہا ہو عاشق کا رکھے جو موج ہوا سے شکن چرائے ہوئے

جئیں گے ہم کوئی اے مصحفی جو رکھے گا
یونہی نگاہ وہ پیماں شکن چرائے ہوئے

275

اس عشق میں کیا کیا نہ ستم ہم نے اُٹھائے ناگفتہ ہی[1] یہ ہیں جو الم ہم نے اُٹھائے
باور نہ ہوا اس کو صداقت کا ہماری قرآن بھی کھا کھا کے قسم ہم نے اُٹھائے
دیکھیں گے صبا تیز روی ہم سے کرے گی گر وادیِ الفت میں قدم ہم نے اُٹھائے
لے جا کے تری نرگسِ کم خواب کا نقشا فتنے طرفِ ملکِ عدم ہم نے اُٹھائے
انصاف تو کر آپ ہی کہ چاہت کے دنوں میں کیا کیا نہ ترے ناز صنم ہم نے اُٹھائے
افسوس[2] ہے گلشن سے تہی دست ہی نکلے نرگس کے نہ دو چار قلم ہم نے اُٹھائے
لاشے ترے کشتوں کے جو مقتول پڑے تھے ان کے سر و تن کر کے بہم ہم نے اُٹھائے
جاتے ہیں طرف دیر کی، لو بسترے اپنے اب یاں سے مقیمانِ حرم ہم نے[3] اُٹھائے

1۔ ج : ناگفتہ یہ ہے 2۔ ج : افسوس کہ 3۔ ج : اس نے (صریحاً غلط)

پھر طوف شہیدانِ وفا کچھ نہیں درکار — کاندھوں پہ جو نالوں کے علم ہم نے اُٹھائے
کیا غم ہے اگر رنگ ہو چہرے کا زریری — صدمے مگر اس باغ میں کم ہم نے اُٹھائے

اے مصحفی اک[1] اُن کے نہ آنے میں کہیں کیا
جو جو کہ قلق نزع کے دم ہم نے اُٹھائے

276

تنہا ترا مزاج نہ خونخوار گرم ہے — خود اپنے قتل پر یہ گنہگار گرم ہے
بے تابیوں سے اس کی قفس آگ بن گیا — کتنا طپش میں مرغِ گرفتار گرم ہے
مارا ہے اس سے کیا کسی محرورِ[2] ہجر کو — جوں موجِ شعلہ اس کی جو تلوار گرم ہے
کوئی مت جگاؤ اس کو کہ اس مستِ ناز کا — تکیے پہ خواب کے ابھی رخسار گرم ہے
وہ آفتاب چہرہ مگر بام پر ہے آج — جو اس گلی میں سایۂ دیوار گرم ہے
کرتا ہے ہر صفیر میں آتش زبانیاں — کیا نغمہ سنج باغ کی منقار گرم ہے
پیری نے گو مزاج مرا سرد کر دیا — تیرا تو داغ سینۂ افگار گرم ہے
یارو، یہ مژدہ جا کے زلیخا کو دو کوئی — ہم کیا کریں جو مصر کا بازار گرم ہے
اپنا تو دل پھنسا ہے وہاں جس کے حسن پر — جی جان دینے تک بھی خریدار گرم ہے

کیا جانے کیا خطا ہوئی ہم سے کہ مصحفی
کینے پہ اپنے سخت دلِ یار گرم ہے

277

وصل موقوف رکھا، ہجر کی آفت ڈالی — عشق نے مجھ پہ نئے سر سے مصیبت ڈالی
آ کے قاصد نے دیا وصل کا پیغام اس کے — تنِ بے تاب وتواں میں مرے طاقت ڈالی
روحِ لیلیٰ کی ہوئی شاد جوں ہی مجنوں نے — جا کے اک چادرِ گل برسرِ تربت ڈالی
قالبِ آدمِ خاکی کو کیا جب تیّار — روح کے ساتھ ہی قالب میں محبت ڈالی

1۔ ج : اک میں نے ہی اپنی نہ کہی ہائے 2۔ ج : مہجور ہجر کو

خوش نصیبی نے پس از مرگ مدد کی یعنی — اس کے دروازے پہ لا کر مری میت ڈالی
دیکھ بھوچک[1] رہے پروین بھی جو شب کانوں میں — تم نے موتی کی لڑی از پئے زینت ڈالی
کیا لیا تھا میں بھلا اس کا جو یوں بدگو نے — بات[2] کہہ کر مری اور اس کی عداوت ڈالی
یاد کر شب میں تری صحبتِ شب کا عالم — اتنا رویا کہ محلّے میں قیامت ڈالی
بیٹھے بیٹھے جو تو منہ مجھ سے پھرا لیتا ہے — کیا بری خو ہے تیری کس[3] نے یہ عادت ڈالی
عشق اور حُسن میں پردہ نہ رہا جب حائل — درمیاں آکے غشی نے چقِ حیرت ڈالی
تیرے دیدار سے سیری نہ ہوئی، تجھ پہ صنم — آنکھ گر ڈالی کسی نے تو بہ حسرت ڈالی
کام کیا تھا مجھے، گلزارِ جہاں سے میں نے — دیکھ اس گل کو یہاں طرحِ اقامت ڈالی
دیکھ مجنوں کو ہوئی سخت مکدّر لیلیٰ — سر پہ خاک اس نے جب اپنے دمِ رخصت ڈالی

مصحفی اس کا صلہ جو تجھے دیجے کم ہے
اس غزل میں تو عجب تو نے فصاحت ڈالی

278

بہار پھولوں سے جب کوہ و دشت و زاغ بھرے — تو ٹھنڈی سانس نہ کیونکر نسیمِ باغ بھرے
نہ کم کرو ابھی دیوانگانِ عشق کا خوں — گران کے نکہت سودا سے ہیں دماغ بھرے
الٰہی باغ ہے یہ یا کہ تعزیت خانہ — گلوں کے خونِ جگر سے ہیں جو ایاغ بھرے
مزہ ملے شبِ ہجراں میں بے کلی کا اُسے — مری طرح نمکِ سودہ سے جو داغ بھرے
میں اصطبل کی زمانے کے جا کے سیر جو کی — تمام جامی عراقی تھے واں الاغ بھرے
تمام خونِ شہیدانِ عشق آتش ہے — مزہ چکھے وہ جو چونچ اپنی اس میں زاغ بھرے

چلے تو سیر کو اے مصحفی تو فرصت ہے
لدے ہیں میووں سے نخل اور گلوں سے باغ بھرے

1۔ بھوچک = حیران 2۔ج :بات کہتے 3۔ج :یہ جو ہے عادت ڈالی

279

یہی دن اور یہی راتیں رہیں گی　　نہ باہم کی ملاقاتیں رہیں گی
وہی چالیں وہی گھاتیں رہیں گی　　تری سب سے ملاقاتیں رہیں گی
نہ مانے گا ہماری بات وہ شوخ　　ہمیشہ بس یہی باتیں رہیں گی
یہی ہے چشمِ گریاں کا جو رونا　　تو یاں بھر عمر برساتیں رہیں گی
بتاں کے چاہنے سے ہاتھ اُٹھا اب　　نہیں تو دل پہ آفاتیں رہیں گی
کسی دن مصحفی مرجائے گا تو
اگر تیری یہی باتیں رہیں گی

280

اس لیے مجنوں کا یہ[1] سرزیر ہے　　اس کو برگ بید بھی شمشیر ہے
جیتے جی در تک نہ پہنچے اس کے ہم　　کوچۂ قاتل میں کتنا پھیر ہے
میوۂ دل دیکھ کر گل نے کہا　　ہنس[2] کے اتنا ہی، یہ کتنے سیر ہے
وہ پری گر خط کا بھی کھینچے حصار　　اپنے آگے قلعۂ کنبھیر ہے
جو ہیں ترسیدہ انھوں کی چشم میں　　صورتِ گربہ شبیہِ شیر ہے
رُخ پہ خط اور خط پہ عاشق ہے وہ زلف　　یہ عجب اندھیر پر اندھیر ہے
تیرے دامن کا ہے اک تختہ وہ شوخ　　دامنِ محشر میں کب یہ گھیر ہے
ہجر کی شب نالۂ مرغِ سحر　　گم ہے کیوں اے صبح کیا کچھ دیر ہے
کسوت[3] اس کا کیوں نہ ہو گلنار گوں　　یعنی رنگ خونِ عاشق سیر ہے
نے وہ اس کے لالۂ رنگیں رہے　　نے وہ اس کا سبزۂ سرزیر ہے
مصحفی کی جس جگہ تربت تھی واں
استخوانوں کا فقط اب ڈھیر ہے

1۔ ج نت　　2۔ ج ہنس کے کہتا ہے　　3۔ کسوت = لباس

281

سج دھج نہیں رکھتا کوئی نازک شجر ایسی   اب تک تو میں دیکھی نہیں تابِ کمر ایسی
گلبرگ جسے دیکھ کے گُل کھاوے تو مجھ کو   پھولوں کی چھڑی گوندھ دے لختِ جگر ایسی
بتیسی کا دانتوں کی تری زور ہے عالم   چسپاں نہیں دیکھی کوئی سلکِ گہر ایسی
سنتے ہی جسے ہم ہوئے دنیا سے روانہ   لایا خبر اس پاس سے کچھ نامہ بر ایسی
لیلیٰ کی نظر عکس سے اپنے نہیں اُٹھتی   آئینے میں کچھ محو ہے دو دو پہر ایسی
سو بار گئے سامنے ہم اور نہ دیکھا   لی پھیر کچھ آنکھوں نے تمھاری نظر ایسی
ہے لعل مذاب اس کا لب رنگِ گرفتہ   رکھتا ہے لطافت کوئی گلبرگِ تر ایسی
ہر تختے سے ہے دست و بغل قلزمِ[1] غم میں   عاشق ترے کشتے کی ہے موجِ خطر ایسی
ممکن نہیں دیکھوں میں رُخِ روزِ قیامت   پنہاں ہوئی آنکھوں سے ہے میری سحر ایسی
تاراج کیا جس نے چمن کون وہ آیا   کس نے اسے یاں لا کے سنا دی خبر ایسی
جاتے تھے اسیرانِ قفس پاس ٹھہر کر   گھبراتی نہ تھی آگے تُو بادِ سحر ایسی

اے مصحفی ہوں کشتۂ انداز میں جس کا
آفت نظر آئی ہے مجھے بیشتر ایسی

282

فلک کرتا ہے سامانِ جدائی   دریغا داغِ حرمانِ جدائی
کسی کا عین جمعیت میں اس طرح   نہ ہووے دل پریشانِ جدائی
کہاں ہے تو جو لے کر دامنِ وصل   سیے چاکِ گریبانِ جدائی
جدائی میں تری گر یہ مزہ ہے   تو میں ہوتا ہوں قربانِ جدائی
ہوئیں گریے سے آنکھیں سرخ ہو کر   گُلِ سرخ گلستانِ جدائی
جہازِ وصل کے تختے نہ پائے   اُٹھا ایسا ہی طوفانِ جدائی

1۔ ج: لجۂ غم

اجل تو بھی طفیلی آ کے ہوتا کہ اس شب ہوں میں مہمانِ جدائی
گیا ناحق یہ اس کا یوسفِ دل اسیرِ چاہِ زندانِ جدائی
فلک نے حد بُری کی مصحفی تو
نہ تھا اے وائے شایانِ جدائی

283

گر کارِ گریہ چشم پر خوں تلک نہ پہنچے مضمونِ تازہ طبعِ موزوں تلک نہ پہنچے
بوسہ تو لے چکا تھا طالع کی کوتہی سے لب اپنے اس کے لعلِ مے گوں تلک نہ پہنچے
شیریں وہ کیا جو چل کر فرہاد تک نہ جاوے لیلیٰ وہ کیا جو اُڑ کر مجنوں تلک نہ پہنچے
کیا چاہ کا مزہ ہو عاشق سے اس کو حاصل جو اپنے دردمندِ محزوں تلک نہ پہنچے
ایسے کو فائدہ کیا لکھ لکھ کے بھیجنا خط مطلب کو جو نہ سمجھے مضموں تلک نہ پہنچے
عاشق ہزار باتیں گر چاہ کی سناوے پر اس کی جنبشِ لب ہاں ہوں تلک نہ پہنچے
ہوتی ہے بے صدارت کب مستقل وزارت بگڑی ہی تھی جو موسیٰ ہاروں تلک نہ پہنچے
گریے سے مصحفی کے طوفان شہر میں ہے
کس روز دجلۂ خوں ہاموں[1] تلک نہ پہنچے

284

ترا کشتہ اس کو خدا جانتا ہے ہر اک زخم کو خوں بہا جانتا ہے
چھڑکتا ہے تیل آتشِ دل پر آنسو کہو مت کہ آتش بجھا جانتا ہے
پیام اس کو کیا دوں میں کہیو یہ قاصد مرے دل کا تو مدّعا جانتا ہے
نہیں چاکِ دل کی تجھے فکر ناصح فقط تو گریباں سلا جانتا ہے
فلک سیم تن سے ملاوے جو مجھ کو تو جانوں کہ جوڑا بنا جانتا ہے
زبس اس میں خوں ہوتے رہتے ہیں عاشق گلی کو تری کربلا جانتا ہے

1۔ ہاموں = جنگل، بیابان

میں باندھا ہے بازو پہ ہدہد کے نامہ — کہ یہ مرغ راہِ سبا جانتا ہے
میں عاشق ہوں، عاشق ہوں، عاشق ہوں عاشق — مرا حال شاہ و گدا جانتا ہے
بھٹکتا ہے جنگل میں لیلیٰ کا ناقہ — رہِ نجد بے چارہ کیا جانتا ہے
جو نجدی ہے ناقے کی خاکِ قدم کو — وہ اب تک بہ از توتیا جانتا ہے
دل و جان ہے ایک اس پر زمانہ — مجھے تجھ سے اب تک جدا جانتا ہے
چُرایا ہے دل میرا چھلّوں نے اس کے — یہ چوری وہ دزدِ حنا جانتا ہے
مسیحا سے کہتا تو میں دردِ دل پر — مسیحا کب اس کی دوا جانتا ہے
نہیں خط دیا میں نے ہاتھ اس کے اے گل — مرا حال پیکِ صبا جانتا ہے

جو ہے مصحفی سالکِ راہِ معنی
وہ اپنا مجھے مقتدا جانتا ہے

285

پہلو میں نہیں ہے جو مرا دل کئی دن سے — کیا جانے ہوا کس پہ وہ مائل کئی دن سے
اس فصل میں کیا اُٹھ گئے صحرا کو دوانے — گلیوں میں نہیں شورِ سلاسل کئی دن سے
تھا سینۂ صد چاک میں مرغِ قفسی دل — سو اس کو بھی ہم پاتے ہیں بسمل کئی دن سے
مجنوں کے کڑھانے کی مگر فکر ہے ناقہ — خالی لیے پھرتا ہے جو محمل کئی دن سے
خجلت سے نہ میں جاؤں نہ وہ مجھ کو بلاوے — پردہ ہے عجب طرح کا حائل کئی دن سے
اس در پہ کوئی جاوے تو کیا خاک خوش آوے — بھر دی ہے درازوں میں بھی کہگلِ [1] کئی دن سے
امکان نہیں وصل کا ناحق مرے دل کو — رہتا ہے اک اندیشۂ باطل کئی دن سے
ناخن کی خراشوں نے تراشے ہیں گل اس میں — ہے چہرہ مرا سیر کے قابل کئی دن سے
کوتاہیِ مدِ نگہِ شوق نے مارا — اب پھر نظر آتا نہیں ساحل کئی دن سے
دیکھا ہو کسی نے تو کوئی اس کو بتا دو — روپوش ہوا ہے مرا قاتل کئی دن سے

1۔ کہگل = لپائی کے لیے پھونس ملی مٹی (کاہ + گل)

اے مصحفی کہہ ایک غزل اور بھی اس میں
ہیں یار اسی بات کے سائل کئی دن سے

286

ہے اس صفِ مژگاں کے مقابل کئی دن سے پھر جان پہ کھیلا ہے مرا دل کئی دن سے
بال اس پہ نچوڑے تھے یہ کس بت نے نہا کر ہے کانِ گُہر دامنِ ساحل کئی دن سے
مجنوں سے، صبا جاوے تو اتنا ہی تو کہیو بیمار ہے پھر صاحبِ محمل کئی دن سے
آگے تو نہ تھا رنگِ قلق جو ہر دل میں یہ صید نظر آوے ہے بسمل کئی دن سے
پھرتا ہے وہ بے رحم کیے اپنے گلے میں شمشیرِ تغافل کو حمائل کئی دن سے
آشفتگیِ زلف کا کس کی یہ اثر ہے جو پانو میں الجھی ہے سلاسل کئی دن سے
اے یارو، خدا خیر کرے، تیوری چڑھائے بپھرا ہوا پھرتا ہے وہ قاتل کئی دن سے
اب روز وہ رستے سے نکل جاوے ہے دل کے کر دیتی ہے حیرت مجھے غافل کئی دن سے
اس شہر سے کرنے کو سفر چاہے ہے پھر دل ق پھر سر پہ چڑھی رہتی ہے منزل کئی دن سے
سو زاد[1] ہے نے راحلہ نے یار موافق پیش آئی ہے یہ زور ہی مشکل کئی دن سے

اے مصحفی دو دن نہ گیا میں تو وہ بولا
آیا نہیں در پر مرا سائل کئی دن سے

287

سن اے دلبر، تو میری جان رکھ لے مجھے آج اپنے گھر مہمان رکھ لے
تجھے ہے اے پری یہ حرز[2] کافی تو پاس اپنے مرا دیوان رکھ لے
گریباں تو لیا دستِ جنوں نے جو تجھ سے رہ سکے دامان رکھ لے
گلے میں ڈال دے ہاتھ اپنے ظالم کسی کے سر پہ تو احسان رکھ لے
مرا نامہ بھی ناموں میں سبھوں کے تو اے قاصد، کسی عنوان رکھ لے

1۔ زادوراحلہ = مراد اساماںِ سفر 2۔حرز = تعویذ

کہے ہے تیر اس کا مجھ سے آ کر کلیجے میں تو یہ پیکان رکھ لے
چھری ہے تیز وقتِ ذبح بسمل ذرا ہاتھ اپنا اے نادان رکھ لے
وہ بت ہے بدگماں چاہت میں تیری ٹک اپنی بات تو اس آن رکھ لے
قسم دے مصحفی گر تجھ کو وہ شوخ
اُٹھا کر سر پہ تو قرآن رکھ لے

288

ناخن اس شوخ کے مہندی سے جو رنگین ہوئے دلِ خونیں کے دسوں، باعثِ تسکین ہوئے
چمنِ وصل سے ہم اس کے جو گلچین ہوئے پھول بوسوں کے عنایت ہمیں دو تین ہوئے
تیرے عاشق پہ دمِ نزع قیامت گزری نوحہ گر جمع جب اس کے سرِ بالین ہوئے
کس سے سیکھا ہے تو اے سروِ خراماں، یہ چال تیری ٹھوکر میں تو دامن کئی بے چین ہوئے
جاں کنی سے ترے بیمار نے پائی نہ شفا اس کی بالیں پہ بہت قاریِ یٰسین ہوئے
قومِ موسیٰ ہی رہی حکمِ خدا سے غالب گو کہ قبطی[1] سببِ برہمیِ دین ہوئے
مصحفی سبطیوں[2] نے زور یہ عیاری کی
سب کا زیور جو وہ لے راہی قلتین[3] ہوئے

289

غیر[4] کے گھر میں وہ جا شب گلِ بالین ہوئے خواب میں بھی نہ مرے باعثِ تسکین ہوئے
صدفِ ذر تھے گر آویزۂ گوہر سے وہ کان پہنے فیروزے تو ٹک اور بھی سنگین ہوئے
حشر کے دن بھی نہ سرخشتِ لحد سے اُٹھا خواب ہم خفتہ نصیبوں کے یہ سنگین ہوئے
قتل سے ہاتھ اُٹھایا کہیں تب قاتل نے خوں سے جب کشتوں کے میداں کئی رنگین ہوئے
ہو گہر پوش جو وہ بام پہ آیا شبِ عید جلوہ گر چرخ پہ سو خوشۂ پروین ہوئے

1۔ قبطی = قدیم مصری قوم 2۔ سبطی = قومِ موسیٰ 3۔ قلتین = پہاڑ کی چوٹیاں
4۔ ج : غیر کے جا کے وہ ہر شب

ہوئے ہندو جو مسلماں تو مسلماں ہندو دیکھا اسے یوں ہی بہت دین سے بے دین ہوئے
کیوں نہ اس مہ کے تئیں خواب فراغت آوے سیج پر جس کی ستارے گُل نسرین ہوئے
مصحفی قید محبت میں جو رک کر بیٹھے
وہ ہی مشہور زمانے میں سلاطین ہوئے

290

گو گود صبا تیری پھولوں سے بھری ہوگی ہم وے نہیں جو ہم سے حسرت نظری ہوگی
مرغِ قفسی کو تو اے دل، کوئی رقعہ دے گلشن سے روانہ کل بادِ سحری ہوگی
شمشیر جفا اس نے پھر سان پہ رکھی ہے کیا جانیے کس کس پر بیداد گری ہوگی
وہ روز بھی آتا ہے نزدیک جو اے قاتل اک روز ترے در پر نعش اپنی دھری ہوگی
ہووے گا مزہ تو تب جب نجد میں جا لیلیٰ پرسان غم و دردِ قیس ہنری ہوگی
غیرت سے رگ گل بھی لوٹے ہے پڑی خوں میں اب اس سے زیادہ کیا نازک کمری ہوگی
جو دستِ حنائی کا ہووے گا ترے کشتہ پھولوں کی چھڑی اس کی تربت پہ دھری ہوگی
گلشن کی ہوا اس کو کھانے دے ٹک ایک اے گل، آخر تو صبا یاں سے اک دن سفری ہوگی
تیرا ہی بھروسا تھا، معلوم نہ تھا مجھ کو اے آہِ سحر تجھ میں یہ بے اثری ہوگی
جبریل کا شہپر یاں کرتا ہے تہی پہلو بازوے کبوتر سے کب نامہ بری ہوگی
گریے سے جگر کا سب بہہ جائے گا گر پانی تو بھی بُنِ مژگاں میں عاشق کے تری ہوگی
اک گل کا نہ پیراہن ثابت نظر آوے گا ایسی ہی گلستاں میں گر جامہ دری ہوگی
سورج کی کرن ہرگز ہونے کی نہیں روکش جس وقت ترے بَر میں پوشاکِ زری ہوگی
کاہے کو کوئی عاشق دیوے گا کسی کو دل ایسی ہی زمانے میں گر مفت بری ہوگی
بویا تھا میں نخلِ غم لیکن نہ یہ سمجھا تھا اس نخل کے طالع میں یہ بے ثمری ہوگی
اے مصحفی اخگر کو مت دیکھ بہ چشمِ کم
راکھ اس کی جو ٹک سرکی یہ شعلہ پری ہوگی

291

یا جان ہی جاوے گی مری دھیان میں اس کے ‌ ‌ ‌ یا ہاتھ ہی پہنچے گا گریبان میں اس کے

گر اس نے قدم رنجہ کیا ہے مرے گھر تک ‌ ‌ ‌ جھنتے[1] بھی تو کچھ پڑ نہ گئے شان میں اس کے

کس طرح ترے تیر سے ہووے گی رہائی ‌ ‌ ‌ الجھی ہے رگِ جاں مری پیکان میں اس کے

کیا اس پہ مصیبت تھی کہ شبِ برق کا شعلہ ‌ ‌ ‌ چھپتا تھا سنجافِ تہِ دامان میں اس کے

دولت پہ نہ نازاں ہو کہ قاروں کا خزانہ ‌ ‌ ‌ اُٹھ جاوے ہے خرچِ مسّی و پان میں اس کے

گل چہرہ برافروختہ ہے، بادِ صبا نے ‌ ‌ ‌ کیا جانیے کیا پھونک دیا کان میں اس کے

مشاطہ کہیں دل کو مرے صدمہ نہ پہنچے ‌ ‌ ‌ شانہ تو نہ کر زلفِ پریشان میں اس کے

چھٹتا نہیں عاشق سے ترے تیرا تصوّر ‌ ‌ ‌ بے طرح سمایا ہے دل و جان میں اس کے

اے مصحفی ہے بھیڑ عبث تشنہ لبوں کی
پانی ہی نہیں چاہِ زنخدان میں اس کے

292

رکھتے تھے ہم تو تم سے صنم صاف دوستی ‌ ‌ ‌ لائی نہ تم کو برسرِ انصاف دوستی

دو دن کی ہے جو گرمیِ ظاہر، فریب ہے ‌ ‌ ‌ رکھتا ہے کب کسی سے وہ حرّاف[2] دوستی

میمِ دہن نے اس کے کیا مجھ پہ عرصہ تنگ ‌ ‌ ‌ پڑھوائے کیوں نہ مجھ سے چہل کاف[3] دوستی

میں بے ادب نہیں کہ رکھے ہے مری نگاہ ‌ ‌ ‌ چہرے سے لے کے تا شکم و ناف دوستی

جب تن پہ ہو یہ صدمہ تو کس طرح کر نہ دے ‌ ‌ ‌ ہر استخواں کو پنبۂ ندّاف دوستی

اس جعد میں مبافِ زری کس طرح پڑا ‌ ‌ ‌ رکھتی نہ تھی وہ گر بہ زری باف دوستی

لافِ گزاف سے نہیں کچھ مصحفی کو کام
ہے بے گزاف عشق تو بے لاف دوستی

1۔ جھنتے پڑنا = داغ دار ہونا ‌ ‌ 2۔ حرّاف = عیار ‌ ‌ 3۔ چہل کاف = ایک دعا جس میں حرف کاف کا استعمال چالیس بار ہوا ہے۔

293

بوسے سے گیسوؤں کے جو منھ مہک رہا ہے جی رات کے مزے میں اب تک بہک[1] رہا ہے
عاشق کو تیرے پیارے ساقی شراب کیا دے الفت کے وہ نشے میں آگو ہی چھک رہا ہے
بر روے ماہتابی شاید وہ ماہ آیا اس شب جو دیدۂ مے اودھر ہی تک رہا ہے
طعنوں کو مدّعی کے جھیلا کریں کہاں تک ان باتوں سے کلیجا اپنا تو پک رہا ہے
لالے کا کھیت اس کو اے دوستو، نہ جانو آتش سے میرے دل کی صحرا دہک رہا ہے
اے دل وہ جان وتن سے حاضر ہوا، دوانے ملنے میں اس کے تجھ کو کیا اب بھی شک رہا ہے

باتوں پہ مصحفی کی اس وقت تم نہ جانا
کیا جانے کیا نشے کی دھن میں وہ بک رہا ہے

294

شاید کہ کوئی قیدی کچھ کھا کے مر رہا ہے زنداں میں آج تو کچھ نوحے کی سی صدا ہے
ہر چند وصل کا تو عالم بندھا ہوا ہے عاشق کو ہجر کے بھی جینے میں اک مزا ہے
مقتل سے ننگے پانو قاتل مگر گیا ہے دیتا ہے بوے خوں جو رستے میں نقشِ پا ہے
کیا جانے کون دل کے پردے میں بولتا ہے اتنا میں جانتا ہوں آواز آشنا ہے
تیغ نگہ کی اس کے تھی بسکہ آب میٹھی ہر زخم سینہ میرا ہونٹ اپنے چاٹتا ہے
ٹک نجد کی طرف بھی اے ناقہ کش گزر کر لیلیٰ کی اک دیوانہ واں راہ دیکھتا ہے
لالے کے پھول کیا کیا ایڑی سے مل نہ ڈالے شوخی میں اس پری کا رنگِ کفک بلا ہے
مرغ اسیر پر کیوں آوے نہ مجھ کو رونا اک برگ گل کی خاطر منت کشِ صبا ہے
بت خانے تجھ بن اے بت، سنسان سب پڑے ہیں نے شورِ برہمن، نے ناقوس کی صدا ہے
باتوں ہی میں رکھا ہے، اس خستہ جاں کو برسوں کوئی بھی سچّا وعدہ تم[2] نے بھلا کیا ہے

1۔ ج : بھٹک   2۔ ج : تو نے

پیارے نہ مصحفی کو ترسا بہت کہ آخر
جی جان سے وہ تیرا عاشق ہے، مبتلا ہے

295

اپنا مکھڑا ہمیں آ کر کبھی دکھلاتے ہی — تم میں الفت کچھ اگر ہوتی تو[1] تم آتے ہی
چین تھا دل کو تو جب تک کہ صنم بیٹھا تھا — یاں فلک ٹوٹ پڑا بس ترے اُٹھ جاتے ہی
میری حالت سے مرے دوست جو ہوتے آگاہ — لاکھ صورت سے اُسے گھر میں مرے لاتے ہی
چین سے بیٹھے تھے، شانے نے یہ کیا قہر کیا — جی گیا اور اُلجھ زلف کے سلجھاتے ہی
سرکشی وہ نہ رہی اس کی جو تھی صبح کے وقت — شاخِ گل ٹوٹ پڑی پھول کے کمھلاتے ہی
مصحفی ہم کو تو رہباں نے نہ دی رخصتِ دیر
ورنہ[2] واں دل کو کسی شکل سے بہلاتے ہی

296

بالی کے، نہ بندے کے، نہ گوہر کے حوالے — میں دل کو کیا زلفِ معنبر کے حوالے
ہو جاوے وہ جل کر کے وہیں خاک کی ڈھیری — یہ داغِ جگر کیجیے جو پتھر کے حوالے
دوری نے تری تیغِ تغافل لی کیا ہے — سینے کے ورق کو خط مسطر کے حوالے
واں چین سے سوتا ہے کوئی بسترِ گل پر — یاں ہر سر مو ہے مرا نشتر کے حوالے
جس شیشے سے پتھر پہ بنی صورتِ شیریں — وہ تیشہ کیا چاہیے بت گر کے حوالے
اُڑتا ہوا پھرتا ہے مرا نامہ، کیا تھا — کس ساعتِ بد میں نے کبوتر کے حوالے
نقطوں کو سیہ دانہ سمجھ، کر دیا آخر — خط پھاڑ کے اس نے مرا مجمر کے حوالے
سائل جو ہوا وصل کا میں اس سے تو بولا — اس کام کو کر تو بھی مقدر کے حوالے
آشفتہ سری، سلسلہ مویانِ جنوں کا — ہونے نہیں دیتی ہے سر افسر کے حوالے
محضر جو مرے خون کا یاروں نے لکھا ہے — ہے جی میں کروں قاضیِ محشر کے حوالے

1۔ ج تم جو آتے ہی 2۔ اصل نہیں واں

اے مصحفی تو اور بھی رنگیں کئی مضموں
اس بحر میں کر طبع سخنور کے حوالے

297

گجرا ہے وہاں ساعد دلبر کے حوالے — یاں ساعد گل خوردہ ہے نشتر کے حوالے
جو چاک گریباں کے سزاوار نہ دیکھا — میں اس کو کیا پھاڑ[1] کے صرصر کے حوالے
فرمائش معشوق بجا لایئے آپہی — نے یار کے کیجے نہ برادر کے حوالے
ساقی تو لبالب ہی پھر اس کو نہ روا رکھ — شیشے کا گلا[2] کیجے خنجر کے حوالے
طوفاں کے تلاطم سے خدا اس کو بچاوے — کشتی مرے گن کی ہے نہ لنگر کے حوالے
سینے سے مرے بوے کباب آوے نہ کیونکر — یاں لخت جگر میں کیے اخگر کے حوالے
جب آئے ہم افسوں گری شعر و سخن پر — شیشے کی نزاکت ہوئی پتھر کے حوالے
یک قطرۂ خوں میرے اُسیلم[3] سے نہ نکلا — سو بار کیا اس کو میں نشتر کے حوالے
پہلے تو جلا خاک کیا مجھ کو فلک نے — پھر خاک بھی کی لطمۂ صرصر کے حوالے
اوّل تو دیا تھا کہ تو ہے صاحب عصمت ق کیجو اسے اس طفلِ سمن بر کے حوالے
پھر جی میں جو سوچا تو کیا نامے کو اپنے — جبریل سے لے کر میں کبوتر کے حوالے

باعث سے قناعت کی ملا مصحفی مجھ کو
وہ ملک کہ جو تھا نہ سکندر کے حوالے

298

دُکھ نہ دیکھو کہیں خوباں کی ملاقاتوں سے — دور ہی رکھیو تو یارب مجھے ان باتوں سے
پات[4] کس گل کے یہ کانوں کے نظر آئے انھیں — منھ چھپاتے ہیں خجل ہو کے جو گل پاتوں سے
کیونکہ گریے سے مرے ہووے زمانے کو خوشی — سچ ہے ہوتا ہے سماں ایسی ہی برساتوں سے

1۔ ج دامنِ صحرا کے حوالے 2۔ ج گلا ہو دم خنجر کے حوالے 3۔ اُسیلم = ہاتھ کی رگ
4۔ کانوں کے پات (پتے) = کان کا ایک زیور

گر کبھی شعبدۂ حسن کا عالم دیکھیں
زاہدِ شہر کریں توبہ کراماتوں سے

نہ کرو ہم نفسو، ہجر کی راتوں کا بیاں
اب تلک پہلو میں دل کانپے ہے ان راتوں سے

تیرے بیمار کا سمجھا نہ کوئی مقصدِ دل
کچھ وہ کہتا تھا پر آنکھوں کی اشاراتوں[1] سے

گرچہ رہتے ہیں وہ صحرا میں پر اس پر بھی صنم
چشمِ آہو نہیں ایمن تری سم گھاتوں سے

گرچہ پہلو میں رہا دل تو مرا پر اس پر
صدمہ پہنچا ہے کئی عشق کی آفاتوں[2] سے

چاند کے ٹکڑے ہیں ان حوریوں کے گورے بدن
مصحفی مارے پڑے ہیں ہم انھیں گاتوں سے

299

بدن سے جان کو کیونکر نکال ڈالے کوئی
نہ سنبھلے دل تو بھلا کس طرح سنبھالے کوئی

ہمیں تو اس دلِ بے صبر نے کیا رُسوا
نہ اپنی جان کا دشمن بغل میں پالے کوئی

رصاص[3] جلوہ بتاں جب[4] ہوں رام گرمی سے
کہ دفعتاً انھیں سانچے میں لاکے ڈالے کوئی

یہ مثلِ روح نہیں زیست تک جدا ہوتی
بلائے ہجر کو کس طرح سر سے ٹالے کوئی

ہماری آنکھوں کے چشمے نہیں ہیں اتنے لئے
کہ ان میں مصحفی اپنا بدن کھنگالے کوئی

300

ہلاؤں لب تو کرے احتمال اس میں بھی
رہوں خموش تو ہو پُر ملال اس میں بھی

سنا تھا ترکِ محبت میں ہے بڑا آرام
اُٹھائی ہم نے تو ایذا کمال اس میں بھی

اگر میں اس سے کہوں تو ہی ترک کر مجھ کو
مزاجِ دوست پہ آوے ملال اس میں بھی

کمندِ آہ کو میری تو نارسا نہ سمجھ
اسیر ہیں کئی رعنا غزال اس میں بھی

خموش ہوتے ہیں ہم ایک جنبشِ لب میں
کٹے ہے اپنی زبانِ سوال اس میں بھی

1،2۔ اشاراتوں، آفاتوں (جمع الجمع کا استعمال)
3۔ رصاص = رانگ (ایک نرم دھات)
4۔ج جب بنے ہوں گرمی سے

نکل نہ جامۂ عریاں تنی سے اے مجنوں — تو مل کے خاک سج اپنی نکال اس میں بھی
میں تیرے واسطے لایا ہوں دل کا آئینہ — ذرا تو دیکھ لے اپنا جمال اس میں بھی
قفس سے چھوڑ دے مرغ اسیر کو صیاد — وہ پر شکستہ[1] رہا ایک سال اس میں بھی
اگر تجھے کوئی ناخن سے اس کے دے تشبیہ — ہے اپنی موت تو بس اے ہلال اس میں بھی
وہ بوسہ دینے پہ راضی تو ہے پہ سوچے ہے — کہ آدمی کو ہے اک انفعال اس میں بھی
ہے ذات سے بھی پرے مرتبہ صفات کا یاں — غرض کہ بھٹکے ہے اپنا خیال اس میں بھی
کنارہ کر نہ مرے حوضِ چشمِ تر سے صنم — کہ خوب رو سبھی دھوتے ہیں بال اس میں بھی

اگرچہ مصحفی مشکل تو تھی نشستِ ردیف
پہ تو نے رکھی عجب بول چال اس میں بھی

301

روٹھے آ ملتے ہیں جن میں کہ وفا ہوتی ہے — ہم نہ سمجھے تھے محبت میں دغا ہوتی ہے
اے شبِ وصل نہ جا چھوڑ کے مجھ کو تنہا — ورنہ قالب سے ابھی روح ہوا ہوتی ہے
جان جاتی ہے اسی میں تو جو نافہم ہو یار — الفت اک طرف کی البتہ بلا ہوتی ہے
ایک پرزہ نہ گریباں کا وہاں پہنچایا — نامہ برکس کی تو اے بادِ صبا ہوتی ہے
اشک تبرید کی جا ملتے ہیں اس کو ہر صبح — روز بیمار محبت کی دوا ہوتی ہے
تیرے کوچہ کی طرف منہ نہیں کرتا رستم — وہ ہی جاتا ہے ادھر جس کی قضا ہوتی ہے

یاں مرا کام ہوا جاوے ہے واں آئینے میں
مصحفی ساتھ ادا کے بھی ادا ہوتی ہے

302

بے طرح دل میں سمائی ہے محبت تیری — کیا کرے گی نہیں معلوم یہ الفت تیری
مجھ کو کچھ بن نہیں آتا ہے تو آئنہ مثال — ہو کے حیران سا دیکھوں ہوں میں صورت تیری

1۔ اصل: تو ہے پر ملال

فکر ان کی بھی ہے کچھ تجھ کو جو لے جاویں گے کل سامنے داورِ محشر کے شکایت تیری
ہم تو ناچیز ہیں کب اتنا دہن رکھتے ہیں بوسۂ لب جو تو دے، ہے یہ رعایت تیری
کمرِ یار ذرا منھ سے اُٹھا دے پردا ۔ رگِ گل دیکھنے آئی ہے نزاکت تیری
مجھ سے[1] عاشق کو جو یوں چھوڑ دیا ہے اغلب ان دنوں پھر طرف غیر ہے رغبت تیری
مصحفی وصل کے عالم میں بھی بے تاب ہے تو
دل سے کم بخت نکلتی نہیں حسرت تیری

303

تصویر تیری پیارے ہم نے لگا رکھی ہے پھر تازہ دوستی کی اُس سے بنا رکھی ہے
کھولا تو ہے مرقع پر جان اس کا طالب مانی نے تیری صورت مجھ سے چھپا رکھی ہے
بیمارِ غم نے تیرے جس گھر میں جان دی تھی پُڑیوں میں طاق پر واں اب تک دوا رکھی ہے
خوں تا کمر بہے ہے گلیوں میں شہر کی، شب ب سے کمر میں اس نے تیغِ جفا رکھی ہے
ہر برگ کو کیا ہے آوارۂ گلستاں کیا تو نے گل کی خاطر بادِ صبا رکھی ہے
یکبار ملتے ملتے رُک جاوے ہے وہ ووں ہی اس خوش ادا نے ہم سے یہ بھی ادا رکھی ہے
کچھ بھید اس کا ہم پر کھولا نہیں خدا نے پتلے میں خاک کے یہ کیسی ہوا رکھی ہے
گزرا تھا ہجر کی شب جو یارو ہم پر اس بن نامے میں سب حقیقت ہم نے لکھا رکھی ہے
ساقی کا ہوں میں بندہ یعنی کہ میری خاطر شیشے میں تھوڑی سی مے اس نے لگا رکھی ہے
گھر مصحفی کے جا کر دیکھا جو میں تو رو رو
آنکھوں سے اس نے خوں[2] کی ندّی بہا رکھی ہے

304

اب آفتابِ عمر کو وقتِ غروب ہے ہم کو پیامِ مرگ بھی آوے تو خوب ہے
کیجیو نہ اس کو طرّۂ دستارِ گل رُخاں بادِ صبا یہ تربتِ لیلیٰ کی دوب ہے

1۔ج مجھ سے عاشق کے تئیں چھوڑ دیا ہے شاید 2۔ ج ندّی خوں کی بہا رکھی ہے

جس کی صفا کو خوشۂ پرویں نہ لگ سکا کانوں میں اس پری کے وہ عقدِ حبوب[1] ہے
کس سرو قد کے باغ میں آنے کی ہے خبر جو پیشتر ہی سروِ سہی پائے کوب ہے
ڈوبے ہوئے کو اور بھی ٹک دیتے ہیں ڈبا بس ملک میں تمھارے ہی خوباں یہ ڈوب[2] ہے
غنچہ کے منھ پہ سرخی سی کچھ آتی ہے نظر شاید نسیم صبح کا وقت ہبوب ہے
حیراں ہیں ہم تو بس اسی نکتے میں مصحفی
کیا شے ہے وہ، وہ جس سے عزیز القلوب ہے

305

ترے کوچے میں قیدِ غم سے دل آزاد ہوتا ہے مسلماں دیکھ کر مسجد کو جیسے شاد ہوتا ہے
کبھی غنچوں کو مسلے ہے، کبھی پھولوں سے کھیلے ہے نسیم صبح کے ہاتھوں چمن برباد ہوتا ہے
چمن سے ہو کے آوارہ رہے ہم دور مقصد سے کب اب ہم سے سراغ خانۂ صیاد ہوتا ہے
ملے ہے جس طرح ہر روز اس کو تازہ رعنائی ہمیں بھی اس طرح اک دل نیا امداد ہوتا ہے
ذرا اس شوخ سے کہہ دو کہ آوے رحم پر ورنہ گلوے خامشی آمادۂ فریاد ہوتا ہے
عجائب معجزہ صانع نے رکھا ہے یہ خوباں میں جسے ویراں یہ کرتے ہیں وہی آباد ہوتا ہے
گرفتاری کا اپنی سوچ کرتا ہوں تو کہتا ہوں کوئی کیونکر کسی کے دام سے آزاد ہوتا ہے
یہ محوِ زلفِ خوباں ہوں کہ بعد از مرگ تن میرا برائے شانہ صرفِ قامتِ شمشاد ہوتا ہے
سبق میں عشق کے حیراں ہیں ہم تو دونوں اے مجنوں نہ مجھ کو یاد ہوتا ہے، نہ تجھ کو یاد ہوتا ہے
ابھی خونِ جنوں نکلا نہیں ہے فصد سے میری تو ناحق درپئے بند اس کے اے فصاد ہوتا ہے
غبارِ وادیِ مجنوں نہیں ہے اس بگولے میں صبا جو سامنے محمل کے یوں برباد ہوتا ہے
تڑپتے ہیں پڑے ہم نیم بسمل آہ کیا جانے کسی کا کام کیونکر تجھ سے اے جلاد ہوتا ہے
نہیں اے مصحفی خوباں کو آتا رحم عاشق پر
دل ان سنگیں دلوں کا کس قدر فولاد ہوتا ہے

1۔ عقدِ حبوب = گولیوں یعنی موتیوں کی لڑی 2۔ ڈوب = شرم کی بات

306

الفت کا تری دل سے مرے خار نکل جائے　جھگڑا ہی چکے جان جو اک بار نکل جائے
لے بوسۂ سیبِ ذقن اس کا بہ تصوّر　تیری بھی ہوس اے دلِ بیمار نکل جائے
یا وصل میسّر ہو ہمیں اس کا الٰہی　یا دل سے تمنائے دلِ زار نکل جائے
آ بیٹھے جو بالیں پہ دمِ نزع تو اس کے　عاشق کی ترے حسرتِ دیدار نکل جائے
تا فصد کی حاجت نہ ہو اس فصل میں تم سے　اتنا لہو، اے دیدۂ خونبار نکل جائے
دیکھے جو تری شکل کو بت خانے سے رہباں　ناقوس پٹک، توڑ کے زنّار نکل جائے
ہے دل پہ مسلّط ترے گیسو کا تصوّر　اس دام سے کیونکر یہ گرفتار نکل جائے
کیا چھوٹ کہوں تیر کے نالے کی میں اپنے　چھوٹے جو ابھی توڑ کے دیوار نکل جائے
جانے دو، مجھے بر سرِ تقریر نہ لاؤ　کیا جانیے کیا منھ سے بہ یک بار نکل جائے

کوئی اور تو صورت ہی نہیں وا شدِ دل[1] کی
صحرا کو مگر مصحفیِ زار نکل جائے

307

کھو دیا چین مرا راتوں کی بے خوابی نے　مار ڈالا دلِ بے تاب کی بے تابی نے
سرکشوں سے خمِ شمشیرِ سیاست کے تلے　سجدے کروائے ترے ابروے محرابی نے
گھر جو ہوتا تو کچھ اسباب بھی ہوتا، سچ ہے　کم بغل ہم کو رکھا گھر کی کم اسبابی نے
ہر خیاباں میں لہو مجھ کو رُلایا ظالم　لالۂ سرخ ترے رنگ کی سیرابی نے

مصحفی خیر ہے کیا چشمِ ملائک کے تئیں
خوں رُلایا ہے تری فندقِ عنّابی نے

308

دنیا میں اگر چاہے ہے آرام کی روٹی　وہ کام تو کر کھاوے ہے جس کام کی روٹی

1۔ وا شدِ دل = دل کی گرہ کا کھلنا

افسوس کہ لی چھین نصاریٰ کے سگوں نے　یوں ہاتھ سے اس فرقۂ اسلام کی روٹی
جو فن ہے ترا اس کے سوا اور بھی کچھ کر　جز اجی فزوں کرتی ہے حجام کی روٹی
مانندِ تنور آگ میں فاقوں کی جلا کر　پکّا ہے تو کھا مت تو کسی خام کی روٹی
خورشید کے مانند میں اک ناں پہ ہوں قانع　جو صبح کا کردا[1] ہے وہی شام کی روٹی
صیّاد ہے یہ چرخِ جفاکار سمجھ تو　جوں موش نہ کھا اس کے تہِ دام کی روٹی
کہتا ہے یہی رنگِ شفق ڈوبے ہے ہر شام　یاں خون میں خورشیدِ لبِ بام کی روٹی
ہمسایے سے آٹا تو نہ لے قرض دوانے　کر فاقے پہ فاقہ پہ نہ کھا وام کی روٹی
چھوڑے گی موئے پر بھی نہ ہرگز ترا پیچھا　جاوے گی ترے ساتھ رہ انجام کی روٹی

اے مصحفی دل خوں ہے مرا جورِ فلک سے
کیا کہیے میں کھاتا ہوں کس الزام کی روٹی

309

فقط نہ گریے سے اس چشمِ نم کو آگ لگی　بسانِ شمع جلا سر، قدم کو آگ لگی
کیا جو اس پہ میں رازِ دلِ برشتہ رقم　ورق کباب ہوا اور قلم کو آگ لگی
نہ امتیاز کیا برقِ حسن نے تیرے　نقاب اُٹھتے ہی دیر و حرم کو آگ لگی
شرابِ حُسن کا اس کے جو کچھ چلا مذکور　صراحی گرم ہوئی جامِ جم کو آگ لگی
غریبِ شامِ فراق اس کا شب یہ رویا خوں　کہ رشک سے شفقِ صبح دم کو آگ لگی
خطِ سیہ سے جلا اس کے عنبرِ شبِ قدر　عذار دیکھ کے باغِ ارم کو آگ لگی
تپِ فراق نے اب اس قدر جلایا جی　کہ جی ہی جی میں مرے غم سے غم کو آگ لگی
عدم کے لوگ یہاں آتے ہیں جو سب عریاں　یہ کس کی آہ سے شہرِ عدم کو آگ لگی
حنائے پا سے ترے سروِ خوش خرام مرے　اِدھر تو دیکھ کہ نقشِ قدم کو آگ لگی
برنگِ شعلۂ آتش جلے ہے رشک سے تیغ　یہ کس کے خوں سے سنانِ علم کو آگ لگی

1۔ کردا = مُرادروٹی

نہ ہووے دشت اجم کیوں گلال یار کے رنگ　　　که دودِ آه سے دشتِ[1] اجم کو آگ لگی

یہ آہ و نالے ہیں گر تیرے مصحفی شب ہجر
تو دیکھ لیجو تجھے کوئی دم کو آگ لگی

310

کبھی پانو، نہ اس کی گلی میں گئے، کبھی ہاتھ نہ طوق کمر کے ہوئے
رہے ضعف کے مارے جو گھر میں پڑے غمِ ہجر سے ٹکڑے جگر کے ہوئے

کبھی دنیا کے واسطے دل ہوا خوں کبھی فکر میں دیں کی حال زبوں
رہا ہم کو سدا یہی اب تو جنوں، نہ ادھر کے ہوئے، نہ اُدھر کے ہوئے

ہمیں تیری قسم، ترے سر کی قسم کہ بحکم فزونیِ گریۂ غم
ترے دانتوں کی یاد میں روئے جو ہم تو یہ اشک بھی رشک گُہر کے ہوئے

نہ بتوں کو ہی دیر میں سجدہ کیا، نہ حرم میں ہی نام خدا کا لیا
انھیں کام کسی سے بھی کچھ نہ رہا، وہ جو دل سے گدا ترے در کے ہوئے

کیا تو نے چمن میں جو جلوہ صنم، پڑے پھولوں پہ تیرے جو نقش قدم
یہی رشک کی جاگہ ہے ہائے ستم وہی آئنے شمس و قمر کے ہوئے

وہ جو لوگ ہیں عشق میں دل کے کڑے، صف جنگِ مژہ میں رہے جو کھڑے
مارے تیروں کے رخنے جگر میں پڑے، مارے تیغوں کے پرزے سپر کے ہوئے

میاں مصحفی کل جو چمن میں گئے گل تازہ کو ڈھڈہا دیکھ کے وے
کبھی پھولوں کی ڈالی کے گرد پھرے کبھی صدقے نسیمِ سحر کے ہوئے

311

نامے میں کوئی حرف نسنجیدہ[2] نہ ہووے　　　یہ ڈر ہے کہ خاطر تری رنجیدہ نہ ہووے

1۔ ج میرے اجم　2۔ نسنجیدہ = غیر سنجیدہ (یہ لفظ غالباً مصحفی کا وضع کردہ ہے)

دل سینے میں جلتا تھا رہا اتنا ہی آخر جوں غنچۂ افسردہ کہ بالیدہ نہ ہووے
وہ وضع تو اپنی نہ بنا اے بتِ کافر، جو وضع کہ خوباں کے پسندیدہ نہ ہووے
ہے موجِ نسیم سحری صبح سے غائب زلفوں کی شکن میں کہیں پیچیدہ نہ ہووے
گل چیں بہ جبیں دیکھ اسے مر گئے ہم تو معشوق سے اتنا کوئی ترسیدہ نہ ہووے
عزّت ہی نہیں سلسلۂ عشق میں اس کی آشفتہ سرِ عشق جو ژولیدہ نہ ہووے
پوشیدہ کروں ہوں میں غمِ عشق کو لیکن بے صبری یہ چاہے ہے کہ پوشیدہ نہ ہووے
ہے دیر سے نوحے کی صدا از پس[1] محمل فریاد کناں قیسِ ستم دیدہ نہ ہووے
وہ دن نہیں آتا کہ خطِ تازہ نوشتہ دیوار و درِ دوست پہ چسپیدہ نہ ہووے
خطرہ ہے کہیں وادیِ محشر کی طرف کو مقتل سے رواں یہ سرِ غلطیدہ نہ ہووے
کیا خاک مزہ دیوے، کبابِ دلِ عاشق جب تک نمکِ سودہ[2] میں غلطیدہ نہ ہووے

اے مصحفی اتنی تو نہ فریاد کیا کر
نالوں سے گلا تیرا خراشیدہ نہ ہووے

312

تہمتِ عشق کی رسوائی بری لگتی ہے آرزوے دلِ شیدائی بری لگتی ہے
سوچ کرتا ہے جو[3] اتنا اسے دل دینے میں مجھ کو اس شخص کی دانائی بری لگتی ہے
دل تو رکھتا میں شکیبائی پہ فرقت میں تری پر کروں کیا کہ شکیبائی بری لگتی ہے
اس کی زلفوں سے الجھتی ہے تو کیوں موجِ نسیم تیری یہ وضع تو سودائی بری لگتی ہے
طالبِ حسن ہیں سب زاہد و ملّا سچ ہے کس کو خوباں کی خود آرائی بری لگتی ہے
حسن پر لالہ ستاں میں ہیں بہت گل مجھ کو لالۂ سرخ کی رعنائی بری لگتی ہے

1۔ ج۔ صدا در پسِ محمل 2۔ نمک سودہ = پسا ہوا نمک 3۔ ج: ذرا جو اسے دل دینے میں

اتنا تنہائی سے ناداں جو تو گھبراتا ہے
مصحفی کیا تجھے تنہائی بری لگتی ہے

313

یہ تو مشکل ہے کہ دنیا میں بدن رہ جاوے تو بدن ہی سمجھ اس کو جو سخن رہ جاوے
رنگیو خوں میں اسے خوب بدن کے زخموں، کشتۂ عشق کا سادہ نہ کفن رہ جاوے
دلِ وحشی کو ترے خال نے یوں ٹھور رکھا[1] کھا کے گولی کوئی جس طرح ہرن رہ جاوے
باغباں، اس کو غنیمت ہی سمجھ تو اس سال دستِ گلچیں سے گر اک برگِ سمن رہ جاوے
گرد ہے شمع کے پروانہ مجھے یہ ڈر ہے خاک ہو کر کے نہ یہ سوختہ تن رہ جاوے
مومیائی ہو شکستِ دل عاشق کے لیے کاش اس وضع کی زلفوں میں شکن رہ جاوے
لبِ شیریں ترے گلشن میں جو وا ہوں بہ سخن شرم سے غنچۂ گل بستہ دہن رہ جاوے
مرگ اس شخص کی حسرت کی جگہ ہے جس کی راہ سب طے ہو کچھ اک دور وطن رہ جاوے
مصحفی وصل کی شب سارے مزے لوٹوں میں یار
ٹک بھی گردش سے اگر چرخِ کہن رہ جاوے

314

حیف جلووں کی ترے چار طرف دھوم رہے ہووے جو شخص کہ عاشق وہی محروم رہے
خواب میں بھی کبھی دیکھا نہ رخِ روزِ وصال ہم تو بھر عمر شبِ ہجر میں مغموم رہے
سایہ ساں میں تو نہ چھوڑوں گا تمھارا پیچھا سخت دلدادہ ہوں یہ آپ کو معلوم رہے
پھل محبت کا انھیں لوگوں کے کچھ ہاتھ آیا ہو کے عاشق جو ترے عشق میں معصوم رہے
جب ہو یہ شدت دودِ نفس سوختگاں کیوں نہ ہر چار طرف کالی گھٹا[2] جھوم رہے
آشیاں بلبلِ شیدا نے لیا[3] اپنا اٹھا کہہ کے یہ بات کہ اس باغ میں اب بوم رہے
یارو[4] اس صید کے بچنے کی بھلا کون سی راہ جس کے دن رات چھری بر سرِ حلقوم رہے

1۔ ٹھور رکھا = مار رکھا 2۔ ج: غم کی گھٹا 3۔ ج: اٹھایا اپنا 4۔ ج: کچھ بھی اس

شام کے وقت بھی وہ بت[1] نہ ملے کیا مجھ سے — باز خصمی[2] سے مری گر فلکِ شوم[3] رہے
زلف خواہاں ہے کہ ہو شام میں آشوب مدام — رخ یہ چاہے ہے کہ فتنہ طربِ روم رہے
کر لے وہ کام تو یاں نیک ہو ثمرہ جس کا — آخر اک روز تو ظالم سے نہ مظلوم رہے
نقلِ دیواں لی مری کچھ نہ عرب والوں نے — ساکنِ فرس بھی نت طالبِ منظوم رہے
مصحفی تو نے تو سب کھو ہی دیا زیورِ فکر
یہ نہ سمجھا تو کہ پاس اپنے بھی اک ٹوم[4] رہے

315

کہنے کو میرے شاید وہ شوخ مان جاوے — دو باتیں اس سے کرلیں گو اس میں جان جاوے
خط زیست میں نہ پہنچا اب کاش سگ ہی میرا — اس کی گلی میں لے کر اک استخوان جاوے
اس رشکِ مہ کی خاطر جب دل پہ یہ قلق ہو — کیونکر نہ نالہ ہر شب تا آسمان جاوے
طغیانِ فوجِ شب سے دل خوں ہے اپنا یارب — لشکر تک آسماں کے نالے کا بان جاوے
کہتے ہیں یار اے دل مجنوں جہاں رہے ہے — اے کاش ناقہ اودھر لے ساربان جاوے
کیا منع میں کیا ہے بادِ صبا کو وہ بھی — آوے گلی میں اس کی اور خاک چھان جاوے
افسوس مصحفی کا آتا ہے مجھ کو یارو
یوں بے گناہ مارا یہ نوجوان جاوے

316

تنہا نہ خونِ دل ہی کے پینے پہ حرف ہے — غم عشق کا یہی ہے تو جینے پہ حرف ہے
ہر روز کب ملا وہ مہینے پہ حرف ہے — گزرا جو یوں ہی سال تو جینے پہ حرف ہے
عالم ہے اس کی تیغ دونابی[5] کا گر یہی — تو خضر اور مسیح کے جینے پہ حرف ہے

1۔ ج : مہ نہ ملے 2۔ باز خصمی = بار بار کی دشمنی 3۔شوم = کنجوس،منحوس 4۔ٹوم = زیور،خوبصورت عورت
5۔ تیغ دونابی = دودھاروالی تلوار مراد ہے

مینے کی بالیوں کا تری کیا بیاں کروں
یاں زیورِ سخن کے بھی مینے پہ حرف ہے

انگشترِ طلا کا ترے گر ہے یہ فروغ
تو آفتاب کے بھی نگینے پہ حرف ہے

جودی سے بحرِ اشک کا طوفاں ہوا بلند
اب ہم کو خضر کے بھی سفینے پہ حرف ہے

نظروں سے یہ گرا ہوں میں اس کی کہ ان دنوں
چاہوں جو کینہ اس سے تو کینے پہ حرف ہے

گریے سے بسکہ پانی جگر میں نہیں رہا
آوے جو تپ بھی اب تو پسینے پہ حرف ہے

گو زخمِ تیغ و تیر رفو کر سکے مسیح
پر زخمِ تیغ ہجر کے سینے پہ حرف ہے

دو چار دن جو کھینچے تو کھینچے مریضِ عشق
نزدیک اپنے سارے مہینے پہ حرف ہے

رکھ اک غزل کی اور بھی کرسی[1] تو مصحفی
ہر اک اگرچہ اس کا بھی زینے پہ حرف ہے

317

مسّی سے لب کی اُودی نگینے پہ حرف ہے
تحریرِ رنگِ پان سے مینے پہ حرف ہے

رنگِ قبائے سبز سے مینے پہ حرف ہے
وہ رنگ ہے کہ جس سے نگینے پہ حرف ہے

عالم خویِ جبیں کا ترے پا سکے ہے حور
یاں عارضِ پری کے پسینے پہ حرف ہے

صد سوزنِ وصال ہوں گر دستِ چرخ میں
پیراہنِ فراق کے سینے پہ حرف ہے

آگے سے بھی قلق ہے زیادہ اس فراق میں
مرنا اگر یہی ہے تو جینے پہ حرف ہے

امیدِ وصل پر کوئی کب تک جیا کرے
ملنے کا عید کے بھی مہینے پہ حرف ہے

گویا ہزار لعل ہیں دل پر جڑے ہوئے
تا کندہ غینِ داغ کا سینے پہ حرف ہے

طوفانِ اشک سے نہیں بچنے کی کوئی شکل
بجرے کا گرچہ سب کے سفینے پہ حرف ہے

ساقی شراب صاف پلاتا ہے بزم کو
اور اپنے دُردِ جام بھی پینے پہ حرف ہے

کیا رکھے کوئی کینۂ معشوق سے امید
جائے کہ اہلِ رشک کے کینے پہ حرف ہے

1۔ کرسی رکھنا = بنیاد رکھنا

آنسو تو کب گرے مری تربت پہ مصحفی
خوی کردہ رخ کے بلکہ پسینے پہ حرف ہے

318

جیسے بُنت سے ٹوپی کی مینے پہ حرف ہے — قرصِ حباب سے بھی نگینے پہ حرف ہے
ہے رنگ گل یہ شوخ کہ مینے پہ حرف ہے — اب کے بہار میں مجھے جینے پہ حرف ہے
کب حشر کو اُٹھے یہ شہیدانِ تیغ عشق — ہم کو تو ایسے لوگوں کے جینے پہ حرف ہے
شبنم کی برگِ گل پہ لطافت میں کیا کہوں — نازک تنوں کے جس سے پسینے پہ حرف ہے
ناصح تو کرسکے گا رفو زخمِ سینہ کیا — یاں سوزنِ مسیح کے سینے پہ حرف ہے
نشتر زنِ جگر ہے مرا اس کا حرف حرف — اسمِ حبیب کا جو نگینے پہ حرف ہے
گو نقدِ دل بباد دیا ہم نے عشق میں — نزدیک عاشقوں کے خزینے پہ حرف ہے
وہ کینہ میرے ساتھ ہے میرے غزال میں — جس سے پلنگ وشیر کے کینے پہ حرف ہے
قامت ترا جہاں بہ قیامت ہے ہم بغل — واں سروِ ہر چمن کے قرینے پہ حرف ہے

اے مصحفی میں کیونکہ جیوں، اس کی دید کا
ایسا وہ مہ چھپا، کہ مہینے پہ حرف ہے

319

ملنے کی کسی طرح سے امید تو ہووے — ہووے گی جو رسوائی جاوید تو ہووے
ہم اس کو سناویں گے شبِ ہجر کا قصہ — مشرق سے نمایاں کہیں خورشید تو ہووے
مستوں کی تسلّی کے لیے بزم میں ساقی — گر بادہ نہ ہو، ساغرِ جمشید تو ہووے
پایا نہیں پھل میں نے محبت کا پس ازمرگ — تربت پہ مری سایہ فگن بید تو ہووے
دشوار ہے گر ذرّے کو خورشید کا بننا — خورشید نہ ہووے تو وہ ناہید[1] تو ہووے

1۔ ناہید = ایک ستارہ

لوں گا میں سمجھ مصحفی اس عشق بےکے آگے
پوشیدہ کہیں تجھ سے ترا بھید تو ہووے

320

ہم نے خوشی اسی کی ہر اک بات میں رکھی
رسمِ منازعت[1] نہ ملاقات میں رکھی

نے برگِ گل، نہ آئنہ، نے آب جو میں ہے
صانع نے جو صفا کہ تری گات میں رکھی

طوفانِ اشکِ دمبدم روزِ ہجر نے
کشتی ہماری چشم کی آفات میں رکھی

اب تیغ اس سے چھٹتی نہیں جس نگار نے
پھولوں کی بھی چھڑی نہ کبھی ہات میں رکھی

کب پاسکے ہے برقِ دماں[2]، کلکِ صنع نے
شوخی جو ابروؤں کے اشارات میں رکھی

اے چشمِ دُرفشاں میں تمھارا غلام ہوں
تم نے ہی آبرو مری برسات میں رکھی

دن کی خبر نہ شب کو، نہ شب دن سے مطّلع
یہ طرفہ اوٹ اس نے دن اور رات میں رکھی

سب فیضِ حسن ہے جو یہ شیرینیِ سخن
خامے نے مصحفی کے مقالات میں رکھی

321

ہمیں تباہ کیا دل کی بے قراری نے
دکھائے زور مزے شب کی آہ وزاری نے

گزر گیا جگر و دل میں پیر کر اک بار
ستم کیا ترے خنجر کی آبداری نے

امیدِ وصل نہ ہوتی تو کیا گزرتی خوب
دیا دکھ اور ہمیں اس امیدواری نے

ہزار گرسنہ چشموں کو آج برسرِ راہ
بٹھا رکھا ہے تری آمدِ سواری نے

چمن میں رہ نہ سکے ہم بغیر نکہتِ زلف
یہ بے دماغ کیا نکہتِ بہاری نے

دمِ اخیر کہا چاہتا تھا کچھ میں ولے
نہ دی سخن کی بھی فرصت نفس شماری نے

خدا کے واسطے کر اب بھی مصحفی توبہ
کیا ہے خوار تجھے اس شراب خواری نے

1۔ منازعت = تنازعہ،تکرار 2۔ برقِ دماں = خوفناک بجلی

322

بعد قتلِ عاشقاں گر دست و خنجر دھویئے
دامنِ افشاں کی بھی چھینٹیں مقرر دھویئے

انگلیوں سے پونچھیے خونِ شہید ناز کو
پھر یہ چاک آستیں بھی بندہ پرور دھویئے

گریۂ شب باعثِ رسوائی مردم ہے آہ
صبح اُٹھ کر کب تلک بالین و بستر دھویئے

بن گیا ہے خونِ بسمل جسم میں جوہر کی روح
دھویئے گر تیغ تو خوب اس کے جوہر دھویئے

نازکی پر جن کی برگِ گل کو بھی آتا ہو رحم
سنگِ پا سے ایسے تلوے کیونکہ مل کر دھویئے

دل ملے جاتے ہیں اب، مل مل کے پانی میں صنم
دونوں ہاتھوں سے نہ یوں موئے معنبر دھویئے

سوزش اس کی کم نہ ہو جوں نارِ دوزخ لاکھ بار
آبِ رحمت سے جو داغِ غم[1] کے اخگر دھویئے

رویئے جب حشر کو بھی ابرِ ترساں مصحفی
نامۂ اعمالِ مردم کیوں نہ یکسر دھویئے

323

واہ تم بھی خوب ہو، دے کر دغا جاتے رہے
اچھے بچھے دل کو میرے غم لگا جاتے رہے

جامۂ زرکش پہن کر بام پر آئے تھے وہ
برق کے مانند اک جھمکی[2] دکھا جاتے رہے

گرچہ پنجوں پر لیے تھے میں نے اپنے اشکِ سرخ
ہاتھ سے چھٹتے ہی جوں رنگِ حنا جاتے رہے

آئے تھے ملنے کو میرے وہ پس از مدّت کہیں
میں جو کچھ شکوہ کیا ہو کر خفا جاتے رہے

خاک کے پردے کا کچھ اسرار کھلتا ہی نہیں
کوئی کیا جانے کدھر اہل[3] فنا جاتے رہے

تب اسیرانِ قفس کو تو نے جا کر کی خبر
پھول جب گلشن سے اے بادِ صبا جاتے رہے

تھے مرے سینے پہ داغ اس کی جدائی کے کئی
آنسوؤں نے ایسی[4] کچھ رکھ دی دوا جاتے رہے

جن کی باتوں سے کبھی ہوتی تھی تسکینِ دل
رہ گئے تنہا ہم اور وہ آشنا جاتے رہے

ناقۂ لیلیٰ کے تھے دنبال کتنے گرد باد
ناقہ جب غائب ہوا وہ خاک اُڑا جاتے رہے

1۔ ج نشتر 2۔ جھمکی = جھلک 3۔ ج اہل صفا 4۔ ج: جونہی

بسکہ وہ باتوں سے اپنی خود خجل تھے مصحفی
راہ میں دیکھا جو مجھ کو منھ چھپا جاتے رہے

324

رکھ دوگے ہاتھ سے جو کمانِ ستمگری
کچھ اس میں نہ ہووے گی شانِ ستمگری

پڑتا نہ تھا جنھوں پہ گمانِ ستمگری
دشمن ہوئے مرے وہی اطفال خوبرو

ویسا ہی ناز اور وہی آنِ ستمگری
خط آچکا ہے چہرے پہ اس پر بھی ہے وہاں

آباد ہے انھی سے جہانِ ستمگری
خوبان بانکہ طور کو قایم رکھے خدا

دو چار دن ہے اور زمانِ ستمگری
آغازِ خط میں اتنا صنم مت غرور کر

کشتہ ہوں اس کی تیکھی نگہ کا میں مصحفی
غمزہ ہے جس کی چشم کا جانِ ستمگری

325

پانو سے اس کے پانو ملے تو پانو کی زنجیر ملی
ہاتھوں سے جو بلائیں لیں تو ہاتھوں کو تعذیر ملی

جس گردن میں دستِ حنائی اس کا حمائل رہتا تھا
اس گردن سے روزِ جدائی آکے گلے شمشیر ملی

حسن سے اس کے اک دم فرصت ملنی ہوگئی اب جو محال
مانی سے کوئی جاکے کہے یہ زور تجھے تصویر ملی

عاشق اور معشوق کا ملنا کون کہے ہے آساں تھا
تب یہ دونوں ملے[1] ہیں باہم ان سے جب تقدیر ملی

اس کے گلے سے کوئی پوچھے لذّت بسمل ہونے کی
جس کے گلے سے تیز چھری چسپاں ہو دمِ تکبیر ملی

1۔ ج : ملے باہم تدبیر سے جب تقدیر ملی

غم روزی کا کاہے کو کھاویں خسروِ عشق کی دولت سے
مصحفی اپنے سینے کو داغستاں میں جاگیر ملی

326

نے پیار سے بولے نہ مجھے مار ہی ڈالے … یارب میں پڑا کس بت بے رحم کے پالے
چاہے تھا میں معشوق ستم پیشہ سو آخر … لاکر مجھے قسمت نے کیا تیرے حوالے
کیا جانیے طے ہووے گی کس طرح یہ منزل … کانٹوں سے جراحت ہیں مرے پانو کے چھالے
شانے نے پسِ پشت کیا جعد کا شکوہ … حاکم ہو تو گدّی سے زباں اس کی نکالے
صورت سے بھی عاشق کی جو بیزار ہے یارب … اس طرح کے روٹھے کو کوئی کیونکہ منالے
یک قطرۂ خوں جسم میں تھا اپنے سو وہ بھی … بے طاقتیِ دل کے کیا ہم نے حوالے
اس مہ سے ملاقات ہوا ے مصحفی کس طرح
وہ گھر سے تو نکلے نہ اندھیرے نہ اُجالے

327

رنگ چہرے کا ترے گل میں نہ گلزار میں ہے … سایہ حق میں ہے تو گل سایۂ دیوار میں ہے
فیض بخشی اگر اس لعلِ شکر بار میں ہے … خواہشِ بوسہ گرہ کیوں لبِ اظہار میں ہے
کاش اس جینے سے مرجاویں تو جھگڑا ہی چکے … جان ہاتھوں سے ترے رات دن آزار میں ہیں
ہر طرف لالۂ رنگیں نے جو سر کھینچا ہے … ایک آتش سی لگی دامنِ کہسار میں ہے
دور گلزار سے رکھ میرے قفس کو صیّاد … ابھی اک شعلۂ آتش مری منقار میں ہے
دیکھ صورت تری بھولا ہے وہ رفتار اپنی … کب سے سورج کی نظر رخنۂ دیوار میں ہے
کوئی کہہ دے یہ زلیخا سے کہ چل سیر تو کر … آج اک جنسِ گراں مصر کے بازار میں ہے
ہم ہیں اور گرمیِ خورشید ہے اور وادیِ خاک … وقتِ خوش اس کا جو اس سایۂ دیوار میں ہے
ناتوانی نے کیا صورتِ دیبا اس کو … حس و حرکت وہ کہاں اب ترے بیمار میں ہے

کس لیے ہجر کو رکھتے ہیں گوارا ہم لوگ کچھ تو لذّت الِم حسرتِ دیدار میں ہے
منھ میں اس کے تو اگر پانی چواوے صیاد اب بھی اک سدِ رمق[1] مرغ گرفتار میں ہے
ہم نے دیکھی نہ جہازی نہ صفاہانی میں آبداری خمِ ابرو کی جو تلوار میں ہے
مصحفی ایک غزل اور بھی پڑھ اس میں کہ یار
زورِ اندازِ فصاحت ترے اشعار میں ہے

328

دل لگا جس کا تری خوبیِ رخسار میں ہے دھیان اس کا ہے وہیں گو کہ وہ گلزار میں ہے
رنگِ یاقوت میں دیکھی نہ کبھی ایسی چمک سرخیِ پان کا عالم جو لبِ یار میں ہے
چھوڑ کر ہاتھ مرا یاروں سے بولا یہ طبیب آج کچھ ضعف بہت نبض کی رفتار میں ہے
نزع کے دم بھی اگر اس کو بلا لاوے کوئی دیکھ لینے کی تمنّا دلِ بیمار میں ہے
قدم آہستہ کہ ٹھوکر نہ لگے اے لیلیٰ قیس خوابیدہ ترے سایۂ دیوار میں ہے
اے خروشِ سحر اس شب تو نہ کر تو فریاد دست خم کردہ مرا گردنِ دلدار میں ہے
کس کے یہ دستِ حنائی نظر آئے ہیں مجھے جو وہی رنگ مرے دیدۂ خونبار میں ہے
کس طرح سر سے مرے رشک کی آتش نہ لگے پھول لالے کا ترے گوشۂ دستار میں ہے
اتنی فرصت نہیں جو[3] یار کا دامن کھینچوں ہاتھ الجھا یہ گریبان کے ہر تار میں ہے
شغل گریہ سے نہ تم باز رہو اے آنکھو کہ ابھی دیر بہت وعدۂ دیدار میں ہے
نل[4] سے کہہ دو کہ وہ گلگشتِ چمن کو آوے دیر سے خطِ دمن زاغ کی منقار میں ہے
سامنے اس کے تو پردہ نہ اُٹھا عارض سے
تابِ نظّارہ کہاں مصحفیِ زار میں ہے

1۔ سدِ رمق = آخری سانس 2۔ اصل تری گفتار میں ہے 3۔ ج۔ تا
4۔ نل دمن = عاشق و معشوق

329

چاؤ جوانی میں تھے کیا کیا دل میں بھرے عیاروں کے
کوچے گلی میں اٹکلتے [1] تھے کیسے ہی زرداروں کے

تنگ دہانی دیکھ کے اس کی ساتھ اک حسن ونزاکت کے
رشک کے مارے خوں [2] جو پیا ہے لال ہیں لب سوفاروں کے

تا نہ شعاعِ مہر بھی اس کے رخ پہ پڑے ہنگام سحر
مٹی سے واں بند کیے ہیں روزن بھی دیواروں کے

لالہ وگل داؤدی [3] ونرگس چاروں کی ہے رنگت ایک
زرد نظر آتے ہیں مجھ کو چہرے ان بیماروں کے

سیبِ ذقن کی چوٹوں کو وہ خاطر میں کب لاتے ہیں
جو عاشق ہیں صدمہ رسیدہ گولے سے رخساروں کے

باغ میں کوئی سوختہ بلبل دفن ہوئی ہے جس جاگہ
ڈھیر لگے دیکھے واں ہم نے پھولوں سے رخساروں کے

مصحفی قافلہ بننے میں گر دیر تھی تو اس شہر سے جلد
مل کے چلے جانا تھا تجھ کو بیلوں میں بنجاروں کے

330

گلشن سے روز اُٹھ کر صحرا کو جاتی ہوگی — بادِ صبا کسی کا پیغام لاتی ہوگی
عریاں رہے ہے مجنوں اپنی خوشی سے ورنہ — لیلیٰ نت اس کی خاطر کُرتی سِلاتی ہوگی
عکس اس کا آئنے میں جو اس کے روبرو ہے — آنکھ اس کی سو شرارت اس کو سجھاتی ہوگی
تیری ہی آنکھ کی یہ ساری شرارتیں ہیں — خوابِ عدم سے فتنے وہ ہی جگاتی ہوگی
پامالی خلایق یہ ہے تو اس کی رہ میں — عاشق کی خواہشِ دل کیا سر اُٹھاتی ہوگی

1۔ اٹکلنا= کھٹکنا، لغت میں ''پرکھنا'' 2۔ ج خون سے 3۔ ج صد برگ ونرگس

دل مصحفی نے اپنا بیچا بہ یک تبسم
کم چیز کوئی ایسی ارزاں بک آتی ہوگی

331

جدائی کا قلق کب یوسفِ دور از وطن جانے
اگر جانے تو اس کو ساکنِ بیت الحزن جانے

سخن کا رتبہ میرے گر نوا سنجِ چمن جانے
تو اپنی خامشی کو بہتر از صوتِ سخن جانے

وفورِ شوق چاہے ہے کہ ہر اک لوح خارا کو
سزائے خط و خالِ نقشِ شیریں کوہکن جانے

اگر گلشن میں جا نکلے تری زلفوں کا سودائی
تو ہر گل کی کلی کو نافۂ مشکِ ختن جانے

قیامت کی ہے برپا باغ میں رفتار نے تیری
یہ اندازِ خرام البتہ کیا سروِ چمن جانے

کہا مجنوں نے میرا غم صبا لیلیٰ سے مت کہیو
میں جانوں یا یہ صحرا یا مرا دیوانہ پن جانے

چمک میں گوہرِ گوش اس کا کس اختر سے کمتر ہے
جو کالا زلف کو سمجھے اسے کالے کا من جانے

نہیں ہم عیش و عشرت کے تو شایاں یہ بھی کیا کم ہے
کہ ہم کو دورِ گردوں قابلِ رنج و محن جانے

جلا دینے کا بھی جس کو ارادہ ہو پس از کشتن
مرے لاشے کو وہ کیونکر سزاوارِ کفن جانے

کمالِ مہربانی ہے تصور بھی اگر تیرا
ہماری چشمِ تر کو پانو دھونے کا لگن جانے

جو باہم کشمکش ہوتی رہے ہے عشق میں اس کو
ہمارا ہاتھ جانے یا ہمارا جان و تن جانے

قدم کیا بزمِ خوباں میں رکھوں اے مصحفی میں تو
وہ پروانہ ہوں جس کو شمع ننگِ انجمن جانے

332

پیسے ہے دل کو حسرتِ بوس و کنار بھی
دُکھ دے رہی ہے تس پہ شبِ انتظار بھی

آنسو ہی کچھ نہیں گہرِ شبِ چراغ سے
مشعل فروزِ شب ہے دلِ داغدار بھی

آئے وہ پوچھتے ہوئے اس دم نشاں مرا
باقی رہا نہ جب کہ زمیں پر غبار بھی

کچھ آہ ہی دکھاتی نہیں اپنی گرمیاں
بجلی سا کوندتا ہے دلِ بے قرار بھی

پوچھے ہے قیس قافلے والوں سے، آئے ہے　　دنبالِ قافلہ کوئی محمل سوار بھی
وہ شوخ اپنے حسن پہ نازاں تو ہے و لے　　پیدا کرے تو ہم سا کوئی جاں نثار بھی
دست جنوں ہنر تو دکھا اپنا ان دنوں　　جوشِ جنوں ہے، آمدِ فصلِ بہار بھی
کاوش سے تیری، دست جنوں، اپنے تن پہ ہاے　　باقی نہ پیرہن کا رہا ایک تار بھی
دونوں ہیں میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے　　چشمِ سیاہ و سرمۂ دنبالہ دار بھی
اہلِ تلاش رہتے ہیں گھر بیٹھ مصحفی
ناداں کیا ہے تو نے کبھی روزگار بھی

☆☆☆☆

دیگر اصناف سخن

قطعہ، رباعیات، مثنویات، سلام، مرثیہ

قطعۂ تہنیت

سبھوں کو مبارک ہو یہ نونہال — کہ ہے تازہ گل باغِ اقبال کا
محل میں ہوئی جو چھٹی کی خوشی — لبِ بام پر کوسِ عشرت بجا
جو اہلِ طرب تھے سو آئے تمام — ہر اک نے جدا اپنا مجرا کیا
لٹایا خوشی سے بہت سیم و زر — جو معمول تھا وہ سبھوں کو ملا
ہوئی فکر تاریخ مجھ کو جوں ہی — یہی ہاتفِ غیب نے دی صدا
کہ اس مصرعے میں ہیں تاریخ دو — ''مظفر علی خاں کے بیٹا ہوا''
دو چنداں عدد ہیں تو ہے اور خوب — دو چنداں ہی اس ماہ کا مرتبا

یہ تاریخ ہے نادرِ روزگار
غرض کم ہے جو دیجے اس کا صِلا

رباعیات

اے مصحفی قدرِ مرغِ بستاں ہرگز — رکھتا نہیں گو کہ ہووے سیانا کوّا
الفاظ متین اور لغت لا لا کر — ناحق نہ بنا تو ریختے کو ہوّا

☆

اہلِ معنی کو یہاں پوچھے ہے کون — صورتِ ذلت ہے معنی سے عیاں
شعرِ نازک پڑھنے آگے دب گئے — یہ مثل وہ ہے گدھے کو زعفراں

☆

نے دل کو نجات آرزو سے اس کی
نے طبع کو چین جستجو سے اس کی
آیا جو نہ اب تلک وہ کافر، اے وائے
کیا لڑگئی آنکھ واں کسو سے اس کی

☆

جاتا تھا فلک کے پار ہر شب نالا
تھی چشم بھی سرخ جوں لہو کا تھالا
سر پر سے خدا نے اس بلا کو ٹالا
اب نام نہ لو فراق کا منھ کالا

☆

میں جس کے لیے جہاں کو برہم مارا
اجرام اور آسماں کو برہم مارا
اس کے سگوں نے شہر کی گلیوں میں
میرے ہر استخواں کو برہم مارا

☆

گو یار ہے تجھ سے ناموافق اے دل
تجھ کو گلہ کرنا نہیں لائق اے دل
محروم رہے تو یہ سزا ہے تیری
کیوں ایسی جگہ ہوا تھا عاشق اے دل

☆

آ خواب میں بھی پاس نہ میرے لیٹی
میں وصل کی شکل جو بنائی میٹی
یوں ذبح کرے ہے مجھ کو مختی[1] گویا
یہ قوم میں ہے قصائی کی بیٹی

☆

رتبے سے گریں اپنے عقول و افہام
ہو صبح دویم سے دوبدو ظلمت شام
قسمت میں لکھا تھا ریختے کی یہ بھی
واہی گوئی کا شاعری ہووے نام

☆

جو شخص کہ آج ہیں تسخر پیشہ
اور رکھتے ہیں اپنا وہ تکبر پیشہ
اس مسخرگی پہ حیف ہے وے ٹھہریں
پھر فنِ سخن میں بھی تبحر پیشہ

☆

1۔ مختی ، شاعر کی محبوبہ

جس بزم میں ہوویں سبھی نقادِ سخن　　ملتی ہو سخنور کو جہاں دادِ سخن
مدحت سے نہ ہووے یا وہ گو اس کی ہی شاد　　ہو جس[1] سے کہ ریختے میں بنیادِ سخن

☆

بیداریِ شب تیرے اگر ہاتھ آئی　　یہ جان تو درویشی کی سب نے پائی
اُٹھتا ہے تنہا ہی[2] دوستی کا مزہ　　بیداریِ شب[3] ہو اور ہو تنہائی

☆

الفت نے تری کیا فسانا مجھ کو　　وحشت نے بنا دیا دوانا مجھ کو
اس پر بھی ہزار حیف تو نے ظالم　　اپنا عاشق کبھی نہ جانا مجھ کو

☆

امیدِ وفا پہ بے وفائی بھی سہی　　اور وصل کے بعد پھر جدائی بھی سہی
لوگوں نے بھلا بُرا کہا میرے تئیں　　تیرے لیے سب کی میں برائی بھی سہی

☆

آنکھوں سے بہاویں اشکِ خونی[4] کب تک　　طالع کی سدا سہیں زبونی کب تک
اس غم سے تو جی اپنا بہ تنگ آیا ہے　　اے دردِ فراق یہ فزونی کب تک

☆

مے سے نہ بھرا زجاج پورا میرا　　بے مال لیا خراج پورا میرا
اس پر بھی بتا کیا رکھا ہے تو مجھے　　یہ تو نے کیا علاج پورا میرا

☆

مغرب سے ہوا ہلالِ شوال پدید　　تا ہووے جہانیوں کو پھر عشرتِ عید
یہ روز تمھارے غسلِ صحت کا ہے　　نواب مبارک ہو تمھیں عیدِ سعید

1۔ میر تقی میر کی طرف اشارہ ہے۔ نسخۂ انجمن (ج) میں "میر" لکھا ہوا بھی ہے　2۔ ج : خدا پرستی میں مزہ
3۔ بیداری ہو اور ہو گوشۂ تنہائی　4۔ ج : خونیں

حسبِ فرمایش فتح علی کپتان

ماہِ رمضاں گیا تو پھر عید آئی   یہ عید ہمیں مژدۂ صحت لائی
نواب وزیر نے کیا غسلِ شفا   کیا فتح علی کی آرزو بر آئی

☆

حامیوں نے کیے ہیں کیسے پُر زر   ہیں طاس[1] فلک میں کاسۂ شمس و قمر
نوّاب نے آج غسلِ صحت جو کیا   دن عید کے عالم کو ہوئی عیدِ دگر

☆

نوروز ہے آج شادمانی کیجے   یعنی کہ نئے سرے جوانی کیجے
رنگ اس کا جو پستئی ہے یہ کہتا ہے   خوباں کو، لباس اپنا دھانی کیجے

☆

خوش وے ہیں جن کی لب بلب گزرے ہے   ہم کو ہر اک پل غضب گزرے ہے
آرام سے وصل میں بھی کب گزرے ہے   منت کرتے تمام شب گزرے ہے

☆

یہ ناز و ادا، یہ حسن، یہ صورت ہے کہاں   کیوں کہیے نہ لکھؤ کو پھر جانِ جہاں
دلّی میں نہ آگرے میں دیکھے ہم نے   جو نور کے تکّے نظر آتے ہیں یہاں

☆

1۔ طاس = تھال

نے بوسہ[1]، نہ انعام رہا ہے باقی　نے نامہ، نہ پیغام رہا ہے باقی
مدّت سے نہ عاشقی ہے نہ معشوقی ہے　بس عشق کا اک نام رہا ہے باقی

☆

اب یہ جو نئے ہوئے ہیں پیدا شاعر　اور سمجھیں ہیں آپ کو بہ دعوا شاعر
بس دو ہی سخن میں ان کو سمجھا دیتا　گر عہد میں ان کے کوئی ہوتا شاعر

☆

کی تو نے اگر جفا، جفا بھی میں سہی　کی تو نے اگر دغا، دغا بھی میں سہی
کیا تو نے کیا یہ اے ضدیلی[2] مخفی　کم بخت تیرے لیے بلا بھی میں سہی

☆☆☆☆☆

1۔ ج: بوسہ بہ دشنام　2۔ ضدیلی = ضدی

مثنوی گلزارِ شہادت

ہے یہ جو نئی سی اک حکایت　　اک زن سے ہے اس کی یوں روایت
یعنی کہ ہے مجھ کو اس قدر یاد　　ہمسایہ مری تھی اک پری زاد
سِن دس کی، دوازدہ کی تھی وہ　　میں حور جو تھی تو تھی پری وہ
کھیلیں تھے بہم ہمیشہ دل شاد　　ہجولی مری تھی وہ پری زاد
باہم یہ رہے تھا عہد و پیماں　　یعنی کہ سنو ہو میری گوئیاں[1]
جس وقت کہ بیاہ ہو تمھارا　　ملنا مت چھوڑیو ہمارا
یا پہلے میں ہی بیاہی جاؤں　　جس وقت کہ تم بلاؤ آؤں
چاہت میں ہماری اور تمھاری　　آوے نہ فراق و اضطراری
ناگاہ بہ گردشِ ستارہ　　منسوب ہوئی وہ ماہ پارہ
بیاہی گئی اک مغل کے گھر میں　　رہنے لگی قید، بام و در میں
اتنے میں بحکمِ اعتقادی　　کچھ گھر میں اُٹھی ہمارے شادی
عوراتِ قبیلہ ہر طرف سے　　آئیں کچھ اپنے ساتھ لے لے
شادی کی سنی جوں ہی ادائی　　بن ٹھن کے وہ رشکِ مہ بھی آئی
اُتری جو محافے میں سے وہ ماہ　　کی دیکھ اسے آسماں نے بھی آہ
چھوٹی بہن اس کی چشمِ بد دور　　یہ حور تو وہ بھی بچّۂ حور
وہ خود بہ تجمل عروسی　　چھوٹی کا لباس سندروسی[2]
نسبت میں وہ ماہ اور یہ ناہید　　صورت میں سُہایہ اور وہ خورشید

1۔ ج : بھنیاں (گوئیاں = سہیلی)　　2۔ سندروسی = سرخ (املیس)

پوشاک بلا تو زیور آفت دونو وہ بہن سراسر آفت
کانوں میں جڑاؤ اس کے بالا ہو جیسے ستارہ دار ہالا
بینی کی چمک جبیں پر ایسی جو ڈانک[1] نہ ہو نگیں پر ایسی
نتھ ناک میں ہالۂ قمر تھی یا قلزمِ حسن کی بھنور تھی
کانوں میں وہ بالیاں طلائی کرتی تھیں ادا سے کج ادائی
بازو پہ کسا ہوا وہ بھج بند تھی جس کی پری بھی آرزو مند
الماس کی اُربسی[2] وہ سادہ موتی کوئی ہوئے جوں پیادہ[3]
پانو میں وہ موتیوں کی پازیب ہوجاوے پری کو جس سے آسیب
پھر تس پہ کڑے غضب وہ خمدار ہو جن کی کھنک سے فتنہ بیدار
پھر رنگِ کفک وہ فتنۂ خوں لیلٰی ہوجائے جس کی مجنوں
با ایں ہمہ شانِ خود نمائی جب پردہ اُٹھا وہ باہر آئی
نزدیکی میں اک جوانِ سادہ تھا کرسیِ رتھ پر ایستادہ
دیکھ اس کو وہ بادلِ نظارہ کرسی سے گرا وہ جوں ستارہ
ہوکر کے خدنگ خوردۂ عشق دل اس کا ہوا فشردۂ عشق
سَو جاں سے ہوا وہ اس پہ شیدا لیلٰی نے کیا ہے قیس پیدا
دل اس کا بنا تمام حسرت کچھ اس میں رہی نہ تاب و طاقت
ہم عہد ہوا بہ ناصبوری مرنا ہی پڑا اسے ضروری
حیرت زدہ ہو نگاہ رہ گئی آکر کے لبوں پہ آہ رہ گئی
برق ایک جھلک میں اس پہ پڑگئی تھی طاقتِ تن سو سب نبڑ گئی
سودے نے کیا مقام سر میں اُٹھنے لگی سول[4] سی جگر میں

1۔ ڈانک = پہاڑ کی اونچی چوٹی 2۔ اُربسی = گلے کا ایک زیور 3۔پیادہ = غالباً تنہا مراد ہے
4۔ سول = دردِ قولنج

مژگاں ہوئیں اشکِ خوں سے تر ئیں — آنکھیں بنیں برجِ عقد پرویں
وہ سادہ بہ عالمِ جوانی — آیا بہ بلائے ناگہانی
الفت میں زبسکہ نَو ہوس تھا — خود وہ بمقامِ شعلہ خس تھا
دیکھی جو یہ حسن کی تجلّی — بے خود گرا بسانِ موسیٰ
لب خامش و شور و نالہ دل میں — اک طرفہ خروش آب و گل میں
اس شادی کے گھر میں ایک زن تھی — گویا بہ شگفتگی چمن تھی
گھر کا بس اسی کے دم سے تھا بند — وہ زن یہ کہے ہے تھی مری نند
گہ پردے میں اس کے حلوا سوہن — بھیجا تا کھاویں اس کو سب زن
گہ لونگ[1] چڑے بہ ایں بہانہ — ارسال کیے درونِ خانہ
گہ پھولوں کے ہار مول لے کر — بھیجے پئے نذرِ آں سمن بر
تا دیکھے وہ گل بھی خوے الفت — آوے اسے ان سے بوئے الفت
القصہ تمام دن وہ بے تاب — اُس در پہ رہا بسانِ سیماب
واں سب کو وہ شب کٹی بہ شادی — دل اس کے پہ داغِ نامرادی
آنکھیں سوے چرخ باز اس کی — جوں چشم نظارہ ساز اس کی
تاروں سے وہ زخمِ دل نمک سود — لب پر وہی آہِ حسرت آلود
سودے کا سا اک خیال دل میں — اک دغدغہ[2] کمال دل میں
حرماں سے بہ مرگِ دل نہادہ — بدنامی کا اس کی ڈر زیادہ
یہ سوچ کے دیکھوں صبح کیا ہو — تن میں رہے جان یا ہوا ہو
ہے شادی کے گھر وہ آج مہماں — کل ہووے گی اپنے گھر میں پنہاں
میں غم زدہ آہ کیا کروں گا — بن آئے اجل ہی مر رہوں گا
کاری ہے خدنگِ عشق پر شور — خونابہ کرے ہے چشم پر زور

1۔ لونگ چڑے = ایک قسم کی چاٹ (پلپیس) 2۔ دغدغہ = خوف

اس خستہ کی آہ کیا کہوں بات　　یہ تھا اس گفتگو میں اس رات
جو اتنے میں مرغِ صبح بولا　　سورج نے درِ فلک کو کھولا
ہوئی روز کی روشنی نمایاں　　رخصت لگی ہونے شب کی مہماں
تا چاشت وہ مہمانِ خانہ　　باہم ہوئے پیش و پس روانہ
آیا جو میانہ اس پری کا　　تھا کشتہ یہ جس کی کافری کا
جوں اس میں ہوئی سوار وہ شنگ　　تھے اس میں اور اس میں لاکھ فرسنگ
کر گئے وہ کہار اس کو پامال　　روح اس کی گئی انھوں کے دنبال
لیلیٰ کی گئی اِدھر سواری　　مجنوں کے لگی اُدھر کٹاری
دل خون ہو چشم تر کو آیا　　یعنی یہ فراق رنگ لایا
بے ساختہ چاہ کام کر گئی　　کیا جانیے جی پہ کیا گزر گئی
بال اس نے بڑھائے اپنے سر کے　　درہم ہوئے لوگ دیکھ کر کے
ناخن بھی کیے سب اس نے ناشی[1]　　سودے میں برائے دل خراشی
فوجِ غم اس پہ جو پڑی ٹوٹ　　کھانا پینا بھی سب گیا چھوٹ
کھائے تنِ زار نے ز بس پیچ　　جوں موئے کمر وہ رہ گیا ہیچ
جاں ہونٹوں پہ آئی اس کی سو بار　　پر اس سے کیا نہ اس نے انکار
دیکھے شب و روز عشق کے جور　　اک سال بسر کیا اسی طور
اس حال سے تھی وہ بی بی آگاہ　　لے گئی یہ فسانہ پیش آں ماہ
کاے رشکِ پری ہے ایک نوزاد　　ہمسر بہ جنونِ قیس و فرہاد
مہمانی کے روز تجھ کو اس نے　　دیکھا تھا محافے سے اُترتے
اس دن سے ہوا ہے وہ بد احوال　　دو دو انگل کے سر پہ ہیں بال
لب خشک ہیں اور چشم تر ہے　　مژگاں پہ چکیدۂ جگر ہے

1۔ ناشی = بیکار

دشوار ہوا ہے اس کو جینا　　سب بھول گیا ہے کھانا پینا
کچھ اس کو نہ تن بدن کا ہے ہوش　　جامے کا نہ پیرہن کا ہے ہوش
رہتا ہے وہ دل گرفتہ غمناک　　عریانیِ تن ہے اس کی پوشاک
سنے منھ سے کبھی کہے ہے کچھ بات　　ہیں جذب کے طور اس کے حالات
رہتا ہے اسے ملال تیرا　　سودا تیرا خیال تیرا
تھی وہ جو صنم بہ حسن مغرور　　اور آپ کو سمجھے تھے بہت دور
کانوں سے سنا تو گرچہ قصہ　　پر کچھ نہ دیا جواب اس کا
خاموش رہی وہ سن یہ مذکور　　پر دل نے کہا ہوا میں ناسور
ہوئی جا کے وہ صاحبِ تامّل　　پوشیدہ بہ قلعۂ تغافل
کچھ دھیان نہ اس کا دل میں لائی　　بیگانۂ طورِ آشنائی
جب اس کی سُنی تو ٹال دی بات　　کچھ اور ووں ہی نکال دی بات
دل بستۂ عیش و ناز رکھا　　رسوائی سے خود کو باز رکھا
مقدور تلک رہی وہ خنداں　　گھر اس کا رہا بہ از گلستاں

یوں یاں سے لکھے ہے کلکِ تحریر　　افسانۂ عاشقِ جواں میر
اس کہنہ شرابِ غم کا مخمور　　یعنی وہ جو تھا بحالِ رنجور
جب تنگ ہوا رواق اس پر　　اور ٹوٹ پڑا فراق اس پر
وہ سالِ دگر بھی کاٹ اسی طور　　کر کر کے وداعِ عقل فی الفور
ہو وادیِ عشق میں پیادہ　　مجنوں سے قدم رکھا زیادہ
ہجراں کی جو دیکھی محنتِ شاق　　تن سوکھ کر اس کا ہوگیا قاق[1]
آنکھیں یرقاں گرفتہ ہوگئیں　　پلکیں اسے خون میں ڈبو گئیں
چہرے پہ جو رنگِ زعفراں تھا　　لب خنداں میں آپھی وہ جواں تھا

1۔ قاق = دبلا

تھا کلفتِ دل سے جو مکدّر　خاک اُڑتی تھی بھیگتی مسوں پر
وہ طاقت و زورِ نوجوانی　تھا مصرف چرخِ ناتوانی
بالوں نے کیا اسے نمدمو[1]　تن جیسے نباتِ شاخِ آہو
آنکھیں بہیں منھ پہ دجلہ ہوکر　پھر رونے لگا اُٹھا جو سو کر
سونا نصیب میں کہاں تھا　اک خوابِ غشی کا وہ سماں تھا
دن رات اسے نصیبوں سے جنگ　یک کوچۂ رہ ہزار فرسنگ
رنگ اس کا بہار میں زرری[2]　حال اس کے سے جلوہ گر فقیری
کپڑے سو وہ تیلیا بدن میں　جیتا ہے اجل کے وہ دہن میں
سو پردے میں واں وہ رشکِ خورشید　یاں اک جھلک تک یہ نومید
تنہائی میں یاس اس کی غم خوار　پاس اس کے نہ غیر چار دیوار
اس عرصے میں وہ زنِ وفادار　آئی گئی درمیاں میں سو بار
جب خوب یہ سوکھ کر ہوا زار　گوینده کہے ہے آخر کار
با وصفِ غرورِ کبریائی　اس کی بھی طبیعت ایدھر[3] آئی
گھر والوں سے اپنے بیٹھ کر دور　سننے لگی جی سے اس کا مذکور
پایا جو مزاجِ ناز اُدھر[4] کو　وہ زن ہوئی اس سے یوں سخن گو
آویں گی قبیلے کی زناں سب　یعنی مرے رت جگا ہے اس شب
پہنا کے اُسے زنانی پوشاک　اور ڈال کے چشمِ فتنہ میں خاک
بھجواؤں گی یاں سے میں میانا　ساتھ اپنے سوار کر لے آنا
ٹھہرا جو مدارِ وصل اس طور　جب آئی وہ رات اس نے فی الفور
پوشاک زنانی اور زیور　بھجوا دیا اس کو خوان میں دھر
جوڑا وہ برنگِ زعفرانی　ہو دیکھ جسے پری دِوانی

1۔ نمدمو= اون کے سے　2۔ زرری = زرد بال رکھنے والا　3،4۔اصل: اودھر اور ایدھر

کمخاب کی وہ ازار گل بند تارے کرتے تھے جس کو اسپند
تس پر وہ ازار بند زریں جوں دامنِ کہکشاں میں پرویں
معجر[1] وہ برنگ لالۂ تر دیکھا کرے جس کو چشمِ اختر
پھر تس پہ وہ سینہ بند گل دوز جو دل سے فرشتوں کے چنے سوز
پھر نیم تنہ وہ دامِ بلبل کاڑھے ہوئے جس میں سیکڑوں گل
پھر کفش وہ رشکِ ماہ و خورشید ہم پنجہ بہ تاجِ فرقِ جمشید
جب گھر میں میاںجی کے یہ پوشاک آئی ہوا دیکھ وہ طربناک
اس زن نے کہ تھی وہ محرمِ کار اور رہتی تھی ہر دم اس کی غم خوار
کنگھی چوٹی کر اس جواں کی دی وضع نکال سب زناں کی
پوشاک جو اس کو وہ پنہا دی حورا کے تئیں پری دکھا دی
زیور سے کیا جو پھر تزئیں پڑنے لگی اس پہ چشمِ پرویں
آنکھوں میں دیا وہ اس کی کاجل جو دیکھ کے اس کو شب گئی جل
چوٹی گوندھی وہ بوریا باف جوں مارِ سیاہ ہو پسِ قاف
رکھا وہ ذقن پہ خالِ مے گوں ہو[2] چشمِ فرشتہ جس سے پُرخوں
از بس جعلی نہ تھے جو وہ بال تھی مانگ کی اس کے ٹھیک تمثال
پوروں پہ وہ فندقیں بنائیں جو حور و پری کے جی کو بھائیں
سینے پہ وہ چھاتیاں چکنی سی تھیں تعبیہ[3] کی ہوئیں روئی کی
ان پر وہ مسالے دار انگیا جس سے عجب اک بناؤ پیدا
واں وہ تو دو کوئی بالِ طاؤس یاں مدِّ نگاہ و دستِ افسوس
القصہ بناؤ اس کا کر خوب ہوتا ہے جو بانکی زن کو مطلوب
اس رشکِ پری کے جب وہ آئی اک حور پری کے گھر میں لائی

1۔ معجر = چادر 2۔ج : جو 3۔ تعبیہ = آراستہ

الفت نے جو اس کی جوش مارا　واں سب سے جدا اسے اُتارا
اک حجرۂ نفیس و فرشِ معقول　قالیں پہ ہزار رنگ کے پھول
وہ چاندنی اس پہ شکل مہتاب　ہو آئینہ دیکھ جس کو سیماب
اک گوشہ بچھا پلنگ سادہ　گل تکیے سرہانے دو نہادہ
بے دخل کنار و بوس و آغوش　اک اس پہ پڑا ہوا پلنگ پوش
شادی میں اِدھر اُدھر وہ پویاں[1]　یہ تشنۂ نظر نظارہ جویاں
آنکھوں سے سرشک وصل جاری　دل پر وہی جوشِ بے قراری
اس عینِ خوشی میں ہجر کا غم　اجزائے نشاطِ وصل درہم
آجانا اِدھر اُدھر سے اس کا　پاس اپنے فلک زدے کے تنہا
پھر ووں ہی ٹھہر کے ایک دو دم　کرنا اسی غم کو غم میں مدغم
تھیں عمدہ زناں جو قوم کی واں　تمکیں میں رہیں وہ اس کی حیراں
کہتی تھیں یہ بی بی ہے بہت دور　دیکھی نہیں ہم نے ایسی مغرور
نے حجرے سے باہر آتی ہے یہ　نے ہم کو ہی واں بلاتی ہے یہ
یہ ہنستی ہے اور نہ بولتی ہے　نے عقدۂ دل کو کھولتی ہے
خجلت نے دیا ہے جام اس کو　ہمدم سے ہے اپنے کام اس کو
کرتی نہیں یہ گھمنڈ اس پر　ہم پاس بھی ہے لباس و زیور
ہر ایک کو جواب دے وہ عیّار　آئی دلِ شب اُدھر بیک بار
چوسر کی دو بازی کھیلیں اس رات　بس اس میں ہی کی سو کی کوئی بات
تھا وصل سے بسکہ وہ نراسا[2]　اُلٹا پڑتا تھا اس کا پانسا
واں عرصہ تنگ ہمدمی کو　یاں ہارے ہوئے یہ اپنے جی کو
اس امرِ محال پر نظر کر　اس تنگ وصال پر نظر کر

1۔ پویاں ہونا = چلنا پھرنا　2۔ نراسا = مایوس، ہندی میں "نراشا" ہے

پھر اُٹھ گئی واں سے دے تسلّی مجنوں نے کیا وداع لیلی
پھر اس کا کلیجہ منہ کو آیا خون جگری نے جوش کھایا
آنکھوں سے گرے وہ اشکِ خونیں جو اُن سے ہوا بساط رنگیں
اتنے میں پیامِ روز آیا منہ صبح وداع نے دکھایا
زائل ہوئی وہ سیاہیِ شب تاریک ہوا وہ نورِ کوکب
انجم چھپے، آفتاب نکلا رخصت کا پڑا جو گھر میں غوغا
پہلے کر اُسی جواں کو رخصت اس نے بھی کیا وداعِ طاقت
ہو بازیِ چرخ سے مشوّش آپ ہی وہ جلی مثالِ آتش
بدنامی کا دل میں لاکے وسواس ناموس کا اپنے یوں رکھا پاس
بعد اس کے زنانِ قوم ساری رخصت ہوئیں اس سے باری باری
آشوب جو شب کا تھا ہوا کم وہ رہ گئی اور گھر کے محرم
کر یاد وصالِ دوست روئی محرم اس کا ولی نہ کوئی
واں جو گیا تھا با دلِ زار بستر پر گرا ہے ہو کے بیمار
آئی جو ہوائے اُنس اسے راس بھجوانے لگی اصیل اس پاس
پردہ وہ حجاب کا ہوا دور موصول[1] ہوئے یہ دونوں مہجور
کہتے ہیں رہا وہ خستہ و زار اس سوچ میں نو مہینے بیمار
آخر کو گزر گیا جہاں سے دھو بیٹھا ہی ہاتھ اپنی جاں سے
بے شربتِ وصل یارِ جانی ہوئی اس[2] کی جو تلخ زندگانی
ٹوٹا جو یہ کوہِ ہجر اس پر صحرائے فراق میں گیا مر
پرسش کو اجل جو اس کی آئی ماں اس کی نے سر پہ خاک اُڑائی
اس گھر سے اُٹھی نوائے ماتم گھر ہوگیا اس کا خانۂ غم

1۔ موصول ہوئے = باہم وصال ہوا 2۔ ج : اس کو

یعنی بہ فراقِ روے دلدار دنیا سے گیا وہ عاشقِ زار
ہمسایہ و یار اور برادر آئے جو یہ مرگِ تازہ سن کر
جوں ابرِ بہار زار روئی ہوکر کھڑی داڑھیں مار روئی
اک یار نے واں پچھاڑ کھائی دنداں زدہ اک نے کی کلائی
سر پیٹ کر ایک غش میں آیا اک سینہ زنی کا سانگ لایا
اک خستہ نے پیرہن کیا چاک اک روتے نے سر پہ ڈال لی خاک
جب آہ و فغاں ہوئی فلک رس آ صبر نے یوں کہا کہ "بس بس"
نہلا چکے اتنے میں جو غسّال پہنایا کفن بھی اس کو فی الحال
پھر بوریے پر سے جو اُٹھایا تابوت میں لاش کو لِٹایا
وارث چلے اس کے با دلِ زار لے کر وہ جنازہ روے بازار
تابوت پہ سبز اک دوشالا لاکر پئے زیب و شان ڈالا
چادر پھولوں کی لہلہاتی پھٹتی تھی صبا کی جس سے چھاتی
یوں سبز دوشالے کی تھی تزئیں جس طرح کہ آسماں پہ پرویں
تابوت کہ تختۂ چمن تھا جس تختے پہ جوشِ نسترن تھا
پہنچا جو قرینِ کوے معشوق آئی اسے ووں ہی بوے معشوق
تابوت کش اور سو رواں تھے یاں پانو میں رسّے تو اماں تھے
جاتی تھی کھنچی اسی گلی کو ٹک دیکھیو جذبِ رفتگی کو
تابوت کے ساتھ نوحہ کرتے آخر سب اسی گلی سے گزرے
معشوق کا تھا جہاں در و بام سنگیں محل اس مکاں کا تھا نام
پیشِ درِ خانۂ بتِ چیں جاکر ہوا جنازہ سنگیں
تا دیر رہا وہ ہو گراں بار حمّالوں کے سر پہ بے ستوں[1] وار

1۔ بے ستوں = مرادکوہِ بے ستوں کی طرح بھاری

از بس کہ ہجوم جز و کل تھا   اس واقعے کا گلی میں غل تھا
حیراں تھے نظارگیِ بازار   بر وقفۂ مردۂ گراں بار
کھلتا ہی نہ تھا سبب کسی پر   ہنگامہ تھا ایک اس گلی پر
ہر گھر کے نظارگے دواں تھے   مرد اور زن پیش و پس رواں تھے
پہنچی خبر اسے بھی جوں ہی   کر غسل وہ رشکِ ماہ و پرویں
پردے پردے کے بیچ رو کر   جان اپنی سے اپنے ہاتھ دھوکر
ہوئی از رہِ فرطِ بے قراری   آمادۂ مرگ اختیاری
لے ہاتھ میں پیش قبضِ شوہر   آئی اک بار کوٹھے اوپر
از بہرِ طوافِ کشتۂ خویش   مشتاق تھی بس کہ وہ جگر ریش
گردن کو اُٹھا کے جوں ہی جھانکا   دیکھا کہ جنازہ ہے جواں کا
چلتا نہیں جا سے اڑ رہا ہے   کہرام گلی میں پڑ رہا ہے
پس دیکھتے ہی اسے بھر اک آہ   مارا بہ شکم و دشنہ ناگاہ
تھا بدرقہ[1] جوے عاشقِ زار   کیا بدرقہ مل گیا ہے یکبار
جب خون میں تر ہوا وہ خنجر   تھی رشکِ چمن وہ لالۂ تر
ملبوس جو اس کا لالہ گوں تھا   بے دشنہ ہی گرچہ غرقِ خوں تھا
پر خون نے اور تہ چڑھا دی   اور آگ کو آگ سی لگا دی
عمداً وہ موئی براے عاشق   روح اس کی گئی قفاے عاشق
تھا گرچہ لباس اس کا گلگوں   تھی اس سے زیادہ سرخیِ خوں
افتادہ بخوں وہ کوٹھے اوپر   خاموش زباں بریدہ خنجر
اتنے میں کسی نے جوں بہ اسرار   جانا کہ کھلے لہو کے گلزار
ناگاہ محل میں پڑ گیا غل   یعنی کہ موئی وہ غیرتِ گل

1۔ بدرقہ = محافظ، رہبر

دیکھا جو اسے در آب و آتش شوہر بھی بہت ہوا مشوش
الفت کا جو راز تھا گیا کھل خم ہوگئے صد سرِ تامّل
یکبار اُٹھا جو شور و شیون گئے[1] پردۂ گوشِ آسماں چھن
تھی بام پہ غرقِ خوں وہ گلفام خورشید ہو جیسے بر لبِ بام
ہمسایے بھی رہ گئے عجب میں باقی تھا کچھ اک وصولِ شب میں
ہر اک وہاں جو پُر عجب تھا دندان کے ساتھ ربط لب تھا
کہتے تھے کہ ان میں چاہ ہوگی مدّت سے دلوں میں راہ ہوگی
دے غسل اسے ہاتھوں ہاتھ یکبار اس کا بھی کیا جنازہ تیّار
صندوق میں رکھ دفینۂ عشق معلوم کیا قرینۂ عشق
بازار میں اس کو جب نکالا منھ اپنا کیا فلک نے کالا
سقّوں کی جلو میں آب پاشی تابوتوں پہ پھر گلاب پاشی
معشوق کا تھا جنازہ درپیش پیچھے وہ جنازۂ جگر ریش
دونوں وہ جنازے جب رواں تھے حیرت زدہ پیر اور جواں تھے
کہتے تھے یہ طرفہ ماجرا ہے کیا مردے نے زندے کو لیا ہے
عاشق معشوق کا ہے جو سات پس آج کھلی ہے ہم پہ یہ بات
آخر کو انھیں بہ تکیۂ بھیم لے جا کے کیا بہ خاک تسلیم
ناشاد رہیں وہ دونوں غمناک یک چند میانِ خلوتِ خاک
بہ عشقِ عظیم بیگ مرزا تھا کشتہ حسنِ بیگماں کا
یک طرفہ فسانہ ہے جنوں خیز ہر حرف ہے جس کا وحشت انگیز
تھا بس کہ گمانِ عیب سے پاک مدّت سے رہا تھا اس کو میں تاک
ماہِ رمضاں کی تیرھویں شب کر نظم اسے میں کیا مرتب

1۔ گئے = کے وزن پر

تاریخ رقم ہوئی ہے اس کی بارہ سو سولہ سنہ ہجری
1216ھ
کی ہے جو یہ مثنوی میں ارقام گلزارِ شہادت اس کا ہے نام
یہ صنعتِ کلکِ مصحفی ہے ہر حرف میں اس کے ساحری ہے
خوانندہ کو چاہیے جو ہو شاد
مجھ کو بھی بہ فاتحہ کرے یاد

☆☆☆☆

مثنوی مرغ نامہ مرزا تقی

دل میں مدّت سے تھا یہ مذکور ہو — ماجرا پالی کا کچھ مسطور ہو
لکھیے کچھ کچھ مرغِ جنگی کا بیاں — جس سے زورِ طبع کا ہو امتحاں
سو بہ حکمِ طبعِ ایجاد آشنا — جس پہ ہیں اہلِ سخن جی سے فدا
کر کے میں مرغِ سخن کو کھانچا بند — قید میں لایا تو ہوں مضمون چند
مرغِ عرشی چاہیے دیوے صلہ — میں نے مرغوں کا لکھا ہے رزمیہ
کردیا ہے تاؤ جوں حبشی سیاہ — تیزیِ نوکِ قلم پر کر نگاہ
جب سے ہیں مرزا تقی کے ہم رفیق — پیس کر کھاتے ہیں نت تب سے سویق[1]
باعث اس کا کیا اگر پوچھے کوئی — تو بتاؤں اس کو میں اے مصحفی
یعنی جو ان کا مداخل[2] ہے مدام — تیڑ اور چوپڑ میں ہوتا ہے تمام
مرغ بازی کا انھیں ہے بس کہ شوق — گرد ان کے رہتے ہیں سو اہلِ ذوق
کوئی کرے ہے اپنے مرغے کی ثنا — کوئی کسی مرغے کا دیتا ہے پتا
کوئی پوتے کی اصالت کا وکیل — کوئی کہے ہے اس کی نانی تھی اصیل
ذکر ہے مرغوں کی اصل و نسل کا — اور واں گویا نہیں کچھ اس سوا
کوٹھے والوں کا جہاں مذکور ہے — سقفِ گردوں رات دن پُر شور ہے
تا ذرا بزمِ سخن ہو گلستاں — خاریے[3] کا کوئی کرتا ہے بیاں
کر رہا ہے کوئی وصفِ زرد یال — یعنی یہ مرغا بھی جیوٹ ہے کمال

1۔ سویق = ستو 2۔ مداخل = آمدنی اور خرچ 3۔ خاریہ = مرغ کی ایک قسم اس کے ٹخنے کے اوپر کا کانٹا مضبوط ہوتا ہے۔

مرزا شیرے کا غفرنا[1] ہے دلیر کیوں نہ سمجھیں اس کو وہ میداں میں شیر
ہیں جو شوکت جنگ کے فرزند خاص مرغ ان کے سب کو سمجھیں ہیں رصاص[2]
ساق و گردن کے زبس فولاد ہیں عالمِ سختی میں وہ بیداد ہیں
رات دن پاتے ہیں سونے کی غذا ان کی تیاری کا عالم ہے جدا
کیوں نہ وہ مرغا ہو پھر رستم تلاش پیسے اتریں جس پہ اور نت تیل و ماش[3]
مرزا صاحب کے ہمارے مرغِ جنگ عرصہ کرتے ہیں و لے ان پر بھی تنگ
خاصہ ہے اک وہ جو مرغِ باد رو جو لیا تھا مول دے کر تین سو
اس کی طینت میں نہ تھی مطلق گریز مانگے تھا وہ مرغِ عرشی سے ستیز
اس نے جتوائے انھیں جب سہ ہزار مر گیا آخر وہ اک ہمتگ کو مار
مرغ ویسا بعد ازاں دیکھا نہیں گرچہ تخمِ مرغ کچھ عنقا نہیں
مرغ خانوں میں ہزاروں جانور رات دن کرتے رہیں ہیں شور و شر
ایک جو لے جائے بازی جیت کر ہے وہی شائستۂ خلخالِ[4] زر
تخت کی بھی ہے سزاواری اُسے زیب دیتی ہے یہ تیاری اسے
مرغ جو دو تین کشتی ہو چڑھا سمجھیے مرغوں کا اس کو بادشاہ
سر جھکا دے جب وہ اپنا زیر[5] پر زیر بندی کی ہو کیا بازی زبر
جوڑ کو جو خوب دیکھے تھام تھام مرغ بازی میں بڑا بس ہے یہ کام
مرغ لڑتے آئے ہیں انیس بیس نہ کہ ہوویں جوڑ کے پچیس تیس
گو اٹھارہ بیس بھی لڑ جاتے ہیں کم اٹھارہ والے بازی پاتے ہیں
جیتتا ہے وہ ہی جو ہوتا ہے بیس جوڑ کو ڈالے ہے مثلِ سرمہ پیس
پٹھے پا کھٹ کا وگر کچھ فرق ہے سو بھلا یہ فرق بھی ہے تا بہ کے

1۔ غفرنا = مرغ کا نام 2۔ رصاص = رانگ (مراد کمزور) 3۔ تیل و ماش = نظر اُتارنا
4۔ خلخال = پازیب 5۔ ج : زیر زیر

جاتی ہے پاکھٹ ہی کی بازی چڑھی ہے جو خامی کے مقابل پختگی
تھا جو بابو سرگروہ اس قوم کا دیکھتا تھا جوڑ کر کیا پر بجا
نہ ترازو اور نہ تھا ڈنڈی کا کام تو لے تھا نظروں میں مرغے تھام تھام
پھر ترازو میں بھی گر رکھتے انھیں کم وہی ہوتا وہ کم کہتا جنھیں
اس کے پٹھے[1] بھی بہت ہیں باشعور جانتے ہیں آپ کو اس فن میں دور
یوں تو ہیں سنجیدہ سب یہ عشق باز پر کہاں ہر اک میں ویسا امتیاز
صلحِ کل یعنی کہ وہ سالارِ جنگ دے گیا اس کھیل کو خوب آب و رنگ
اور نے پایا کہاں یہ حوصلہ جو رکھے نت مرغ خانے کی بنا
بعد ازاں اکبر علی اصغر علی رکھتے ہیں اس فن میں مشقِ پختگی
لاکھ چھل بل ان کو ایسے یاد ہیں مرغ بازوں کے بھی وہ استاد ہیں
گرچہ ہیں استادِ فن مرزا شریف لیک کب رکھتے ہیں یہ طبع لطیف
میر زین العابدیں خاں کے خلف مرغوں میں کرتے ہیں گو زر کو تلف
اس گھرانے کی کہاں پاتے ہیں چال مرغِ جنگی میں یہ گھر ہیں بے مثال
ہیں جو فیض آباد کے مرزا تقی دھوم ہے البتہ ان کے مرغوں کی
کیونکہ وہ زر دینے میں ہیں بے دریغ کیوں نہ مرغے ہوویں ان کے مثلِ تیغ
مختصر سی گرچہ ہے یہ مثنوی مصحفی لکھ اس میں تو وصف اپنے بھی
اک ذرا پھڑکا کے باصد شور و شر لام دوں میں مرغِ معنی کو اگر
اس کی جو ہر بار واں کاری پڑے خواجہ خیرا خیر ہی مانگے کھڑے
آیتِ نصر من اللہ کر کے دم ہاتھ سے چھوڑوں جو میں مرغِ قلم
کھا کے اس کی ٹیک پھر اس پر گلا مرغِ حاسد یوں کہے پانی کیا
بسکہ تاب اس کے وہ کانٹوں کی نہ لائے بھاگ اس کے آگے سے دم ریز جائے

1۔ ج: بیٹے

ہاں بصد مکر و حیل اے مصحفی مدعی نے اپنے مرغ فکر کی
سوزن و رشتہ سے کی گر نوک بند لیک چاکِ دل رفو ہوتا بہ چند
سچ ہے قدر اس کی کوئی کیا جانے ہے
مرغ میرا سب کو دَلیا[1] جانے ہے

☆☆☆☆

1۔ دلیا / دلیہ = مراداً نرم، کمزور

مثنوی بحر المحبت

لبِ زخمِ قلم ذرا وا ہو　تا کہیں تجھ سے نالہ پیدا ہو
ساتھ کاغذ کے عشق بازی کر　یعنی کچھ داستاں طرازی کر
کسی خستہ جگر کے حال کو لکھ　کسی سروِ رواں کی چال کو لکھ
نا شکیبی کسی کی دکھلا دے　دلفریبی کسی کی لکھوا دے
کہیں پیچاکِ آہ کر تحریر　دے بنا زلف کی کہیں زنجیر
قصۂ عشقِ لیلیٰ و مجنوں　گرچہ کچھ اس قدر نہ تھا مضموں
تیری طرّاحیوں سے دور کھنچا　کئی اہلِ سخن نے اس کو کہا
مبتذل عشق کا نہ ہو مضموں　عشقِ موزوں کو پھر[1] تو کر موزوں
گرچہ ہے کلکِ میرؔ نادرہ[2] کار　تو بھی ندرت کو اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا　دے ذرا اور بھی تو رنگ[3] ملا
سطحِ کاغذ پہ کھینچ وہ تصویر　جس[4] کے حیراں رہیں صغیر و کبیر
رمزِ شق القمر جتا دے تو　معجزہ اپنا ٹک دِکھا دے تو

آغازِ داستان آں جواں

اک جگہ اک جوانِ خوش ظاہر　تھا نپٹ فنِ عشق سے ماہر
دل پہ صدمے بہت اُٹھائے تھے　گھاؤ پر گھاؤ[5] اُس نے کھائے تھے
اس کی نظریں چڑھیں تھیں لاکھ نگاہ　دیکھیاں تھیں ہزار چشمِ سیاہ

1۔ م : پھر بھی　2۔ م : نادرکار　3۔ م : حسن　4۔ م : جس سے　5۔ م: داغ پر داغ

به تقاضاے عشقِ سنجیده لیک[1] اس پر بھی تھا وہ نادیده
گر کہیں روے خوش نظر آتا نوکِ مژگاں تلک جگر آتا
ہو کے ممنونِ ناشکیبیِ شوق تھا نظر بازِ دلفریبیِ شوق
طپشِ دل کو راہ تھی اس سے چشمِ حیرت نگاہ تھی اس سے
گاہِ گلزار کی طرف جاتا جی کو گل پھول ساتھ بہلاتا
گاہ کرتا نظارهٔ در و بام گاہ تھا کوچہ گردی اس کا کام
ازدحامِ زناں جہاں ہوتا آب ہوکر وہاں رواں ہوتا
کیا کہوں ایک دن یہ خوش پرکار کر کے سیرِ چمن بہ فصلِ بہار
گھر کو آتا تھا عشق بازانہ گل بہ دستار نوجوانانہ
کہ کسی کوچے میں جو جا نکلا اس کے دل کا بھی مدّعا نکلا
دل جو تھا اس کا عشق آمادہ ہوگیا اک جگہ پہ دلدادہ
یعنی اک نازنینِ گل رخسار ہوئی غرفے میں آکے اس سے دوچار
اس کی آنکھ اس پہ، اس کی اس پہ پڑی یک دگر جب بہم نگاہ لڑی
جوں یہ اس کے سما گئی جی میں ووں کچھ اس کے بھی آگئی جی میں
دل نے جب تک کہ راہ پیدا کی لبِ خامش نے آہ پیدا کی
حوصلہ خون ہو[2] مژہ سے بہا ضبط پر ضبط کچھ نہ اس کا رہا
آنکھیں بے اختیار بھر آئیں پلکیں ندیاں سی کچھ نظر آئیں
اشک آ حائلِ نظارہ ہوئے جگر و دل ہزار پارہ ہوئے
طائرِ رنگ کر گیا پرواز ہوگیا صعوه[3] صیدِ چنگلِ باز
لب کو دنداں کے ساتھ ربط ہوا لوگ سمجھے کہ اس کو خبط ہوا
دل کے ٹکڑے جگر کے پرکالے آنکھوں نے اس کے آگے لا ڈالے

1۔ م : لیکن 2۔ م : مژہ سے ہو کے بہا 3۔ صعوہ = ممولا

جب کہ مانندِ تیر خوردہ شکار وان سے جنبش اسے ہوئی دشوار
دیکھ اسے رفتہ دل بہ صد انداز اُٹھی غرفے سے وہ سراپا ناز
پہلے شعلہ سا کچھ بلند ہوا پھیر[1] وہ غرفہ ووں ہی بند ہوا
ورقِ غرفہ میں جو تھی تصویر صاف غائب ہوئی وہ بدرِ منیر
جوں ہی نظروں سے چھپ[2] گئی وہ ماہ نظر آیا جواں کو روزِ سیاہ
جان مضطر ہو تن سے جانے لگی بے خودی میں غشی سی آنے لگی
خشکی دوڑی جگر سے تا بہ زباں اشک آہی گئے سرِ مژگاں
بس کہ حال اس گھڑی تباہ ہوا متصل صرف آہ آہ ہوا
پاسِ ناموس کا اُٹھا کھٹکا سر کو اس آستاں سے دے پٹکا
شیشۂ دل کو چور چور کیا پیرہن چاک کر کے دور کیا
گئی سو بار سوے غرفہ نگاہ پر نہ آئی نظر وہ غیرتِ ماہ
طپشِ دل نے بات ہی کھو دی بے قراری نے گھات ہی کھو دی
جان ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ لہو[3] آ کے لگا نگاہ کے ساتھ
سوزشِ دل دو چند ہونے لگی سر سے آتش بلند ہونے لگی
صبر بھاگا بہ دیدۂ گریاں نا شکیبی سے بندھ گیا پیاں
آہ حیرت[4] کا گھر بنا دلِ زار گرم پہلو کیا بہ بسترِ خار
منھ پہ مل کر کے اس گلی کی خاک صبح آسا کیا گریباں چاک
تب تو بلوائے خاص و عام ہوا سر پہ اس کے اک ازدحام ہوا
جان کر لوگ اس کو سودائی بہ تبسّم ہوئے تماشائی
جس کا ناگہ ہوا اُدھر کو گزار وہ رہا دیکھ اس کو حیراں وار
تھے جو ہم بزمِ بزم ہشیاری اور جتاتے تھے مرگ تک یاری

1۔ م : پھر وہ غرفے میں وہ ہیں بند ہوا 2۔م: چھپ گیا 3۔م : لوہو 4۔م : حسرت

اس کی حالت تباہ دیکھ چلے　　　آئے ٹھہرے، کھڑے ہوئے کہ چلے
الغرض یوں ہی گزرے جب کئی ماہ　　　ہوئی اس کے بھی دل میں اس کی راہ
اس کو بھی اک خیال رہنے لگا　　　جی ہی جی میں ملال رہنے لگا
صاحبِ خانہ تھا ز بس کہ غیور　　　دیکھ کر اس گلی میں یہ شر و شور
مشورت ہر کسی سے کرنے لگا　　　مارے غیرت کے سخت مرنے لگا
خشم گاہے کہے کہ مار ہی ڈال　　　جوں بنے اس بلا کو سر سے ٹال
رحم[1] گاہے کہے تساہل کر　　　دیکھ ہوتا ہے کیا تامّل کر
قتلِ عاشق روا نہیں ہرگز　　　یہ کسی نے کیا نہیں ہرگز
اور[2] کرے گا تو ہووے گا بدنام　　　اپنے مذہب میں حد[3] برا ہے یہ کام
آخرِ کار تھے جو محرمِ کار　　　ایک دن ان کو جمع کر اک بار
مصلحت جو ہوا کہ کیا کیجے　　　کچھ مجھے اس کا مشورہ دیجے
کیونکہ سر سے ٹلے یہ رُسوائی　　　تب انھوں نے یہ بات ٹھہرائی
یعنی اوباشِ کوچہ و بازار　　　کچھ نہ کچھ آ کے اس[4] کو دیں آزار
اس پہ گو سیکڑوں ستم ہوویں　　　پر نہ بدنام اس میں ہم ہوویں
جب یہ ٹھہری تو کودکانِ شریر　　　ساتھ لے کر کے اپنے جمع کثیر
یک بیک اس جوان پر دھائے[5]　　　لڑکے کیا آئے اک بلا لائے
سنگ ساری کسی نے اُس پر کی　　　خاک باری کسی نے اُس پر کی
کوئی اس سے بہ قہرِ پیش آیا　　　طعنہ زن کوئی تمام نیش آیا
کوئی تلوار سے ڈرانے[6] لگا　　　اس پہ برچھی کوئی چلانے لگا
ہاتھ کھینچا کسی نے اس کا بزور　　　کوئی غصّے سے آیا بر سرِ شور

1۔م : لطف گاہے کہے تامّل کر　2۔ م : وہ کرے گا　3۔ م : جو برا ہے　4۔ م :اس کو دیویں آزار
5۔ دھانا = حملہ آور ہونا　6 ۔ م : ڈرانے

کوئی بولا کہ یاں سے اُٹھ جا بے سانگ لایا ہے تو یہاں کیا بے
کچھ کسی نے کہا خشونت سے اور[1] کوئی بولا راہِ شفقت سے
اس کو دونوں کی کچھ نہ تھی پروا کہ وہ زنہار آپ ہی میں نہ تھا
تھا زخود رفتہ اس کی یاد کے بیچ ہوگیا تھا گم اتحاد کے بیچ
گرچہ[2] تھے سر پہ اس کے حشر بپا پر نہ دیکھے تھا ٹک وہ سر کو اُٹھا
پیش چشم اس کے اس پری کا خیال اور غمزے کی کافری کا خیال
لبِ خامش سے گفتگو اس ساتھ اس خرابی[3] پر آرزو اس ساتھ
گہے[4] پانو پہ سر کو دھر دیتا گہے چٹ چٹ بلائیں ہیں لیتا
کبھی کہتا کہ میں ترے قرباں آرزو ہی میں جاوے میری جاں
کبھی[5] کہتا کہ غرفے میں آ تو اپنا دیدار پھر بھی دِکھلا تو
جان آنکھوں میں آئی ہے میری تو بھی بے اعتنائی ہے تیری
گھر میں جا بیٹھتے ہیں پردہ نشیں پر نہ ایسے کہ پھر نکلتے نہیں
پاسِ[6] الفت کی راہ رکھتے ہیں بام و در پر نگاہ رکھتے ہیں
ہاتھ غرفے سے گر نکالتے ہیں اس سے افتادہ کو سنبھالتے ہیں
کبھو کرتے ہیں بن بہ شکلِ پری بسرِ صحن بامِ جلوہ گری
کبھو روزن پہ رکھ کے چشمِ سیاہ دور تک پھینکتے ہیں تیرِ نگاہ
دیکھتے ہیں کسی غریب کا حال اور دکھاتے ہیں اس کو اپنا جمال
سو تو ان باتوں کا نہیں یاں ناؤں شہر سونے پڑے ہیں اپنے بھاؤں
نے کوئی آشنا نہ ہمدم ہے ہے جو ہمدم تو بس ترا غم ہے
ایک تو ہوں میں زیست سے بیزار تس پہ کھینچوں ہوں سیکڑوں آزار

1۔ م: کوئی بولا جو راہِ شفقت سے 2۔م: گرچہ تھا 3۔ م: اس خرابے میں
4،5۔ م: کبھو 6۔ م: پاسِ الفت سے

کوئی آکر مجھے ستاتا ہے کوئی تیغ و تبر دکھاتا ہے
کوئی آمادۂ ملامت ہے کوئی نشتر زنِ شناعت[1] ہے
کوئی مجھ سے مکاں چھڑاتا ہے دوست کا آستاں چھڑاتا ہے
کوئی کہتا ہے، ہے یہ سودائی یاں سے بہتر ہے اس کی بے جائی
ایک جاں اور اضطراب ہیں[2] یہ مجھ پہ دن رات اب عذاب ہیں یہ
تو ہی بتلا کہ میں کدھر جاؤں موت آتی نہیں کہ مر جاؤں
ہجر میں بس کہ جی سے تنگ ہوں میں اپنی ہستی کا اب تو ننگ ہوں میں
بام پر آکے تک نظارہ کر سوے تیغ نگہ اشارہ کر
کہ مرا کام بس تمام کرے میرا قصہ ہی انصرام کرے
کب تلک ان اذیتوں کو سہوں کب تلک ان مصیبتوں کو سہوں[3]
چاہ کی ہوگئی ہے پردہ دری رہ نہ پردے میں تو بھی رشکِ پری
کہ نہایت تبہ ہے حال مرا تجھ سے چھٹتا نہیں خیال مرا
آہ کب تک جیا کروں غمگیں صبر کرتا پہ کیا کروں کہ نہیں
رات دن اس کا جو یہ ڈھنگ رہا کچھ نہ پھر پاسِ نام و ننگ رہا
کھنچ گئی اس کی طولِ رسوائی پر نہ غرفے میں وہ پری آئی
قصہ مشہور ہوگیا اس کا نہ رہا حسن و عشق[4] پر پردا
یعنی افشا ہوا یہ سینہ فگار ہے اسی نازنیں کا عاشقِ زار
نت سوے غرفہ ہے نگاہ اس کی برق سی کوندتی ہے آہ اس کی
منھ نہیں موڑتا جفاؤں سے ربط ہے اس کو جی[5] کے جایوں سے
وارث اس نازنیں کے دیکھ یہ حال لائے سو سو طرح[6] کے دل میں خیال

1۔ شناعت = طعنہ 2۔م : ہے 3۔ م :میں رہوں 4۔ م :عشق میں
5۔ م : دل کی چاہوں 6۔ م : طرح سے

جب نہ بن آئی اور کچھ تدبیر یہی[1] سوجھی کہ اب بلا تاخیر
یاں سے لے جاکے اس صنم کے تئیں چندے پوشیدہ رکھیں اور کہیں
طور پر اپنے واں یہ زیست کرے پھر یہ دلدادہ یاں جیے کہ مرے
پار دریا کے اک ٹھکانا تھا ان کا کوئی وہاں یگانا تھا
ان سے اور اُن سے تھی شناسائی دوستی، یکدلی و یک جائی
اعتمادِ یگانگت بھی تھا اتحادِ موانست بھی تھا
شعلۂ مہر جب ہوا روپوش اور شب آئی ہو گلیم بدوش
اک محافے میں کر سوار اُسے ساتھ دایہ کے بھیجا پار اُسے
کہہ دیا یوں کہ یاں یہ رشکِ بہار ان دنوں رات دن رہے تھی نزار[2]
خودبخود اس کے دل پہ غم تھا کچھ بے جہت[3] متصل الم تھا کچھ
دن کو بستر پہ زار رہتی تھی شب کو اختر شمار رہتی تھی
خواب اور خور میں آگیا تھا قصور اس کو تبدیل تھا مکاں کا ضرور
اس لیے ہم نے اس کو واں بھیجا کہ بیاباں کی راس آئے ہوا
مثلِ گل اس کا وا ہو غنچۂ دل ٹلے چھاتی سے اس کی غم کی سِل
لطف اُٹھائے ہوائے صحرا کا دیکھے واشد حباب دریا کا
کر محافے میں اس پری کو سوار لے چلی جب وہ دایۂ مکار
جوں ہی باہر وہ رہ گزر سے ہوا گزر اس کا جواں کے سر سے ہوا
بوے انس اس کو اس سے آہی گئی اس کی آنکھ اس کی گھات پاہی گئی
دل میں اس کے قلق نے جوش کیا سر پہ بے صبری نے خروش کیا
واں سے پاے ثبات اُکھڑنے لگا متصل سر پہ ہاتھ پڑنے لگا
عشق کہتا تھا تو نہ ٹل یاں سے جذب کہتا تھا چل نکل یاں سے

1۔ م : یہی سوچے 2۔م :نزار 3۔ بے جہت = بے سبب 4۔م: مکان ضرور

سمجھے [1] وہ جو غلامِ الفت ہے — کشف [2] ادنیٰ مقامِ الفت ہے
دلِ آگہ نے دی یہ اس کو خبر — کہ محافے میں ہے وہ رشکِ قمر
اب ترا اس گلی میں کام ہے کیا — تو بھی ہمراہ ہو بہ رنگِ صبا
جس طرف جاوے یہ [3] اُدھر جا تو — دیکھ ناداں فریب مت کھا تو
یہ سمجھ جب یہ اس کے سات ہوا — موردِ چشمِ التفات ہوا
دل میں دہشت [4] کہ کیا کہے کوئی — جی پر آفت کہ چشم خوں روئی
ساتھ اس کے یہ دردمند سفیر — کششِ دل کی پانو میں زنجیر
دایہ دہشت [5] سے پیش و پس نگراں — پیچھے دایہ کے قطرہ زن یہ جواں
سر بہ زانو محافے میں وہ پری — جوں قفس میں ہو کوئی کبکِ دری
دل [6] پہ گھر چھوٹنے کا اس کے ملال — اور رسوائیوں کا اپنی خیال
کہ یہ کیا افترا بندھا مجھ پر — زہر کھا کون مر گیا مجھ پر
میری آنکھوں نے کس کو خویش کیا — میری پلکوں نے کس کو ریش کیا
کس پہ خواہش [7] کی کی نظر میں نے — چھوڑا کس کے سبب سے گھر میں نے
کس سے میں آہ ہم کلام ہوئی — کس سے نظّارہ بازِ بام ہوئی
کس سے میں نے کیا پیام و سلام — کس کی الفت میں میں ہوئی بدنام
کس سے غرفے میں [8] میں لڑائی آنکھ — کس کو روزن سے میں دکھائی آنکھ
چاکِ پردہ سے میں نے جھانکا کب — میری ویرانی کا ہے کچھ بھی سبب
یہ عجب خانماں خرابی ہے — کہ نکلنا بہ ایں شتابی ہے
اسی صورت جواں [9] بھی غم دیدہ — بہ خیالِ محالِ پیچیدہ
چشم در رہ کہ از [10] برائے خدا — دے محافے کا پردہ باد اُٹھا

1۔ م : سچ ہے 2۔ م :اس کا 3۔ م : وہ 4,5 ۔ م : وحشت 6۔ م : دل میں
7۔ م :خواہش سے 8۔ م : سے 9۔ م : جوانِ غم دیدہ 10۔ م : کز

دیکھے تا روے ماہ پردہ نشیں   جس کی خاطر اذیتیں[1] یہ سہیں
کھول دے گو نہ اس کا منھ سارا   اک جھلک کا تو ہووے نظارہ
تھا محافہ وہ ڈوریوں سے کھنچا[2]   اس میں دشوار تھا گزارِ صبا
نہ رہی جب کہ اس میں طاقتِ صبر   جیب پھاڑا بہ مرگ حضرتِ صبر
رکھ کے نالہ بہ طرحِ سوز و گداز   یوں قرینِ محافہ دی آواز
کاے پری چہرہ، اتنی روپوشی   اس سے گزرا میں ہاے خاموشی
نہ تو آواز ہی سناتی ہے   نہ تری بو ہی مجھ تک آتی ہے
ہے گھٹا ٹوپ یا محافہ ہے یہ   ٹک تو پردہ اُٹھا دے غیرتِ مہ
کہ بھلا اک جھلک تو میں دیکھوں   تیری نتھ کی ڈلک تو میں دیکھوں
خوبرو کرتے ہیں تغافل سب   پر نہ اتنا کہ ہو وہ عینِ[3] غضب
داغ ہے انتظار آنکھوں میں   خون ہے جانِ[4] زار آنکھوں میں
تجھ کو اپنی ستمگری کی قسم   تجھ کو غمزے کی کافری کی قسم
قسم اپنے تجھے تغافل کی   قسم اپنے تجھے تجاہل کی
حرف زن اپنے دردمند سے ہو   گرم اے آتش اس سپند سے ہو
سن کے دایہ یہ اس کی طرزِ کلام   ہو مخاطب بہ التفاتِ تمام
پاس اس کو بلا کے آہستہ   یوں لگی کہنے کاے جگر خستہ
یاس کو دے جواب گھر جاوے   دردِ حرماں سے کہہ کہ مر جاوے
آہ و نالے سے کہہ کہ رخصت ہوں   گرم رفتارِ راہ[5] فرصت ہوں
کیونکہ نزدیک ہے زمانِ وصال   ہجر تھا سو ہوا وہ خواب و خیال
اب کوئی دم کو ہم وفاقی[6] ہے   دیر منزل تلک کی باقی ہے

1۔ م: مذلتیں 2۔ م: کسا 3۔ م: محض 4۔ م: جانِ یار 5۔ م: راہِ فرقت
6۔ ہم وفاقی = وصال

جب کہ منزل پدید ہووے گی　　شب تری روزِ عید ہووے گی
بس اب[1] اس رنج و غم کو جانے دے　　دور دور اس صنم کو جانے دے
شب کو مل ہی رہے گا تو اس سے　　اب کنارہ ہی خوب ہے اس سے
کیونکہ ہے اس میں خوفِ[2] بدنامی　　تو چلا چل ابھی بہ ناکامی
اک ذرا اب تو دل کو ڈھارس دے　　چل کے منزل پہ جامِ عشرت لے
تیرے آنے سے یہ صنم ہوئی شاد　　کیونکہ ملنا ترا تھا اس کی مراد
جی سے چاہے تھی ہمرہی تیری　　اس کو رستے میں یاد تھی تیری
بارے اس کو بھی دل کی داد ملی　　حق سے مانگی تھی جو مراد ملی
پیچھے پیچھے تو کیا بجا آیا　　مثلِ سایہ جو یوں لگا آیا
غرض اس کو لگا کے باتوں میں　　ہوئی یہ[3] دشمنی کی گھاتوں میں
جی میں ٹھانی کہ کچھ دغا کیجے　　سر سے اس بدبلا کو وا کیجے
کیجے رستے ہی میں کام اس کا　　گو کہ وعدہ ہے تا بہ شام اس کا
غافل از کار یہ ستم دیدہ　　تھا جو باتوں میں اس کی گرویدہ
اس کو ہرگز در اشتیاقِ وصال　　نہ رہا کچھ فریبِ زن کا خیال
الحذر مکر و حیلۂ زن سے　　خاصہ مکارہ اور پُر فن سے
ہیں جو دلّال پیشگانِ شریر　　بازی کھاتا ہے ان سے چرخ[4] اثیر
زورِ رستم نہ چل سکے جن پر　　عشق بازوں کی کیا چلے ان پر
اسی مذکور پر یہ تھا سب[5] گوش　　کہ ہوا سامنے سے بحر کا جوش
آئی رخشندگیِ آبِ نظر　　عرصہ خشکی کا رہ گیا کمتر
حاملانِ محافہ، یعنی کہار　　یوں چلے جلد جوں نسیمِ بہار

1۔ م : آبس اب　2۔م :خوف بدنامی　3۔ م : وہ　4۔ چرخ اثیر = بلند آسماں
5۔ سب گوش = مراد ہمہ تن گوش

رکھ کے چالاکیِ طبع اوپر — لا رکھا گرم اس کو ساحل پر
ساتھ دایہ کے وہ جوانِ زار — جس طرح قافلے کے پیچھے غبار
تھا جہاں بحر پر محافہ دھرا — قطع رہ کر کے واں بھی آ پہنچا
بحر کیا تھا کہ اژدہاے سیاہ — جس کی صورت سے خوف کھائے نگاہ
قطرہ ہر ایک اس کا طوفاں خیز — موج بحرِ بلا کی لنگر ریز
شکل ساحل دہاں دریدہ نہنگ — عرصہ نظموں کا ہر حباب پہ تنگ
سوس و گھڑیال اس میں دوش بدوش — سر بسر اضطراب جملہ خروش
شکلِ دستِ دعا ہر ایک صدف — سر چھپائے ہوئے سپر میں کشف
لطمہ ساحل پہ تیغ زن ہر بار — موجِ آب اس کی افعی خونخوار
چاہِ زنداں تھا اس کا ہر گرداب — جس میں ڈوبے تھے کتنے خانہ خراب
دیکھ اُن کو عبور کا مائل — کشتی اک آلگی تہِ ساحل
پیش و پس اس پہ سب سوار ہوئے — سب سے آگے محافے دار ہوئے
دایہ کشتی میں دیدہ بازِ حباب — اور محافے میں وہ پری بے تاب
شورِ دریا سے اس کے دل میں بیم — غنچہ جیسے صدف میں دُرِ یتیم
دور پر [1] کچھ جوانِ دلدادہ — جیسے تصویر ششدر استادہ
دایہ مصروف سیرِ آبِ رواں — ہم شگافوں سے وہ پری نگراں
پہنچی کشتی جو بیچ میں یکبار — ہوئی سرگرمِ حیلہ وہ غدار
امتحاناً بروے سطحِ آب — یعنی کفش اس پری کی پرتاب [2]
تھا جو منظور اس کا جاں لینا — پھر یہ بولی کہ ''ہاں میاں لینا''
ہاتھ سے اس کے کی جو کفش نے جست — لیا موجوں نے اس کو دست بدست
ہوئی جا کر بزیرِ آبِ رواں — خاتمِ دستِ پنجۂ مرجاں

1۔ م : وہ 2۔ پرتاب کرنا = چمک دکھاتا

قعرِ دریا میں جب کہ جا پہنچی سیپ کے سر پہ پشتِ پا پہنچی
ہو کے وہ کفش تاجِ فرق حباب ہوگئی پل میں گوہرِ نایاب
تھا جواں بس کہ سخت دلدادہ ہو کے ناگہ بہ مرگ آمادہ
کفش پر کر دراز اپنا ہاتھ آشنایانہ کودا ہاں کے ساتھ
کودتے ہی چلا گیا تہ کو طے کیا عمقِ آب کی رہ کو
کفش کے ساتھ ہی گیا تہِ آب ہو کے غوّاص گوہرِ نایاب
گوہرِ جاں نثار کفش کیا نہ ذرا انتظار کفش کیا
کفش ساتھ اپنے اس کو لے ڈوبی نہ غلط بلکہ پا کی محبوبی
نہ وہ اُچھلا، نہ کفش ہی اُچھلی خلق [1] حیرانِ کار اس کی رہی
کودے ہرچند غوطہ خور بھی واں نہ ملا آب سے کچھ اس کا نشاں
جان لینے پہ عشق کے ہے مدار یہ ہی شیوہ ہے اس کا آخرکار
کون عاشق ہوا کہ مر نہ گیا کس کا چاہت کے بیچ گھر نہ گیا
کرسکے کون عاشقوں کا شمار اس کے ہاتھوں موئے پڑے ہیں ہزار
قیس سے اس نے یوں سلوک کیا خون ووں کوہکن کا جا کے پیا [2]
کس کی طاقت کہ ہو بغور نگاہ اس کی طرزِ فریب سے آگاہ
کرچکی دایہ جب کہ اس کا کام پر مشوّش ہوئی وہ ماہِ تمام
خاطرِ دایہ گرچہ جمع ہوئی پانی پانی وہ رشکِ شمع ہوئی
لیک تھا اختیارِ دایہ زبس اس کو سوجھی نہ غیرِ ضبطِ نفس
واں سے کشتی رواں ہوئی فی الفور کہ کہیں کچھ بلا نہ آوے اور
لے گئے پار [3] اس صنم کو شتاب رہی حسرت [4] میں اس کی چشمِ حباب
لہریں خمیازہ کھینچ کھینچ موئیں مچھلیاں غم سے ہمکنار ہوئیں

1۔ م: عقل 2۔ م: لیا 3۔م: اس صنم کو پار شتاب 4۔ م: حیرت

آب نے دل ہی دل میں کھایا جوش لبِ ساحل بھی رہ گیا خاموش
گرچہ وہ حیلہ گر ہوئی خرّم کشتی والوں کو تھا پر اِس کا غم
یہ نہ سمجھے کہ عشقِ خانہ خراب جمع کرتا ہے وصل کا اسباب
اسی صورت سے وہ بھی منھ کو چھپائے اس پری کو بھی زیرِ آب بلائے
دے کے رجعت میں جامِ مدہوشی دیوے پھر رخصتِ ہم آغوشی
طرح ہو زیرِ آب خلوتِ[1] وصل یوں میسّر ہو اس کی صحبتِ وصل
یہ حمائل کرے دو دست اس کے چومیں دو لعل مے پرست اس کے
لب سے لب کامیاب ہوں تہِ آب دوستی کے حساب ہوں تہِ آب
اس کی محنت کشی کی دیوے داد اس کی خود کامیوں سے ہووے شاد
ہو کے روپوش جب[2] وہ غیرتِ ماہ رہی یک چند واں بحالِ تباہ
ایک دن دایہ سے کہا آکر مجھ کو اکثر رہے ہے دردِ جگر
یہ مکاں بھی نہ سازوار[3] ہوا دل مرا یاں بھی بے قرار ہوا
گھر کو لے چل کہ جس کا تھا خطرا اب تو وہ مدعیِ[4] جاں نہ رہا
ساری اس کے سبب تھی یہ آفت وہ نہیں اب تو کیا ہے پھر تہمت
کوئی اب اس کا داد خواہ نہیں اس کی باتیں اسی کے ساتھ گئیں
کون جانے ہے وہ کدھر کو گیا مر گیا یا کسی نگر کو گیا
اس[5] کا اب جی میں تو نہ لا وسواس طبعِ نازک کا میری پر رکھ پاس
کیونکہ اب دل پہ اک اذیت ہے درد ہے، رنج ہے، مصیبت ہے
کیوں ہے یاں دل مرا نہیں لگتا وہ ہی وحشت ہے اور وہی سودا
ہے سراسیمگی وہی دنبال ہے وہی زیست اپنے[6] جی کا وبال

1۔ وحشت = حیرت 2۔ م :وہ جو 3۔ سازوار = سازگار
4۔ مدعی جاں نہ رہا جان کا دشمن نہ رہا 5۔ م : اس سے 6۔ م : میرے جی

پانو کہتے ہیں راہِ صحرا لے ہاتھ کہتے ہیں جیب سودا لے
بیکلی ہے تمام[1] میرے تئیں کچھ ہوا صبح و شام میرے تئیں
دل[2] پہ کوہِ گرانِ غم سا ہے پہلوے دل میں کچھ الم سا ہے
پر نہیں ہیں کہ اُڑ کے گھر جاؤں جی رُکا آئے ہے کدھر جاؤں
کچھ تو تدبیر میری کر تو شتاب مٹی[3] جاتی ہوں ورنہ مثلِ حباب
سفرِ دور کی ہے قاصدِ جان تیرے صدقے یہ میرا کہنا مان
سن کے دایہ یہ بولی کاے طنّاز ''ناز پر تیرے صدقے اہلِ نیاز''
ہوں میں آمادۂ تہیۂ کار اتنے کرتی ہے مجھ سے کیوں اصرار[4]
سچ ہے اب تو مٹی یہ[5] بدنامی اور سراپا زمانِ ناکامی
دل کو خوش رکھ کنارہ کر غم سے اب ملایا تجھے اب و عم سے
پوچھنے جوتگی[6] سے جاتی ہوں تیری خاطر محافہ لاتی ہوں
ملیو تو شاد شادماں سے پری کیجیو ہمدموں میں جلوہ گری
یاں تو مضمون دایہ تھا کچھ اور عشق کا واں کنایہ تھا کچھ اور
عشق سے کب کوئی بسر آوے ریو[7] رنگ اس کا کیا نظر آوے
کون سمجھے ہے اس کی بات کو ہاے کون سمجھے ہے اس کی گھات کو ہاے
اس کے مخفی چلن ہیں سب سے جدا اُن سے واقف نہیں سواے خدا
اس کی گرمی سے پاے سنگ گداز ہوئے صرفِ نیاز صاحبِ ناز
جاں دو قالب کی ایک اس سے ہو بد ہو یا کارِ نیک اس سے ہو
ہے فریبندگی کی[8] اس میں روش نہیں زلفِ پری میں ایسی کشش
جس کو اس نے بہ زیرِ دام لیا اس نے ناکامیوں سے کام لیا

1۔ م :مدام 2۔ م : سرپہ 3۔ م : تکرار 4۔ م : تکرار 5۔ م : وہ بدنامی
6۔ جوتگی = جوتشی 7۔ ریو = فریب 8۔ م : ہی اس کی

نہیں عشاق کش ہے یہ جلاد — اس سے معشوق بھی گئے ناشاد
نہ بچا کوہکن سے تا شیریں — ساتھ خسرو کے دی سُلا شیریں
مرگِ لیلیٰ کو گاہ سبقت دی — قیس کو چند روز مہلت دی
الغرض یاں کے قافلے میں ہمیش — حسن اور عشق دونوں ہیں پس و پیش
ان کو باہم جدا نہ جانے کوئی — مطلقاً بے وفا نہ جانے کوئی
بے وفائی وفا کا کام ہے یاں — کج ادائی ادا کا نام ہے یاں
مردہ ان کا ہے زندۂ جاوید — نا امیدی ہے یاں تمام امید
ہجر میں وصلِ جاودانی ہے — ہجر عاشق کی زندگانی ہے
حاصل اس سے کہ دایۂ غدار — واں سے چلنے پہ جب ہوئی تیار
صبح[1] نے اپنے منھ کو مل لی خاک — مہر نکلا ولے گریباں چاک
لے محافہ چلے وہاں سے کہار — آئے دریا کے متصل اک بار
لبِ ساحل پہ جب کہ آ پہنچے — غرقہ بولا ”مری دعا پہنچے
انتظارِ تو می کشم تہِ آب — غرقۂ بحرِ ہجر را دریاب“
بے قراری[2] جو موج پر آئی — گریہ مژگاں کی اوج پر آئی
دیکھ دریا کو رو دیا اس نے — صبر اپنا ڈبو دیا اس نے
ہوا کشتی پہ جب محافہ سوار — دایہ اس کی جو تھی امانت دار
اس سے پوچھا کہ ”دایہ سچ بتلا — کس مکاں پر وہ خستہ ڈوبا تھا
کفش پھینکی تھی تو نے کس جاگہ — مجھ کو لے چل ذرا تو اس جاگہ
میں بھی دیکھوں وہاں[3] کی شورشِ آب — اور وہ مردم[4] ربائیِ گرداب
کفش پر میری جی دیا اُس نے — یا الٰہی یہ کیا کیا اُس نے

1۔ م : صبح ہے اپنے منھ کو ملتی خاک 2۔ م : بیقراری میں 3۔ م : تو واں
4۔ م : یہ مرادم رسم تہِ گرداب

یہ ترنگ اس کے جی میں کیا آئی　کہیں ہوتے ہیں ایسے سودائی
کفش میں ایسی کیا کرامت تھی　کفش والی تو میں سلامت تھی
اس کی نادانی جی کھپاتی ہے　اب کوئی دم[1] کو جان جاتی ہے
پھر بدل کر زبان بہ ناز و ادا　بولی وہ نازنیں ہوا سو ہوا
دایہ موجوں کا پیچ و تاب تو دیکھ　اور یہ زنجیرۂ حباب تو دیکھ
کیا ہی جاتا ہے تیز آبِ رواں　ہم نے دیکھا نہ تھا کبھی یہ سماں
آہ جاتے تو پردہ پوش تھے ہم　شرمِ بیگانہ سے خموش تھے ہم
اب جو پردہ ذرا اُٹھایا ہے　دل نے ذوقِ نظارہ پایا ہے
دل کشا سطح آب کی ہے فضا　ٹھنڈی لگتی ہے کیا ہی جی کو ہوا
کاش کشتی کھڑی کریں اک دم　تا نکالوں میں اپنے جی کا غم
دایہ غافل تھی از ادائے کلام　ہنس کے کہنے لگی کہ ''سیم اندام''
دیکھ لے اس جگہ وہ ڈوبا تھا　میں یہیں تیری[2] کفش پھینکا تھا
کفش کے ساتھ ہی ہوا[3] تھا وہ غرق　کفش میں اس میں کچھ رہا تھا نہ فرق
یہ ہی اس کی مقام و منزل ہے　موج اس کی نشانِ ساحل ہے''
سنتے ہی یہ سخن وہ پا بہ رکاب　گر پڑی اس جگہ پہ جوں سیماب
ساتھ اپنے نہ دایہ نے جاں لی　راہِ[4] شہر و دیارِ جاناں لی
غوطے پانی میں متصل کھائے　حسن نے طرفہ جلوے دکھلائے
موجیں آغوش ہو کے آ لپٹیں　لٹیں بالوں کی تا قفا لپٹیں
ڈوبتے ہی بہار لایا حسن　آب بر روے کار لایا حسن
نظر آئے بہ دیدۂ نُظار[5]　گوہر ترسے اس کے دو رخسار

1۔ م : دم میں　2۔ م : کفش　3۔ م : ہوا وہ غرق　4۔نُظار = حاضرین

دیکھ اس مہ کی روشنی تہِ آب　　ہوئیں یکبار ماہیاں بے تاب
دستِ رنگیں جو اس کا تھا دلکش　　دی لگا اس نے اور بھی آتش
مار و کژدم کنارہ گیر ہوئے　　حلقۂ زلف میں اسیر ہوئے
جذبۂ عشق ہو کے راہ نما　　اس کو بھی زیرِ آب لے ہی گیا
الغرض زندگی سے سیر ہوئی　　مردہ عاشق کو پہنچی لیک موئی
مردہ با مردہ ہمکنار ہوا　　وصل دریا میں ایک بار ہوا
گرچہ علمِ شنا کے ماہر کار　　دست و پا مارتے رہے ہر بار
لیکن اس کا کہیں نشاں نہ ملا　　لیا دریا نے اس گہر کو چھپا
دایہ مایوس واں سے گھر آئی　　کہتی یہ حرف ''وائے رسوائی''
ماجرا تھا جو کچھ کیا اظہار　　تب تو اکٹھے[1] ہو اس کے خویش و تبار
پدر و مادر اور ہمسایے　　آبِ دریا پہ قطرہ زن آئے
اشک ریزاں کوئی، کوئی نالاں　　کوئی خاکِ سیہ بہ رو مالاں[2]
کوئی دامن تلک گریباں چاک　　کوئی حیرانِ بازیِ افلاک
لبِ ساحل پہ ازدحام ہوا　　اتنے میں جوں تلاشِ دام ہوا
دام دار آئے دام بر سرِ دوش　　حلقے ان داموں کے تمام آغوش
از پے صیدِ ماہیِ سیمیں　　پہنچے جاکر کے تا بہ قعرِ زمیں
دو ہم آغوش دام میں نکلے　　پکّے اپنے وہ کام میں نکلے
لب سے لب آشنائے بوسہ بہ ذوق　　ہاتھ دونوں کے دو گلوں کے طوق
ساقِ پا ساقِ پا سے پیچیدہ　　یک دگر عضو عضو گرویدہ
سینہ سینے کے ساتھ شیر و شکر　　جس میں خالی ذرا نہ جائے نظر
دام پہنچا جو زیرِ آب تلک　　کیا کہوں تم سے اس گھڑی کی جھلک

1۔ م: آگر　　2۔ خاکِ سیہ بہ رو مالاں = چہرے پر خاک ملے

نظر آئے وہ دونوں ماہِ منیر جیسے اک آئنے میں دو تصویر
دیکھ اس واقعے کو پیر و جواں دیر تک واں کھڑے رہے حیراں
تھی جدائی بہم ز بس دشوار سب نے ناچار ہو کے آخر کار
خاک میں یا ملا دیا ان کو آگ میں یا جلا دیا ان کو
مصحفی بس زباں درازی بس آفریں ہے مقامِ ضبطِ نفس
مجھ سے یہ مثنوی ہوئی جو تمام رکھا بحر المحبت اس کا نام
قصہ ہے ایک اور دو نامے جیسے اک شخص کے ہوں دو جامے
میر صاحب نے پہلے نظم کیا میں نے بعد ان کے ریز پرز لیا
ایک دو ریز پرزِ جاں افروز ہوا نایاب نامۂ گلدوز
کچھ نہیں ہے مرقعِ تصویر ہے مرقع و لے لباسِ فقیر
جیسے میروں میں شان ہے کچھ اور ہم فقیروں میں شان ہے کچھ اور
ہے توقع کہ صاحبِ انصاف مجھ کو اس گفتگو میں رکھیں معاف

کچھ مرے حق میں خیر و شر نہ کہیں
نہ کہیں بد بھی نیک گر نہ کہیں

☆☆☆☆

مثنوی جذبۂ عشق

عشق ہے جوہرِ محیطِ جہاں — عشق ہے جسمِ آدمی میں جاں
عشق ہے کائنات کا مفہوم — گر نہ ہو عشق تو ہیں سب معدوم
عشق ہے شمعِ انجمن افروز — عشق سے ہے یہ گرمیِ شب و روز
عشق سے ہے زمین کا کوہاں — تا قیامت بہ زیرِ بارِ گراں
عشق سے کوہ پائے بر جا ہے — عشق سے اضطرابِ دریا ہے
عشق سے آسماں ہے سرگرداں — عشق سے ہے یہ گردشِ دوراں
عشق سے ہے سرِ فلک پُر شور — عشق سے جن و انس کا ہے ظہور
عشق سے ہے دوامِ عالم کا — عشق سے ہے نظامِ عالم کا
عشق ہے باعثِ قوامِ جہاں — عشق ہے چاشنیِ شیرۂ جاں
عشق سے آبِ بحر جاری ہے — عشق طوفانِ بے قراری ہے
عشق ہے آشنائے خستہ دِلاں — عشق ہے مدّعائے خستہ دِلاں
عشق سے ہے محبتِ زن و مرد — عشق ہے درمیاں میں جوہرِ فرد
عشق سے دل میں درد ہوتا ہے — عشق خود آہِ سرد ہوتا ہے
عشق سے سینہ چاک ہے گُلِ صبح — عشق سے ہے فغانِ بلبلِ صبح
عشق سے ہے فروغِ لالۂ باغ — عشق سے سینۂ چمن ہے داغ
عشق سے یار ہووے بیگانہ — عشق ہر شمع کا ہے پروانہ
عشق سے آشنا نگاہ ہوئی — عشق سے دل کو دل میں راہ ہوئی

عشق سے کافر آ کے ہو دیندار　عشق سے پہنے اہلِ دیں زنّار
عشق سے دیدہ ہو تماشائی　عشق سے جاوے عقل و دانائی
عشق سے خونِ مردہ کھاوے جوش　عشق سے ہوشیار ہو بے ہوش
عشق میں گبر بھی مسلماں ہے　عشق عاشق کا دین و ایماں ہے
عشق وہ ہے بلاے خانہ خراب　جس سے طاقت کا زہرہ ہووے آب
عشق وہ زخمِ تیغ خوش خم ہے　جس کا الماس سو وہ مرہم ہے
عشق سے ذوقِ کوچہ گردی ہے　عاشقی اور پاے مردی ہے
گرچہ جلادِ عشق ہے سفاک　قابلِ عشق کب ہے ہر ناپاک
عشق کب لب کی تیغ مارے ہے　عشق عاشق کا سر اُتارے ہے
عشق میں مرد سر لگاتے ہیں　عشق میں جی پہ کھیل جاتے ہیں
عشق سے قیس سر پٹک کے موا　عشق سے کوہکن کا خون ہوا
عشق گر جی کسی کا لیتا ہے　اس کو پھر جان تازہ دیتا ہے
زندہ و مردہ زندہ ہے عاشق　پر وہ جو عاشقی میں ہو صادق
عشق ہے جانِ طالب و مطلوب　عشق ہے جذبِ جاذب و مجذوب
عشق کے جذب ہیں بچندیں طور　وہ ہی سمجھے جو دیکھے کر کے غور
نے فقط خس کو اینچ[1] لیتا ہے　عشق لوہے کو کھینچ لیتا ہے

بر سرِ مطلب اب میں آتا ہوں
عشق کا جاذبہ سناتا ہوں

آغازِ داستان

خاکِ دہلی میں اک جوانِ حسیں　صاحبِ وضع، صاحبِ تمکیں

1۔ اینچ لینا = کھینچ لینا

تھا شکار خدنگ کاریِ عشق | دل میں رکھتا تھا بے قراریِ عشق
رات دن اشک جاری رہتے تھے | اس کی چشموں سے چشمے بہتے تھے
دل میں رکھتا تھا بسکہ پنہاں درد | گلِ سرخ اُس کا ہوگیا تھا زرد
گرچہ تھا جوہری وہ پاک نژاد | عشق تھا اس میں جوہرِ فولاد
عاشقِ زار اپنی زن پر تھا | بلبل اس خانگی چمن پر تھا
نہ وہ زن تھی رقم جواہر کی | کیا کروں وصف حسن و زیور کی
حسن ایسا کہ کہیے لُعبتِ چیں | نور ایسا کہ جو نہ ہووے کہیں
سطحِ سینہ تھا مثلِ آب تنک | چھاتیاں اس میں دو حباب تنک
رنگ کندن سا جو دمکتا تھا | جس میں جوبن پڑا جھلکتا تھا
دی تھی یہ نازکی نے اس کو بہار | جس سے ہر عضو اس کا تھا گلزار
پنجہ مرجاں سے باج لیتا تھا | گل سے عارض خراج لیتا تھا
کیا کہوں غبغب اور گلو کی صفا | جس کا روکش نہ تھا یدِ بیضا
بسکہ ساعد میں تھی صفائے بلور | باج دیتی تھی جس کو ساعدِ حور
دیکھ کافر کی شوخیِ رفتار | دنگ رہتے تھے مردمِ بازار
اس کی چتون کی وہ نگاہ تھی قہر | جس کو کرتا سلام سارا شہر
تس پہ وہ برچھیاں نگاہیں تھیں | جس سے مژگاں تمام آہیں تھیں
تھی وہ اس خوبی و صفا کے ساتھ | ہوتی میلی نظر سے جس کی گات
دیکھ وہ اس کے گوہرِ دنداں | تھا بہت اپنے کام میں حیراں
جاکے بیٹھے تھی لعل سے لب پر | لعل سے اُٹھ گئی تھی اس کی نظر
گھر سے بازار تک اگر جاتا | دو قدم چل کے واں ہی پھر آتا
اس کے بن دیکھے رہ نہ سکتا تھا | رات دن اس کے منھ کو تکتا تھا

دل نہ لگتا تھا جب کہ اور کہیں
قبلہ کرتا تھا اس صنم کے تئیں

گاہ پانو پہ سر کو رکھ دیتا
گاہ چٹ چٹ بلائیں ہی لیتا

گاہ جاتا لپٹ گلے سے وہیں
چومتا گہ لب اور گاہ جبیں

گہ جھٹک ہاتھ کو بٹھا دیتا
گہ لپٹ کر اُسے لِٹا دیتا

گاہ کرتا وہ جو کہ ہے دستور
چومتا گاہ نرگسِ مخمور

گاہ اس لب سے بوسے پاتا تھا
گاہ دشنامِ تلخ کھاتا تھا

دل سے کاڑھے تھا اپنے عشق کے جوز
اس طرح محوِ حسن تھا شب و روز

عشق کی طبع میں مدارا تھیں
گالی کیا دھولیں بھی گوارا تھیں

عرصہ کرتا تھا بس کہ اس پر تنگ
دیکھ زن اس کی چاہتوں کے ڈھنگ

گاہ ناخوش تو گاہ خوش ہوتی
گاہ ہنستی تو گاہ پھر روتی

اس سے کہتی کہ کیا بلا ہے تو
کیوں بلا سا بھلا لگا ہے تو

جوں جوں اس سے لگا چلا جاتا
وصل میں ہجر کا مزہ پاتا

بحرِ الفت میں تھا جو یکسر غرق
وصل اور ہجر میں نہ پایا فرق

وصل کی اس پہ جو گھڑی گزری
ساعتِ ہجر سے کڑی گزری

مثلِ ماہی کے گرچہ تھا تہِ آب
پر نہ تھا اس کی تشنگی کا حساب

دن بہ دن چاہ بڑھتی جاتی تھی
مرگ دیکھ ان کو مسکراتی تھی

لیک فارغ ز فتنہ سازیِ چرخ
غافل از کارِ حیلہ بازیِ چرخ

عیش و عشرت میں پا کے ان کے تئیں
کیا دونوں پہ چشمِ بد نے کمیں

یوں جدائی اگر نہ ٹھہرائی
سببِ ہجر موت ہو آئی

زوجۂ جوہری تھی نرمِ اندام
پنبہ لیتی تھی اس سے نرمی وام

گر ہو اس بدن کو لگ جاتی
برگِ گل کی طرح وہ تھرّاتی

نازکی کے سبب سے زہرہ جبیں پانو رکھتی نہ تھی بہ روے زمیں
کبھی گر چلتی جوں نسیمِ بہار تہِ پا اس کے سبزہ تھا سرِ خار
اس نے جب خوب سا فشار[1] دیا اس نے گرمی میں آ بخار کیا
لب پہ تب خالے یوں ہوئے اس دم جس طرح برگِ گل پہ ہو شبنم
ووں ہی کمھلا گئی وہ جیسے پھول گئی کمھلا کے اپنی سدھ بدھ بھول
حال اپنا سبھوں کو دکھلا کر بسترِ غش پہ گر پڑی جاکر
چشمِ بیمار اس کے ہو کے نزار بن گئی رشکِ نرگسِ بیمار
حلقے آنکھوں کے سب نکل آئے دیدے کچھ بے خطر اگل آئے
رنگ ہلدی سا ہو گیا پیلا چہرہ آنے لگا نظر نیلا
گلِ عارض پہ پھر گئی سبزی زہرِ الفت نے یہ سرایت کی
اس کی ماں، بہنیں اور ہمسائیں دیکھ کر اس کو سخت گبھرائیں
کوئی بولی کہ اس کو سکتہ ہوا کوئی بولی کسی نے سحر کیا
کوئی بولی کھڑی تھی کوٹھے پر پڑ گئی ہے کسی کی اس پہ نظر
کوئی بولی پری کے سایے تلے آگئی ہے کہیں یہ بال کھلے
کوئی بولی بلاؤ سیانے کو کوئی بولی اسے فلیتہ دو
کوئی بولی کہ دوڑ ہی جاؤ مرچیں جاکر کہیں پڑھا لاؤ
کوئی بولی کہ صدقہ دو فی الحال کوئی بولی دکھاؤ جاکر فال
کوئی بولی کہ بید کو لاؤ اِس کی ناڑی تو اُس کو دکھلاؤ
الغرض تھی بہت یہ ہانک پکار نہ کھلے تھا کسی پہ یہ اَسرار
کہ یہ نازک بدن جو کمھلائی یک بیک اس پہ کیا بلا آئی

1۔ فشار دینا = بھیچنا

بس کہ ہے نت مزاجِ حسن غیور نہیں راضی بہ یک نظارۂ دور
نہ کہ یہ اختلاط چسپاں ہو یک دگر دامن اور گریباں ہو
وہ جو خلقت میں زن ہیں نرم اندام جامِ صحت سے کم ہیں مے آشام
دیکھ شوہر نے اُس کا حال زبوں کیا آنکھوں کو غرقِ لجۂ[1] خوں
جو دوا بھی کسی نے بتلائی ووں ہی بازار سے وہ منگوائی
فال جاکر کہیں دکھاتا تھا نقش لکھوا کہیں سے لاتا تھا
کبھی باھمن[2] سے پوچھتا کہ یہ ماہ آ گیا کیوں کسوف[3] میں ناگاہ
کبھی رمال[4] کے کنے جاتا اُس سے ہر بار قرعہ پھنکواتا
کبھی جوگی کوئی جو پاتا تھا گھر میں لاکر اسے دکھاتا تھا
بہرِ تیمارِ آں مہِ دلکش تھی بہت اس کی گیر پا[5] آتش
الغرض جو جتن تھے سب وہ کیے لیک بیمارِ مرگ کیونکہ جیے
بعد یک چند وہ زنِ بیمار اسی حالت میں مر گئی اک بار
طائرِ رُوح کر گیا پرواز ہو گیا صعوہ صیدِ چنگل باز
صرصرِ مرگ ناگہاں آئی چمنِ حسن میں خزاں آئی
چہرہ اس کا جو رنگ میں تھا ورد[6] ہوگیا بر مثالِ لالہ زرد
دستِ رنگیں جو اس کا تھا دل کش دی لگا اس نے اور ہی آتش
دُرِ دنداں میں وہ صفا نہ رہی چشم و ابرو کی وہ ادا نہ رہی
ہوگئی چشم سے نظر رخصت چھا گئی اس میں صورتِ حیرت
غنچے فندق کے تھے سو مرجھائے پھول رنگِ حنا کے کمھلائے
کر کے پا بوس اُٹھ گئی رفتار ہاتھ ملنے سے رہ گئے اک بار

1۔ لجۂ خوں = خون کی ندی 2۔ باھمن = برہمن 3۔ رمال = علمِ رمل کا ماہر، جیوتشی
4۔ رمال = علمِ رمل کا ماہر، جیوتشی 5۔ گیرپا = پاگیر 6۔ ورد = گلاب

بن گئی جعد اس کی صورتِ آہ ہو گیا روز زلف کا بھی سیاہ
گات میں اس کی وہ نہ لوچ رہا نورِ مہ دیکھ اس کو سوچ رہا
اور سے اور ہوگئی صورت بن گئی جیسے کاٹھ کی مورت
دیکھ یہ شکل اس کی آخرِ کار تھے عروسی جو اس کے ہار سنگار
سن کے فریاد گریہ وزاری صَرفِ ماتم ہوئے بیک باری
بن گئی میلِ [1] سرمہ صورتِ ماہ ہوگیا روز زلف کا بھی سیاہ
سر پہ مسّی نے اپنے ڈالی خاک برگِ پاں نے کیا گریباں چاک
پڑے آویزۂ طلائی ٹوٹ لی ووں ہی اُربسی نے چھاتی کوٹ
بالیاں کانوں سے جو لی تھیں اُتار چشم حیراں بنی تھی نرگس وار
گونج سے کھا کے دل پہ نیشِ الم نتھ کا حلقہ تھا حلقۂ ماتم
تھے کرن پھول وہ جو مثلِ چراغ غمِ فرقت میں ہوگئے تھے داغ
جھومکے وہ جو جگمگاتے تھے سرِ افسوس کو ہلاتے تھے
یک طرف دست بند بازو بند حلقۂ غم میں تھے اسیرِ کمند
یک طرف کانوں کی وہ چودانیں [2] پڑی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں
آنکھیں چھلّوں کی بھربھر آئی تھیں دل پہ بانکوں نے بانکیں کھائی تھیں
انگلیاں ہوگئی تھیں یوں عریاں جیسے شاخیں گلوں کی وقتِ خزاں
وہ جو ہوتا ہے زیور اک اُدراج [3] سر بسر لٹ گیا تھا اس کا راج
دیکھ چمپا کلی کو خوں روتی سر پٹکتے تھے مانگ کے موتی
تھا جو تعویذ سر کے بالوں پر کسی کونے پڑا تھا خستہ جگر
چاند رہتا تھا وہ جو زیبِ زمیں نعلِ ماتم بنا تھا ہو کے حزیں
آرسی تھی جو رونقِ ابہام [4] بن گئی تھی وہ غم سے داغ تمام

1۔ میلِ سرمہ = سرمے کی سلائی 2۔ چودانی = کان کا زیور 3۔ اُدراج = ایک زیور 4۔ ابہام = انگوٹھا

جگنی جگنو سی جو چمکتی تھی   اشکِ خوناب ہو ٹپکتی تھی

تھے کڑے ہاتھ کے جو ہیرہ نما   پیس کر کھا گئے تھے وہ ہیرا

جوڑی اک اور تھی جو شیر دہاں   دستِ شیر اجل سے تھے نالاں

کر کے پانو کی انگلیوں کو جو یاد   بچھوے کرتے تھے دمبدم فریاد

تس پہ اَنوٹ[1] کا تھا جو حال زبوں   ہوگیا تھا برنگِ حلقہ نگوں

گلِ ماتم کھلے تھے شاخ بہ شاخ   مرکیوں کے ہوئے تھے دل سوراخ

نے وہ توڑے رہے تھے نے وہ چھڑے   روتے تھے لگ بہم گلے سے کھڑے

جیسے کنگن گیا تھا ہاتھ سے چھوٹ   موتیوں کی پڑی تھی مالا ٹوٹ

وہ جو پانو کی اس کے تھی خلخال[2]   سوکھ کر ہوگئی تھی رشکِ ہلال

اس سوا اور بھی تھا جو زیور   میرے حدِّ شمار سے باہر

اس کے ماتم میں گرم شیون تھا   سینہ ہر اک کا شکلِ روزن تھا

زر و زیور کو جب ہوا یہ غم   اور کھنچا دور نازنیں ماتم

گھر میں اس جوہری کے دھوم پڑی   تھی جو غم کی گھٹا وہ جھوم پڑی

پہنچی گھر گھر برادری میں خبر   کہ گئی آج اس کی جورو مر

تھیں زنیں قوم کی جو پیر و جواں   آئیں سر پیٹتیں بہ آہ و فغاں

سر سے چادر اُتار کر روئیں   ہو کھڑی داڑھیں مار کر روئیں

سن کے مردوں نے بھی سر اپنا دھنا   جب خبر گو سے حرفِ کال[3] سنا

تھے جو واں خویش و قوم یکدیگر   چلے کپڑے پہن کے اس کے گھر

بڑے چھوٹے بہ رسمِ قومِ ہنود   آکے دروازے پر ہوئے موجود

اتنے میں ارتھی کا جو تھا ساماں   لے کلاوے سے تا بہ بیڑۂ پاں

ہوا حاضر دوں ہی بیک باری   کی اُٹھانے کی اس کے تیاری

1۔ انوٹ = پاؤں کا ایک زیور   2۔ خلخال = پازیب   3۔ حرف کال = موت کی خبر

ڈال ارتھی پہ اُس پری رُو کو	سرو گل رویتِ سمن بو کو
لے چلے کر کے جب کہ اطلس پوش	یک دگر خویش و قوم دوش بدوش
نالہ فریاد دل خراشی تھی	آنسوؤں سے گلاب پاشی تھی
دمبدم رام رام ست کی صدا	جائے تھی تا بہ گنبدِ خضرا
قدم اس دھج سے ان کے پڑتے تھے	گویا بخت اور اجل سے لڑتے تھے
اس کی ارتھی کو چار دن پراّں	لیے جاتے تھے مثلِ تختِ رواں
پہنچے جمنا سے جب کہ ہوکر پار	بیچ مرگھٹ کے با دلِ افگار
اس دم اس نازنیں کو نہلا کر	غوطے پانی میں کتنے دلواکر
ڈھیر میں لکڑیوں کے رکھوایا	آگ دی اور اُن کو بھڑکایا
شعلہ اک گرم آسماں کو گیا	نہیں معلوم وہ کہاں کو گیا
بعد شعلے کے اک دھواں سا اُٹھا	اس زمیں سے وہ آسماں سا اُٹھا
کیا کہوں میں غرض وہ رشکِ قمر	ہوگئی جل کے ووں ہی خاکستر
آگ نے جو اُسے جلایا تھا	اپنے تئیں شعلہ اک بنایا تھا
یعنی حسن اس کا آگ میں جو ملا	آگ کا شعلہ تھا یدِ بیضا
آگ کی لو جو اس کی لٹ کو لگی	وہ بدن سے لپٹ کے اس کے جلی
گرچہ خود شمع تھی وہ جانا نہ	جل گئی لیک مثلِ پروانہ
شوہر اس کا کپار کریا[1] کر	یکدگر جب نہا کے آیا گھر
آکے بیٹھا خمش بہ شکلِ حزیں	تھا اسی کا خیال اس کے تئیں
تھے جو اعیال دے تسلی کر	گئے سب اُٹھ کے اپنے اپنے گھر
شب نہ گزری کہ دل اُدھر جو کھنچا	جا کے بستر پہ وہ مریض گرا
بارے جوں توں بہ تعزیت داری	صرف جو تھا بحالِ بیماری

1۔ کپار ,کریا/ کپال ,کریا= مُردے کو آگ دے کر اس کی کھوپڑی پھوڑنا

تھی جو اس کی رسوم، ماتم کی ۔۔۔ بارہ دن تک وہ رسم پیہم کی
تیرھواں دن ہوا جوں ہی یکبار ۔۔۔ آئی پھر ووں ہی مرگِ عاشق زار
کیا کہوں اس جواں کا میں احوال ۔۔۔ عشق تھا بس کے اس کے نت دنبال
جوں ہی ماتم سے ٹک فراغ ہوا ۔۔۔ سینہ فرقت سے داغ داغ ہوا
سو بھی فرقت سو کس مصیبت کی ۔۔۔ ہو نہ امید جس سے وصلت کی
جی رُکا جان پر بلا آئی ۔۔۔ جی میں مرنے کی اپنے ٹھہرائی
اپنے یاروں سے یوں کہا جاکر ۔۔۔ اک غریبی سے ہوگی دست بسر
کہ میں ہوتا ہوں تم سے رخصت آج ۔۔۔ ہے مرے دل پہ داغِ حسرت آج
اپنے معشوق پاس جاتا ہوں ۔۔۔ تم سے یہ بات کہہ سناتا ہوں
مجھ کو اب زیست خوش نہیں آتی ۔۔۔ نظر آتی ہے جان ہی جاتی
ہے خبر شرط کہ چلا تم سے ۔۔۔ کہیو جو پوچھے ماجرا تم سے
کہہ کے یہ بات اپنے گھر کو گیا ۔۔۔ تھا جدھر روے دل اُدھر کو گیا
آکے اس خواب گہ میں با دلِ زار ۔۔۔ تان چادر کو سو رہا یکبار
کھنچ گئی روح جانبِ محبوب ۔۔۔ ہوگئے ایک طالب و مطلوب
نہ جدائی کا کچھ رہا دھڑکا ۔۔۔ ہو گیا صبحِ وصل کا تڑکا
اس میں سوتے ہوئے جو دیر ہوئی ۔۔۔ بولی ماں یوں اُسے جگاؤ کوئی
اک نے جاکر کے جوں ہی منھ کھولا ۔۔۔ نہ ہلے لب نہ منھ سے کچھ بولا
مردنی رُخ پہ آشکار ہوئی ۔۔۔ دوڑیو دوڑیو پکار ہوئی
اک تو ماتم سرا وہ خود گھر تھا ۔۔۔ ماتم اک اور بھی ہوا اس جا
دیکھ اس جوہری کا مردہ جمال ۔۔۔ ہوگیا سب جواہروں کا یہ حال
نیلم اس غم سے داغِ درد ہوا ۔۔۔ رنگ پکھراج کا بھی زرد ہوا

ہو کے ماتم میں اس کے اشکِ افشاں خاک پر لوٹا گوہرِ غلطاں
سرخ یاقوت تھے سو خوں روئے موتی سب اشک آب گوں روئے
تھا جو وہ تانبڑا بحالِ تباہ ہو گیا رنگِ سرخ اس کا سیاہ
رنگ لہسنیے[1] کا سیاہ ہوا کھا کے فیروزہ زہرِ غم کو موا
سر پہ اپنے صدف میں ہو غمناک ڈالی دُرِ یتیم نے بھی خاک
کوفت غم کی جو تھی کمیدک[2] پر جلوہ کرتا تھا وہ برنگِ دگر
اشک مونگوں کے کچھ نہ تھے گلگوں یعنی ہیرے کا بھی جگر تھا خوں
جس طرح اشک صرف سے ہمراہ خوں کی اک پٹھ نمود ہو ناگاہ
روئیں سر جوڑ موتیوں کی لڑیں عقد[3] رشکوک ٹوٹ ٹوٹ پڑیں
تھا جو الماس کا بڑا دانہ آپ وہ زہر کا تھا پیمانہ
کہ اُسے پی کے ووں ہی مرجاوے قصّہ کوتہ کرے گزر جاوے
لعل لوٹیں تھے خوں میں جوں بسمل چنّیوں کے چھدے پڑے تھے دل
یشم[4] کی تھی جو واں کوئی تختی بن گئی تھی وہ لوحِ بدبختی
سن کے یہ ماجرائے جاں کاہی رنگِ یاقوت زرد تھا گاہی
تھی ترازو جو وزنِ گوہر کی چھاتی کرلی تھی اس نے پتھر کی
لیکن اس گل کا جب یہ حال سنا سوکھ کر غم سے ہوگئی کانٹا
سب جواہر کو تھا جو اس کا غم بن گئے تھے وہ صورتِ ماتم
پتھروں کا ہو جب یہ حال تباہ آدمی کیونکہ ہو نہ جامہ سیاہ
الغرض جب خبر یہ سب کو ہوئی کہ موا وہ بھی جس کی جورو موئی
سن کے اس واقعے کو پیر و جواں شکلِ تصویر رہ گئے حیراں

1۔ لہسنیا = ایک قیمتی پتھر 2۔لمیدک = غالباً کوئی قیمتی پتھر 3۔عقدِ رشکوک = موتیوں کی لڑی
4۔ یشم = سبز رنگ کا ایک قیمتی پتھر

بڑے چھوٹے سب اس میں گھبرائے تھے جو نزدیک ووں ہی گھر آئے
کوئی بولا کہ زہر کھا کے موا کوئی بولا کہ یہ تو قہر ہوا
سن کے اس ماجرے کو آخر کار ہوگیا بند جوہری بازار
جوہری سارے ہو کے خستہ جگر تیرھویں دن پھر آئے اس کے گھر
گھر سے مردے کو اس کے اُٹھوا کر اَرتھی کو ہاتھوں ہاتھ لے جا کر
اسی صورت بشکل زود از زود جا کے مرگھٹ کے بیچ کر کے فرود[1]
اس کو بھی آگ کے حوالے کیا ہر نے استخواں نے نالہ کیا
آگ میں جس طرح جلے ہے شمع جل گیا یہ بھی واں میانِ جمع
سچ ہے یاں عشق کی ہے وہ آتش جس کا شعلہ ہے تند اور سرکش
ذرّہ اس کا پڑے جو خارا پر جل کے ہوجائے وہ بھی خاکستر
آئے پھر گھر کو خویش و بیگانہ جل گئے تھے جو شمع و پروانہ
قصہ یہ شہر میں ہوا مشہور آیا سب کی زباں پہ یہ مذکور
بات مجھ تک بھی یہ جوں ہی پہنچی حد کڑھا اس گھڑی تو میرا جی
لیک انجامِ عشق تھا جو یہی اس کی ہمّت پہ آفریں میں کہی
عاشقی میں یہ تازہ تھا مضموں میں نے اس کے تیئں کیا موزوں
کوئی عاشق جو اس کو دیکھے گا دیوے گا طبعِ مصحفی کو دعا
کہ عجب قصہ مختصر ہے یہ لعل بل[2] پارۂ جگر ہے یہ

ہوئی یہ مثنوی جو مجھ سے تمام
جذبۂ عشق میں نے رکھا نام

☆☆☆☆

1۔ فرود کرنا = وارد ہونا 2۔ بل = بلکہ

مثنوی در ہجو قومِ شیخ

یہ جو قومِ شیخ ہے اے دوستاں　اس کی بدذاتی کا کیا کیجے بیاں
اس کی بدذاتی ہے سب پر برملا　اس نے دی دریا میں کچھوے کو دغا
اس کی گر تفصیل پوچھے کس طرح　کان رکھ ایدھر بتاؤں اِس طرح
شیخ جی کو کام تھا اک دن ضرور　تھے یہ ساحل پہ مہیاے[1] عبور
کشتی و زورق[2] نہ تھی اس وقت واں　تند جاتا تھا چلا آبِ رواں
تھا کشف اس وقت اک ساحل کے پاس　اس کی خدمت میں کیا یوں التماس
اے برادر پشت پر کر کے سوار　گر لنگھاوے[3] تو مجھے دریا کے پار
بندۂ احسان ہوں تیرا مدام　کیونکہ ہے اس دم مجھے ایسا ہی کام
سن کشف[4] نے یہ کہا حاضر ہوں میں　آپ کی خدمت میں کب قاصر ہوں میں
جب سوار اس پر ہوئے یہ بالضرور　ان کو یہ سوجھی کہ مشکل ہے عبور
جانور آبی ہے گر ہو غوطہ ور　تو مرا پھر یاں ٹھکانا ہے کدھر
پشت ہے اس کی سو ہے لغزش کی جا　بہر گیرائی نہیں کچھ آسرا
تب اُتر کر پشت سے یکبارگی　یوں لگے کہنے کہ سنتا ہے اخی
گر سپر سے تو کرے گردن بروں　اور میں رسّی سے اس کو باندھ لوں
ہو وہ رسّی ہاتھ کی، میرے مہار　تب تو ہوسکتا ہوں ہاں دریا کے پار
تھا کشف از بس کہ غافل از دغا　ان کے کہنے سے بندھایا خود گلا

1۔ مہیاے عبور = دریا پار کرنے کے خواہشمند　2۔ زورق = چھوٹی کشتی　3۔ لنگھانا = عبور کرانا
4۔ کشف = کچھوا

ہو کے جب یہ رخشِ آبی پر سوار کر گئے اک پل میں دریا سے گزار
جا لبِ ساحل پہ بیٹھے شاد شاد دام میں ان کے وہ آبی نامراد
یوں کہا اُس سے کہ آ باہر نکل سیرِ دنیا کر لبِ ساحل پہ چل
دیکھ تو یاں بھی ہے کیا اچھی فضا یاں کی بھی کھا لے کوئی دم تو ہوا
الغرض کچھوے کو ساحل پر نکال باندھ کر رسّی دیا خشکی میں ڈال
جب کشف نے عرض کی بہرِ خدا کیجیے رسّی مری گردن سے وا
کر چکے ہو تم تو دریا سے عبور اب مجھے رکھنا مقید کیا ضرور
تب وہ بولے اس سے یہ دشوار ہے مجھ کو تجھ پر پھر بھی جانا پار ہے
آؤں جب تک پھر کے رہ یوں ہی بندھا گاڑ کر واں میخ رسّی دی لگا
الغرض آتے ہیں یہ تو اب تلک دام میں ان کے موا وہ سر پٹک
دی کشف نے اپنی نادانی سے جاں یہ ہوئے عالم میں مطعونِ جہاں
اپنے محسن پر جو یہ لاوے جفا قابلِ دوزخ ہے ہاں وہ بے حیا
شیخ کی صورت سے اے دل کر حذر یہ مثل کچھوے کی رکھ پیشِ نظر

اس کی باتوں کے فریبوں میں نہ آ
ہاں دغا ہے رے دغا ہے رے دغا

☆☆☆☆

سلام

(1)

مجرا اسے جو صبح جہاں سے سفری ہے
مہماں ہے کوئی دم کا چراغِ سحری ہے

جس چہرۂ پُر نور سے تھی صبح کو خجلت
سو شام کے دفتر میں وہ چہرہ نظری[1] ہے

سر کاٹنے کا قصد ہے آج اس شہِ دیں کے
جو زینت تختِ شہی و تاجوری ہے

روتی ہے ادھر خیمے کی ڈیوڑھی پہ سکینہ
عباس نے کاندھے پر ادھر مشک دھری ہے

جو اشک کا قطرہ ڈھلک آتا ہے لبوں پر
وہ کام میں دکھیا کے عقیق جگری ہے

زینب نے کہا دیکھ کے بلوائے غنیماں
اے صانع قدرت یہ عجب جلوہ گری ہے

جاتا ہے اُدھر مرنے کو جی جایا علیؑ کا
خیمے میں ادھر سرزنی و جامہ دری ہے

تیروں سے چھدی مُشکِ علمدار جب آئی
بولی یہ سکینہ کہ اگر اس میں تری ہے

اک قطرہ کوئی جلد مرے منھ میں چُوادے
اس وقت مجھے شدت سوزِ جگری ہے

یہ واقعہ سن آئی جو زہرا سوئے مقتل
دیکھا تو عجب طرح کی بیدادگری ہے

مذبوح ہے پیاسا خلفِ ساقیِ کوثرؑ
عابد کی اسیری سے اسے بے خبری ہے

اصغر کے گلے میں ہے لگا تیر کا پیکاں
سوفار تلک خون میں تر اس کی سری ہے

اکبر پہ تہی ترکشِ بیداد ہوئے میں
جو بھال بدن میں ہے وہ لوہو سے بھری ہے

تم مصحفیِ خستہ کو ہر غم سے چھڑاؤ
یا ابنِ علیؑ یہ بھی تو اثنا عشری ہے

1۔ نظری = چاک کیا جانے والا

(2)

جب فاطمہؓ کے لال نے حجت تمام کی لائی قضا نوید اسے دار السّلام کی
چشم و چراغ تھا جو مدینے کا اس کا آہ گھر بے چراغ کر گئی فوج اہلِ شام کی
مہمانِ کربلا سے رکھا آب بھی دریغ عزّت یہ کی امام ذوی الاحترام کی
ہو باپ جس کا ساقیِ کوثرؑ ہزار حیف تر ہو زباں نہ پانی سے اس تشنہ کام کی
جو تیر اس ولی کے لگے تھا کہے تھا وہ تدبیر کیا کروں میں اجل کے پیام کی
سر اس کا کاٹ نیزے کے اوپر چڑھا دیا معراج یوں ہوئی شہِ عالی مقام کی
چالیس دن تلک نہ اُٹھایا کسی نے ہائے ماٹی ہی پر پڑی رہی نعش اس امام کی
لائے حرم پر اس کے قیامت یہ پُر جفا پرواہ کی نہ پرسشِ روزِ قیام کی
ہے ہے وہ خاندانِ نبوّت کی بیبیاں جن تک کہ بار تھی نہ ملک کو سلام کی
سر سے چھنائیں ان کے غنیموں نے چادریں حرمت رکھی یہ آلِ محمدؐ کے نام کی
خیمے کو اہلِ بیت کے اس نے جلا دیا جس پر خدا نے آتشِ دوزخ حرام کی
دو مقصد اس جناب سے رکھتا ہے مصحفی ہو عرض یہ قبول شہا اس غلام کی

دنیا میں سرخرو رہے اور روزِ باز پرس
یک جرعہ ملے اسے کوثر کے جام کی

(3)

کہا ہے جس نے جگر بندِ مصطفیٰ پہ سلام جو پوچھو سچ وہ حقیقت میں ہے خدا پہ سلام
علی کا مرتبہ وہ ہے کہ بھیجتے ہیں مدام ملک فلک سے نت اس قبلۂ ہدا پہ سلام
رہے وہ تشنگیِ روزِ حشر سے ایمن کہے جو تشنہ لبِ دشتِ کربلا پہ سلام
وہی حسنؑ جسے الیونیہ نے زہر دیا ہوا ہے فرض اب اس کشتۂ دغا پہ سلام
پڑا ہے چور بدن رن میں جو علی اکبر عجب جوان تھا، اس شکلِ مصطفیٰ پہ سلام

لہو کی مہندی لگے دست و پا میں قاسم کے	وہ مہندی کہتی ہے اب اس کے دست و پا پہ سلام
اسیرِ درد و بلا عابدیں ہے جس کا نام	میں بھیجوں ہوں اسی بیمارِ بے دوا پہ سلام
موا چھدا کے گلا اپنا تیر سے اصغر	روا ہے کہیے گر اس طفلِ بے خطا پہ سلام
ادھر تو دیکھ کہ ہوتا ہے عرش سے نازل	سکینہ تجھ پہ درود اور ترے چچا پہ سلام
اگرچہ مرثیہ گو ہیں بہت زمانے میں	ہوا ہے لیک کسی سے کم اس ادا پہ سلام
اگر قبول کریں اس کو سید الشہدا	کروں ہوں ختم میں اے مصحفی دعا پہ سلام

خدا کرے کہ جو آلِ نبیؐ کے دشمن ہیں
اُنھوں پہ لعن رہے، اس کے اقربا پہ سلام

(4)

اس پر سلام ہو کے جو از قاشِ زیں جدا	زخمی پڑا تھا در صفِ مردانِ دیں جدا
یعنی حسینؑ ابن علی فاطمہ کا چین	ناحق کیا مدینے سے اس کے تئیں جدا
از بس لگے تھے روے مبارک پر اس کے تیر	چہرہ لہو لہان جدا تھا، جبیں جدا
کیوں اے فلک روا ہے جو ہو سر گروہِ دیں	گردن سے ہووے اس کا سرِ نازنیں جدا
تھا جو گلا کہ بوسہ گہِ ختم الانبیاء	ہے ہے وہ یوں ہوا بدمِ تیغِ کیں جدا
تا روزِ حشر تعزیہ دار اس شہید کے	اہلِ فلک جدا ہیں تو اہلِ زمیں جدا
لوح و قلم سے سن کے شہادت کا ماجرا	کرسی جدا بہ گریہ و عرشِ بریں جدا
یکسو فرشتگانِ مقرب ملول ہیں	اور اک طرف خداے جہاں آفریں جدا
خلدِ بریں میں سینہ زنی کا جو شور ہے	رضواں جدا خروش میں ہے حورِ عیں جدا
ہر صبح ماتمِ غمِ باغ رسول میں	نسریں ہے سینہ چاک جدا، یاسمیں جدا
تھا جیب و دستِ فاطمہؓ جس دم گہِ وداع	قاسم نے اپنے ہاتھ سے کی آستیں جدا
دلہن کو یوں وہ دے کے نشانی چلا کہ آہ	جوں جان تن سے ہووے دمِ واپسیں جدا

عابد کے تھا گلے میں جو بارِ گرانِ طوق ق اور اس کے ساتھ سلسلۂ آہنیں جدا
کہتا تھا یوں اسیری میں وہ خستہ یا رسول ہو جاوے کاش تن سے یہ جانِ حزیں جدا
ہے مصحفی کے دل میں کھدا اسمِ یا حسینؑ
ہووے نہ اس نگیں سے یہ نقشِ نگیں جدا

(5)

سلام فاطمہؓ دُکھیا کے بیٹے بے سر پر کہ جس کے خون کے جو ہر بنے ہیں خنجر پر
لب اپنے تر نہ کرو مومنو، محرم میں کہ قحطِ آب ہے ستر دو[1] تن کے لشکر پر
حسینؑ تشنہ لب آبِ فرات پر ہے شہید لگے ہیں تیر و سناں اس شفیعِ محشر پر
جو لوگ شانِ شہادت سے اس کی ہیں آگاہ درود بھیجتے ہیں اس شہیدِ اکبر پر
جنھوں میں عطرِ نسیم و صبا کا دخل نہ تھا سو گرد جم گئی ان گیسوانِ اطہر پر
ہوئے ہیں خویش و برادر تمام قربانی نہ پوچھ کیسی مصیبت ہے ابنِ حیدر پر
ہوا ہے مرتبہ تسلیم کا اسی پر ختم کہ مرتے مرتے وہ راضی رہا مقدر پر
کسے خبر تھی کہ مرجاویں گے سبھی وارث قیامت آوے گی یہ اہلِ بیت کے گھر پر
کٹیں گے شانۂ عباسؓ پانی کی خاطر چلیں گے برچھیاں ہم صورتِ پیمبر پر
شہانے خون سے جوڑا بنے گا قاسم کا لگے گا تیرِ ستم آکے حلقِ اصغر پر
صلائے عام یہ دیوے گا آسماں ان کو کہ میہمانی ہے یاں تیغ و تیر و خنجر پر
لٹیں گے خیمہ نشینانِ محترم سارے پڑے گا ہاتھ غنیموں کا ان کے زیور پر
اب آگے تاب نہیں مصحفی تو رہ خاموش
کہ ہے یہ واقعہ موقوف روزِ محشر پر

(6)

سلام اس پہ کہو جس کا گھر رہا نہ رہا جہاں میں نام رہا گو کہ سر رہا نہ رہا

1۔ ستر + دو = بہتّر (حضرت امام حسینؑ کے ساتھ)

کٹا جو سجدے میں سر اس شہیدِ اکبر کا کہا یہ بار مرے دوش پر رہا نہ رہا
یزیدی قوم سے پھر اس گھڑی یہ فرمایا تمھارے عہد میں اک نامور رہا نہ رہا
عدو کے گھر میں تو روشن ہوا چراغ مراد یہ نورِ دیدۂ خیر البشرؐ رہا نہ رہا
بھروسا کچھ نہیں اب میرے واپسیں دم کا یہ بن رہا ہے چراغ سحر رہا نہ رہا
ملی حسینؓ کی ماٹی میں شکلِ نورانی سپہرِ دین کا روشن قمر رہا نہ رہا
حسن کا بھائی بہ تیغِ جفا کٹا تو کٹا اماں بتولؓ کا لختِ جگر رہا نہ رہا
سفر تمام ہوا کربلا کی منزل میں اب آگے غم نہیں زادِ سفر رہا نہ رہا
خموش مصحفی رتبہ ہے اس جناب کا دور
سخن زباں پہ تری نوحہ گر رہا نہ رہا

(7)

کہتا ہوں تیرا شاہا مجرا سلام کورنش لے میرا دیں پناہا مجرا سلام کورنش
تیرے سوا جہاں میں اب کون ہے کہ لیوے عاصی کا قبلہ گاہا مجرا سلام کورنش
کرتا ہے تجھ کو ہر دم روح الامیں ادب سے اے فخر آلِ جاہا مجرا سلام کورنش
کر پشت خم کرے ہے تجھ کو مہِ محرم ہر شام کج کلاہا مجرا سلام کورنش
کرتے ہیں سر جھکا کر ذرّات خاک تجھ کو خورشید دستگاہا مجرا سلام کورنش
شمشیر و تیر و خنجر کہتے ہیں تجھ کو لیجو حیدر کے کم سپاہا مجرا سلام کورنش
صد آفریں ہے تجھ کو خالق کا اپنے تو نے سر کٹتے تک نباہا مجرا سلام کورنش
نیزے پہ تیرے سر کو جس دم رکھا وہ بولا کر عفو بار الٰہا مجرا سلام کورنش
شانوں سے ہاتھ الگ ہیں گردن مری جدا ہے کیونکر کروں قآہا مجرا سلام کورنش
یہ تیری بندگی میں آیا ہے مصحفی کا
ہووے قبول شاہا مجرا سلام کورنش

(8)

سلام اس پہ خنجر ہے جس کا سلامی   سلام اس پہ سر لے گئے جس کا شامی
جسے تحفہ آتا تھا نت سیب جنّت   کیا قتل اسے دیکھیو ان کی خامی
وہ شہزادہ راکب تھا دوشِ نبیؐ کا   وہ فخرِ علی تھا بہ عالی مقامی
امامِ صفِ غازیاں ہے وہ سرور   ہوئی ذات پر ختم جس کی امامی
کلام اس کا سمجھی نہ حق قومِ باطل   جسے تھی کلام اللہ سے ہم کلامی
بدشتِ بلا اس کو تیروں سے چھیدا   مشبّک [1] بنایا تن اس کا تمامی
غضب ان پہ ٹوٹے کہ ان کافروں نے   غزالِ مدینہ کیا صید دامی
دیا راہِ حق میں سر اپنا خوشی سے   جہاں میں رہی اس کی یہ نیک نامی
کیا صبحِ صادق کو آنکھوں میں تیرہ   گرے ٹوٹ کر اس کے خیموں پہ شامی
قنات اور پردے لٹے ایسے گھر کے   کہ جس گھر کا جبریلؑ تھا اہتمامی
زہے پُر دغائی، زہے پُر جفائی   زہے بے وفائی، زہے ناتمامی

یہ مدّاح جو مصحفی ہے تمھارا
قبول اس کو کیجے شہا در غلامی

(9)

کر کے بابا کے تئیں عابدِ رنجور سلام   روحِ احمدؐ پہ لگا پڑھنے بدستور سلام
نوکِ نیزہ پہ سر اس کشتے کا ہے یہ جس کو   بر سرِ دار کہے تھا سرِ منصور سلام
ہے سعادت مری اس میں کہ لکھوں اس کی ثنا   بر سرِ لوح و قلم جس کا ہے مسطور سلام
آ کے جنت سے زیارت کو تری روز طواف   باندھ کر ہاتھ کریں تھے ملک و حور سلام
تیرے روضے کے کلس میں وہ تجلّی ہے جسے   ہو کے خم کرتی ہے شاخِ شجرِ طور سلام
ہر سحر پنجۂ خورشید سے کرتا ہے فلک   شہِ دیں دیکھ ترا چہرۂ پُرنور سلام

1۔ مشبّک = چھلنی، سوراخ دار

سر جھکائے ہوئے کس واسطے ہے شام وسحر — تجھ کو کرتی نہیں گر نرگسِ مخمور سلام
رہ گیا ہے یہ علم کر کے جو پنجے کو چنار — یہ سبب ہے کہ ترا ہے اسے منظور سلام
چرخِ چارم سے اُتر کر کے کہے ہے عیسیٰؑ — تیرے روضے پہ نت اے سیّد مغفور سلام
جب حضوری میں تری آوے ہے جبیریلِ امیں — قاعدے سے کرے ہے ہو کے کھڑا دور سلام
یہ وہ دربار معلیٰ ہے کہ کرتے ہیں جہاں — سرِ تسلیم جھکا قیصر و فغفور سلام

مدح گو ہے جو ترا مصحفی یا شاہ اس کا
ہووے دولت سے تری مدح کی مشہور سلام

(10)

مجرا اسے جس کشتۂ مغفور کی گردن — یوں کٹ گئی جیسے کسی مجبور کی گردن
کیا ظلم ہوا میرے نکلتے ہی یہ ہے ہے — اس شرم سے خم ہے مہٗ عاشور کی گردن
وہ شانِ شہیدانِ خلف ساقیِ کوثرؑ — جھکتی ہے جہاں قیصر وفغفور کی گردن
سر کٹتے ہی بولا ہے مری عین سعادت — خالق نے مرے گر مری منظور کی گردن
نیزے پہ سر اس شہ کا یہ فخر یہ کہے تھا — اک روز سلامی تھی مری، حور کی گردن
حق یہ ہے جو دیکھے ہے علم اس کو کہے ہے — یہ دار پہ ہے دین کے منصور کی گردن
حیف اہلِ حرم شام کو جاویں بہ اسیری — اور طوق میں ہو عابدِ رنجور کی گردن
بے دینوں کو آئی نہ حیا قتل سے اس کے — اور جھک گئی واں نرگسِ مخمور کی گردن
چاہے ہے کہ دے بوسہ رکابِ شہ دیں کو — خم کی ہے مہِ نو نے جو یہ نور کی گردن
جوں شمع وہ اس غم سے بنی اشک کا پتلا — تھی حورِ بہشتی کی جو کافور کی گردن
لاشے سے عیاں ہووے تھا اس وقت یہ عالم ق جس وقت کٹی اس شہِ مغفور کی گردن
ہاتھ اس کا جدا ہو جیو ساعد سے الٰہی — جس نے کہ مرے تن سے مری دور کی گردن

ہے مصحفیِ زار شہا تیرا سلامی
محشر میں ملے اس کے تئیں نور کی گردن

(11)

سلام کہیے تو ایسا حسینؑ کی خاطر　کہ آوے سننے کو زہراؑ حسینؑ کی خاطر
حسینؑ تشنہ گیا، مومنو، تم آنکھوں سے　بہاؤ رو رو کے دریا حسینؑ کی خاطر
بنا ہے تیر کا پیکاں پے علی اصغر　کھنچا ہے تیغ کا داسا حسینؑ کی خاطر
ستارے ہیں جو سیہ پوش چرخِ نیلی پر　لیا ہے تعزیہ گویا حسینؑ کی خاطر
زبس کہ نالہ وفریاد میں ہیں اہلِ جہاں　زمیں پہ حشر ہے برپا حسینؑ کی خاطر
چراغِ زہرہ و قندیل مہ سے ہے روشن　بنا ہے سب یہ ظہورا حسینؑ کی خاطر
نشانِ جادہ نہیں ہر طرف جو دیکھتے ہو　یہ سینہ چاک ہے صحرا حسینؑ کی خاطر
نہ ہوتا حشر کا گر انتظار عیسیٰ کو　تو آکے تعزیہ لیتا حسینؑ کی خاطر
کہا حسنؑ نے یہ وقتِ وداع قاسم سے　ق　عزیز تھے مجھے بابا حسینؑ کی خاطر
جب اس پہ وقت کٹھن ہو تو پہلے اپنی جان　نثار کیجیو بیٹا حسینؑ کی خاطر

میں کشتہ عشق کا ہوں اس کے مصحفی بخدا
سبیلِ خون ہے میرا حسینؑ کی خاطر

(12)

بعدِ درود کہہ سلام، بعدِ سلام بندگی　یعنی کر اے سلام گو نذرِ امام بندگی
چاہیے اپنا سر بھی واں جوں مہِ نو جھکا رہے　کرتی ہے جس کے پیش طاق خلق تمام بندگی
راضی رضا پہ شہ نے ہو سجدے میں سر کٹا دیا　یعنی کہ ہے قدیم سے بندے کا کام بندگی
تیری جناب میں شہا بھیجیں ہیں تحفۂ درود　کرتے ہیں وہ جو اہلِ ورع ماہِ صیام بندگی
مرتبہ قصرِ جاہ کا تیرے زبس بلند ہے　جھک کے کرے ہے ماہِ نو برسرِ بام بندگی
سارے شہیدِ کربلا تجھ کو ہی سر جھکا جھکا　اُٹھ کے کریں گے خاک سے روزِ قیام بندگی
روضے کو تیری خاک کے اسی نے بنایا سجدہ گاہ　روزِ ازل سے ڈھونڈے ہے اپنا مقام بندگی

دشتِ بلا میں سر کٹا وہ جو ہوئے ہیں بے وطن بھیجے ہے ان کو جبرئیل نام بنامِ بندگی
بندگی تیری فرض ہے بندوں پہ تیرے روز و شب اپنے خدا کی تو نے کی جیسے مدام بندگی
عرض ہے مصحفی کی یہ ہووے قبول شاہِ دیں
لایا ہے اس جناب میں کہہ یہ غلام بندگی

(13)

اس پر سلام تھا جو دل و جانِ فاطمہؓ یعنی حسین مہرِ درخشانِ فاطمہؓ
"واحسرتا کہ تیغ جفا سپہر سے یوں کٹ گیا وہ سرو خرامانِ فاطمہؓ
اب ہاتھ اس کا ساعدِ سیمیں سے ہے جدا کھینچے تھا جو کہ گوشۂ دامانِ فاطمہؓ
بادِ خزانِ شام سے رن میں ہزار حیف برباد ہوگیا گلِ بستانِ فاطمہؓ
کیوں اے فلک روا ہے کچھ انصاف ہے بھلا یوں ہو لہو میں تر تنِ جانانِ فاطمہؓ
کیوں کر یہ حال دیکھ کے ہووے نہ موجزن سیلاب اشک تا بہ گریبانِ فاطمہؓ
رقت کا ہے یہ جوش کہ ہوتا نہیں جدا ٹک آستیں سے دیدۂ گریانِ فاطمہؓ
وحشت سی آ گئی تھی غزالانِ دشت میں یکبار دیکھ کر سرِ عریانِ فاطمہؓ
ہوتا تھا دل نبیؐ کا پریشان اس گھڑی ماتم میں دیکھ موے پریشانِ فاطمہؓ
وہ شمعِ بزمِ نورِ الٰہی کدھر گیا روشن رہے تھا جس سے شبستانِ فاطمہؓ
دشتِ بلا میں دیکھ کے کنبہ کٹا ہوا ہر سمت وا ہے دیدۂ حیرانِ فاطمہؓ
زہرہ نے آ کے لاشۂ شبیرؓ سے کہا کیوں چپ پڑا ہے اے گلِ خندانِ فاطمہؓ
اماں تری پکارے ہے بیٹا تو کچھ تو بول بہرِ تسلّیِ دلِ نالانِ فاطمہؓ
پاوے صلہ سلام کے کہنے کا مصحفی
کس واسطے کہ ہے یہ ثنا خوانِ فاطمہؓ

(14)

اس پر سلام جس کو کہ زہراؑ کی جائیاں کہتی تھیں بھائی ہم ترے مجرے کو آئیاں
دیکھا تو خاک وخوں میں بھری اس شہید کے ہم ساق پا کٹے ہیں پڑے ہم کلائیاں
جس جا جز آبِ تیغ نہ پانی ملا جسے واں اس نے اپنے خون کی ندیاں بہائیاں
جب خنجر جفا سے کشندوں نے ہر طرف سر کاٹ کاٹ لاشیں برابر سلائیاں
لے فاطمہؑ کو سینہ و سر پیٹتی ہوئی حوریں جناں سے تعزیہ داری کو آئیاں
اے چرخ ان سروں پہ تو صدقے نہ ہو گیا تاروں کی جس کو دیکھ کے آنکھیں بھر آئیاں
بہنیں جو تھیں وہ زینب وکلثوم امام کی کیا کیا مصیبتیں نہ اُنھوں نے اُٹھائیاں
لاشے سے شہ کے تھا یہ خطاب ان کا دمبدم اے بھائی ہم اسیر بھی تجھ بن کہائیاں
اونٹوں پہ سر برہنہ کیا ہے ہمیں سوار اور سر سے چادریں بھی سبھوں کے چھنائیاں
روحِ بتوں سے بھی نہ آئی اُنھوں کو شرم دیکھو تو کوفیوں کی ذرا بے حیائیاں
یہ کب روا ہے ہائے جو ہوں عزتِ رسول یوں جاویں شہر شام کو کرتی گدائیاں
نندوں کے منھ سے جوں جوں سنے ہے یہ حرف سوز اُڑتی تھیں شہر بانو کے منھ پر ہوائیاں
شاہا سلام گو ہے تمھارا جو مصحفی
ہوویں قبول اس نے جو بیتیں بنائیاں

(15)

سلامی ترا سب کو ہم دیکھتے ہیں شہا یاں دو عالم کو خم دیکھتے ہیں
قیامت نہ آوے کہ آنکھوں سے اپنی محب تیرے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں
جو سر زینتِ دوشِ خیر النسا تھا وہ سر آج زیبِ علم دیکھتے ہیں
نہ اکبر ہے باقی نہ اصغر ہے جیتا نہ قاسم کا جاہ و حشم دیکھتے ہیں
علمدار تھا وہ جو عباس تیرا سو اس کے بھی بازو قلم دیکھتے ہیں

جب آ پہنچی اس قتل گہ میں سواری تو کیا ظلم اہلِ حرم دیکھتے ہیں
کہ لاشے جو ہیں وارثوں کے پڑے ہیں مقیمانِ صحرا بہم دیکھتے ہیں
کہا تب یہ لاشے سے عابد نے بابا مسافر ہیں ہم کوئی دم دیکھتے ہیں
نہیں منزلِ مرگ اب دور ہم سے ہم اس راہ کو دو قدم دیکھتے ہیں
ولے کیا کریں ناتوانی کے باعث توانائی پانو میں کم دیکھتے ہیں
شفیع جزا بخشیو مصحفی کو
ترے غم میں چشم اس کی نم دیکھتے ہیں

(16)

کہہ سلام اس پہ جو ہے مہرِ درخشانِ علیؓ نو گلِ فاطمہؓ و دوحۂ [1] بستانِ علیؓ
خطِ سبزِ حسنؓ و گیسوے مشکینِ حسینؓ باغِ تطہیر میں ہیں سنبل و ریحانِ علیؓ
کیوں نہ اولادِ علیؓ کا ہو خدا خود مدّاح در مقامے کہ نبیؐ ہووے ثنا خوانِ علیؓ
کربلا میں جو حسینؓ ابن علیؓ جا پہنچا بولی وہ خاک کہ اے بے سرو سامانِ علیؓ
دعوتِ تیغ و سناں ہے تری خاطر تیّار چکھ مزہ اس کا تو اب اے نمک خوانِ علیؓ
اتنے میں بادِ صبا لے گئی جنت کو خبر گر پڑا کٹ کے جو تھا سروِ خرامانِ علیؓ
دیکھے بیٹے کے جو سینے پہ کئی زخم دراز گئے دامن سے گزر چاکِ گریبانِ علیؓ
اور ڈھلا نیل دمِ نزع جوان آنکھوں سے قلزمِ نیل بنے دیدۂ گریانِ علیؓ
روزِ محشر کہ نبی سر بہ گریباں ہوں گے ق ہووے گی خاک مری دست بدامانِ علیؓ
اور کہیں گے کہ خدایا بہ طفیلِ حسینؓ بخش دے مجھ کو کہ ہوں میں ز محبانِ علیؓ
مصحفی میں ہوں وہ مدّاح کہ اس رتبے پر
ہے مرا فخر غلامیِ غلامانِ علیؓ

1۔ دوحہ = درخت

(17)

ملک سب آتے ہوں جس کے سلام کے خاطر
جھکاؤں کیوں نہ میں سر اس امام کی خاطر

بلا حسینؑ نے لی اپنے سر پر امت کی
قسم خدا کی محمدؐ کے نام کی خاطر

یہ کس کا حوصلہ ہے جو بحالِ تشنہ لبی
کٹائے سر کو شہادت کے جام کی خاطر

یہ صبحِ حشر بھلا کیا جواب دیوے گا
فلک نے اب تو رکھی اہلِ شام کی خاطر

بنے ہیں حور و قصور و بہشت و نہرِ لبن[1]
اسی امامِ ذوی الاحترام کی خاطر

جنھوں نے کوچ سفر خواب میں نہ دیکھا ہو
وہ گام گام پہ ترسیں مقام کی خاطر

وہ خیمے ہائے لُٹیں جن کے در پہ روح الامیں
کھڑا رہے تھا سدا اہتمام کی خاطر

وہی نبی کا نواسا علیؑ کا لختِ جگر
شفاعت اس کی ہے بس خاص و عام کی خاطر

کیا خیال نہ زنہار کام دنیا کا
دیا بباد وہ عقبیٰ کے کام کی خاطر

کہے ہے مصحفی اخلاص سے تمھارے سلام ق
نہ بہرِ شہرت و غوغائے عام کی خاطر

جو اس کے دل کے مقاصد ہیں اس کو دو جلدی
شہا، تم اپنے رکھو اس غلام کی خاطر

(18)

جبریلؑ جسے لے کر خالق کا سلام آوے
وہ راہ میں خالق کی کیا ڈر ہے جو کام آوے

جز ابنِ علیؑ یارو رتبہ یہ کسی کا ہے
لے کر کے شہادت کا رضواں جسے جام آوے

جس شخص کے نانا کی عالم سے ہوئی بیعت
ہے ہے اسے فاسق کی بیعت کا پیام آوے

سر آج ہے نیزے پر اس نورِ مقدس کا
خورشیدِ قیامت کو کہہ دو لبِ بام آوے

جس غازی نے کی ہووے ناغہ نہ نمازِ صبح
نرغہ اس کرنے کو یوں لشکرِ شام آوے

صفہائے شہیداں سب ارواح کے عالم میں
اب راہ یہ تکتے ہیں وہ دیں کا امام آوے

ہوں اہلِ حرم قیدی اور حیف کہ یوں عابد
مقتل کی طرف کھینچے اونٹوں کی زمام آوے

1۔ لبن = دودھ

دیتا تھا اسیروں کو جو عید کے دن چھڑوا　ظالم کی اسیری میں گھر اس کا تمام آوے
اے مصحفی میں اس کی کیا مدح کو لکھوں گا
جس کو طرفِ حق سے صلوات مدام آوے

(19)

کہہ سلام اس کو کہ جس کا کربلا مسکن ہوا　خیمہ گاہِ بے کساں اس دشت کا دامن ہوا
شمع کے کٹنے سے سر جوں روشنی ہووے زیاد　اس کے کٹنے سے یوں دینِ مصطفیٰ روشن ہوا
جو کنارِ فاطمہؓ میں پانو کرتا تھا دراز　خواب گاہ اب اسی کا کربلا کا بن ہوا
جو مدینے میں پلا تھا ناز اور نعمت کے ساتھ　ہے غضب اس کا وہ دشتِ کربلا مدفن ہوا
ذوالجناحِ باوفا پر تیر یہ برسے کہ ہائے　ترکشِ پُر تیر اس کے زین کا دامن ہوا
سیم کے حلقے گراں جس گردنِ نازک پہ تھے　یوں گلوگیر آہ اس کا حلقۂ آہن ہوا
اس کے تسلیم و رضا کی آہ حالت کیا کہوں　چور زخمی جب وہ علمِ دین کا مخزن ہوا
زین سب خوں میں بھرا گھوڑا ہوا لوہولہان　تیروں سے پیشانی پھوٹی، سینہ صد روزن ہوا
رات پڑھتا تھا کوئی شاید سلام مصطفیٰ
تعزیہ خانہ میں دل کے زور ہی شیون ہوا

(20)

اُسے مجرا کہ جس کا سر بہ نوکِ نیزہ جاتا تھا　مہ نو آسماں سے دیکھ جس کو سر جھکاتا تھا
لہو میں ڈوبی صورت اس کی شاخِ نیزہ کا گل تھی　گلِ خورشید جس سے منفعل ہو منھ چھپاتا تھا
تکان[1] اس کی سے صدمہ پہنچے تھا اس کاسۂ سر کو　جو خولی چلتے چلتے نوک نیزے کی ہلاتا تھا
یہ سر وہ ہے کہ جس کو فاطمہؓ رکھتی تھی گودی میں　یہ سر وہ ہے جو چھاتی پر نبی کی لوٹ جاتا تھا
یہ سر وہ ہے علیؓ چوما کریں تھے جس کی پیشانی　یہ سر وہ ہے حسنؓ اپنے گلے جس کو لگاتا تھا
یہ سر وہ ہے کہ جس پر پھیرے تھی کلثوم ہاتھ اپنا　یہ سر وہ ہے جو ہر دم پیار زینب کو دلاتا تھا

1۔ تکان = جنبش

یہ سرو ہے جو سجدے میں رہے تھا شب کو خالق کے
یہ سرو ہے جسے بالیں پہ کم آرام آتا تھا

یہ سرو ہے کہ جس کو درد صندل کے بملے ہوتا
یہ سرو ہے کہ جس کو سایۂ گل بھی نہ بھاتا تھا

زہے شوقِ شہادت آپ کٹوایا گلا اپنا
مگر اس سر کو آبِ خنجرِ قاتل سے ناتا تھا

کھلے سر اونٹوں پر وہ بیبیاں روح الامیں جن کا
ہمیشہ پردہ دار و صاحبِ درباں کہاتا تھا

رہے تھے رستے والے دیکھ کر حیران اور ششدر
جب ان بے وارثوں کا قافلہ کوفے کو جاتا تھا

کسی کا خون رہ جاتا تھا دل میں جوش کھا کھا کر
کوئی ان بے کسوں پر خون کے آنسو بہاتا تھا

کوئی رکھتا تھا انگشتِ تاسف اپنے دانتوں میں
کوئی مجرے کو ان کے دور ہی سے ہاتھ اُٹھاتا تھا

زمامِ ناقۂ اول جو دی تھی دستِ عابد میں
وہی اس قافلے کا ناقہ کش اس دم کہاتا تھا

پھپھولے تلووں میں پڑتے تھے ریگِ گرمِ صحرا سے
برہنہ پا غرض اس ریت پر وہ خستہ جاتا تھا

نہ دیتے تھے اسے ضد سے عدو اک قطرہ پانی کا
وہ مارے پیاس کے سوکھی زباں سب کو دکھاتا تھا

کرے کیا مصحفی آگے بیاں اتنی مصیبت کا
کوئی غم عابدِ بیمار کا ہرگز نہ کھاتا تھا

(21)

اس کو مجرا جسے مقبولِ جہاں ہونا تھا
خنجر اس کی رگِ گردن پہ رواں ہونا تھا

کربلا میں گئے اس واسطے مارے شبیر
یعنی اک حشر کا ہنگامہ وہاں ہونا تھا

چاند سے رخ سے حسین ابن علیؑ کے اس جا
شبِ مہتاب کی چادر کو کتاں[1] ہونا تھا

گردشِ چرخ برا ہو ترا سر کو شہ کے
چرخ زن یوں بہ سرِ نوکِ سناں ہونا تھا

طرفہ یہ شام ہے خورشید ہے یاں نیزے پر
شام کے وقت تو سورج کو نہاں ہونا تھا

طفلِ شش ماہہ موا اصغرِ معصوم دریغ
اس بچے کے نہ مقدر میں جواں ہونا تھا

برگِ گل جس سے خجل تھا وہ گلوے نازک
تیرِ بیداد کا حرمل کے نشاں ہونا تھا

ہاے اس بوٹے سے قد کو چمنِ ہستی میں
ننھے پانو سے زمیں پر نہ رواں ہونا تھا

1۔ کتاں = باریک کپڑا جو چاندنی رات میں پھٹ جاتا ہے

سر کھلے شام کو کیوں اونٹوں پہ جاتے ہیں حرم — قافلہ یہ تو مدینے کو رواں ہونا تھا
پردۂ غیب سے سو روز نکلتے ہیں مدام — نہ کہ یہ روزِ قیامت کا عیاں ہونا تھا
نہ کلی کوئی رہی اور نہ کوئی گل اس میں — چمنِ فاطمہؓ تاراجِ خزاں ہونا تھا
جب مہار اونٹوں کی سجاد کو دی رو کے کہا — یوں مجھے ناقہ کشِ عصمتیاں ہونا تھا
پر چلوں راہ میں کیونکر کہ نہیں اُٹھتے قدم — بیڑیوں سے مرے پانو کو گراں ہونا تھا
مومنو، دیدۂ تصویر نہ حیرت سے بنو — بزمِ ماتم میں تمھیں اشک فشاں ہونا تھا
طرح ماتم کی ہر اک گھر میں فلک نے ڈالی — بس کہ پُرشور و شغب کون و مکاں ہونا تھا

مصحفی اشک فشانی سے نکلتا نہیں غم
کھول کر دل مجھے سرگرمِ فغاں ہونا تھا

(22)

سلام اُس پر کہو جو سیّد الشہدا کہاتا تھا — کہ جس کی ڈیوڑھی پر روح الامیں مجرے کو آتا تھا
بیاں کیا اس کی طاعت کا رہا سجدے ہی میں حق کے — گلے پر اس کے ظالم گرچہ خنجر کو چلاتا تھا
علیؓ کا لختِ دل ہے اور نواسا اس پیمبر کا — خدا جس کو کلام اللہ کے آیے بھجاتا تھا
غضب ہے اس کے تن کو خاک پر غلطاں کریں ظالم — جسے پیغمبرِ حق اپنے کاندھے پر چڑھاتا تھا
ستم ہے بن میں چہلم تک رہے لاشہ پڑا اس کا — کہ جو بنتِ نبیؐ کی گود میں آرام پاتا تھا
کرے تعریف کیا حسنینؓ کی اب یہ بشر یارو — کہ جس کی شان میں اللہ آپ آیے بناتا تھا

رہا کر اس کے غم میں چشمِ نم اے مصحفی ہر دم
کہ روزِ قتل جس کے دو جہاں آنسو بہتا تھا

☆☆☆☆

ترویح

بہر ترویحِ سیّد عالم — مصطفیٰ فخرِ دودۂ آدم
بہرِ ترویحِ ابنِ عمِّ رسول — شاہِ دُلدُل سوار و زوجِ رسول
بہرِ ترویحِ کشتۂ الماس — آں کہ وصفش بروں بود ز قیاس
بہرِ ترویحِ سید الشہدا — تشنہ لب میہمانِ کرب و بلا
بہرِ ترویحِ عابدِ غمناک — آنکہ بودش دل از الم صد چاک
بہرِ ترویحِ پنجمیں معصوم — باقر آں آفتابِ چرخِ علوم
بہرِ ترویحِ جعفرِ صادق — راے او صدق و کذب را فارِق[1]
بہرِ ترویحِ موسیٰ کاظم — ملکِ شرعِ رسول را ناظم
بہرِ ترویحِ ضامن آں کہ بود — ذاتِ او حجتے بر اہلِ سند
بہرِ ترویحِ آں تقی کو را[2] — دادہ علمِ کلامِ خویش خدا
بہرِ ترویحِ روحِ پاک نقی — ماہ تابانِ آسمانِ علی
بہرِ ترویحِ عسکری پسرش — آں کہ تاجِ پدر بود بہ سرش
وز براے بقاے ہادیِ دیں — یعنی مہدی امامِ صدر نشیں

پس بخوانید اے عوام و خواص
سورۂ فاتحہ دگر اخلاص

☆☆☆☆

1۔ فارق = فرق کرنے والا 2۔کورا = کہ اورا

مرثیہ

بولو تو کوئی روحِ پیمبرؐ کے واسطے تسکینِ دل کرو مری، حیدرؓ کے واسطے
سر تھا بنا حسینؓ کا افسر کے واسطے یا نوکِ نیزہ و دمِ خنجر کے واسطے

خورشید کی زمیں پہ گری فرق سے کلاہ روزِ سپید چشمِ جہاں میں ہوا سیاہ
پیکانِ تیر دشنہ ہوں کیونکر کروں نہ آہ پیشانیِ مبارکِ اکبرؓ کے واسطے

ماں باپ کا جو طفل کہ ہوتا ہے لاڈلا دیکھیں ہیں چاؤ چوز[1] وہ اس کو کھلا کھلا
کیوں اے فلک روا ہے بنے تکمۂ قبا پیکاں گلوے نازکِ اصغرؓ کے واسطے

کبریٰ نہ کیونکہ آپ کو صرفِ بُکا رکھے ابنِ حسنؓ جب اس سے منھ اپنا چھپا رکھے
یہ بے بسی تو دیکھ بچاری لگا رکھے اس آستینِ چاک کو معجر[2] کے واسطے

دولہا کے غم سے رو رو کے دلہن ہو یوں ہلاک ڈالیں براتی خانۂ ماتم میں سر پہ خاک
سہرا بنے یہ تار گریبانِ چاک چاک قاسم بنے سے سروِ سمن بر کے واسطے

1۔ چاؤ چوز = لاڈ پیار 2۔ معجر = چادر

مصری کی اور نقل کی نہ ٹھیرے وہاں صلاح
شربت پہ خونِ دل کے پڑھا جاے یوں نکاح
رنڈ سالہ لائے اس کو شبِ عقد کی صباح
ساماں یہ ہو حسینؑ کی دختر کے واسطے

پانی نہ وحش و طیر سے ظالم رکھیں دریغ
برسائیں تیر ظلم کا ابنِ علیؑ پہ میغ
واحسرتا کہ دشت میں جاری ہو نہرِ تیغ
اس تشنہ کامِ ساقیِ کوثر کے واسطے

اے واے ہووے اس کے ستارے کا یوں ہبوط[1]
میت کو آبِ صاف میسر ہونے حنوط[2]
پنجے میں آفتاب کے تھا شانۂ خطوط
جس نازنیں کی زلفِ معنبر کے واسطے

مذبوح تیغِ ظلم سے وہ دیں کا شاہ ہو
یوں قافلہ نمازیوں کا رو براہ ہو
تقدیر میں لکھا تھا مگر پایہ گاہ ہو
نیزے کی نوک صاحبِ منبر کے واسطے

دھودیں غبارِ کینہ کو دل سے نہ وہ کثیف
آلودہ خاک وخوں میں ہو وہ جوہر لطیف
عریاں تنی تو دیکھ کہ یوں لاشۂ شریف
محتاجِ گرد دشت ہو چادر کے واسطے

افسوس ہووے شہرِ مدینہ کا جو رئیس
اس طرح اس رئیس سے پیش آویں یہ خسیس
خون اس کا جم کے خاک کے اندر بنے کسیس
پولادِ تیغ چرخ کے جوہر کے واسطے

اے واے جائے تیرِ ستم حلق سے گزر
ہو جاویں شہپر خوں سے لب اس نازنیں کے تیر
اصغرؑ کی ماں کہے تھی یہ اصغر کو دیکھ کر
روتی ہوں اس بچے کے مقدر کے واسطے

1۔ ہبوط = بلندی سے نیچے کی طرف آنا   2۔ ایک خوشبودار مرکب جو غسل کے بعد میت کو ملتے ہیں

پہلے تو آبدیدہ ہوئی چشمِ آفتاب
چاہا یہ صبح نے میں اسے اپنا دوں نقاب
پھر آسماں سے مانگ کے لایا کہیں سحاب
چادر کبود لاشۂ بے سر کے واسطے

چشمِ مقدساں سے نہ کیونکر ہو خوں رواں
پیٹیں نہ کیونکہ سر کو بھلا اپنے انس و جاں
تاروں سے مہرہ دار ہو جب بند کہکشاں
اس بے گنہ شہید کے محضر کے واسطے

نانا کو جس کے آوے الم نشرح و الضحیٰ
بابا کی جس کے شان میں نازل ہوا انما
حیف اس کا انتخاب کرے کاتبِ قضا
سینے کا صفحہ تیغ کے مسطر کے واسطے

صغریٰ تھی گو کہ حال سے بابا کے بے خبر
پر اس کے خود بخود بھرے آتے تھے چشم تر
ہوتا اگر نہ ناقہ سوار اس کا نامہ بر
بصرے کو لکھتی خط وہ کبوتر کے واسطے

وہ سروِ باغ دیں جو قلم ہو کے گر پڑا
ماتم میں اس کے گل نے کیا پیرہن قبا
جا قتل گہ سے بھر کے لے آئی ووں ہی صبا
پیالہ لہو کا لالۂ احمر کے واسطے

کیا دوستو میں تم سے کہوں ظلم اہلِ شام
اب ہے برہنہ خاک پہ خوابیدہ وہ امام
جنت سے فرشِ خواب کو نت جس کے وقتِ شام
پھولوں کی چادر آتی تھی بستر کے واسطے

گیسو تھے جس کے گردنِ خورشید کی کمند
بے سر پڑا ہوا ہے کٹا کر وہ بند بند
کوئی سرہانے اس کے جلاتا نہیں سپند
تارے کُبان[1] جس کے تھے مجمر کے واسطے

1۔ کُبان = لوبان

جس وقت اہلِ بیت کی کشتی تھی بے سکوں
سر تھے حباب اس کے جو بہتا تھا بحرِ خوں
واحسرتا فلک سے ہوئی اس گھڑی نگوں
زنجیرِ کہکشاں بھی نہ لنگر کے واسطے

کہتی تھیں رو رو زینب و کلثوم ہائے ہائے
بھائی ہمارے سیّدِ مظلوم ہائے ہائے
خیمے میں ہر طرف تھی یہی دھوم ہائے ہائے
جب شہر بانو پیٹتی تھی سرور کے واسطے

غارت گروں کو جب نہ رہا کچھ خدا کا پاس
تب بولیاں وہ صاحبِ عصمت بصد ہراس
ہم آپ تم کو دیتے ہیں جو ہے ہمارے پاس
دُکھ دو نہ ہم کو فاطمہؓ اطہر کے واسطے

ان ظالموں نے دستِ ستم جب کیا دراز
اسبابِ خانہ لے گئے سب تا بہ جانماز
ہرگز رکھا نہ آلِ پیمبرؑ کا امتیاز
دیتے رہے وہ ان کو پیمبرؑ کے واسطے

آ اک نے بالیاں ہی سکینہ کی چھین لیں
دلہن کی نتھ کو کوئی لگا کھینچنے وہیں
میں کیا کہوں کہ خیمے میں بیٹھے جو وہ لعیں
کیا کیا ستم کیے زر و زیور کے واسطے

گل غرق خوں تھے دیکھ سکینہ کی خستگی
بندے تلک جو چھنی گئیں بالیاں سبھی
شبنم کی طرح روتی تھی اس وقت وہ بچی
آٹھ آٹھ آنسو کان کے گوہر کے واسطے

رووَیں نہ کیونکہ جن و بشر حور اور ملک
دیکھا نہیں کسی نے بھی یہ ظلم اب تلک
حدّاد[1] ہے وہ کون جو گھڑتا ہے اے فلک
لوہے کا طوق گردن لاغر کے واسطے

۱۔ حداد = لُہار

نیزے پہ دیکھ ہاے سرِ شاہِ مشرقین کرنے لگیں یہ زینب و کلثوم رو رو بین
شایانِ ظلم عالمِ امکاں میں جز حسین کیا کوئی تھا نہ چرخ ستمگر کے واسطے

جس سر کو آج نیزے پہ دیکھو ہو تم رواں یارو یہ سر ہے افسرِ فرّق مقدساں
روزِ نخست آہنِ شمشیرِ کوفیاں شاید ہوا تھا خلق اسی سر کے واسطے

یہ مت کہو کہ خونِ حسینا ہے گو مگو انصاف کی جگہ ہے تم اس دم نہ چپ رہو
بتلاؤ مجھ کو کون سے مذہب میں صاحبو مومن کو ذبح کرتے ہیں کافر کے واسطے

از بس بہ ناؤ نوش[1] رہے صرف صبح و شام بھر بھر پیے فرات سے ان کافروں نے جام
معصوم اہلِ بیت جو خیمے میں تھے تمام بلکا کیے وہ یک نمِ ساغر کے واسطے

جاتا تھا بیکسوں کا جو کوفے کو کارواں مت پوچھ حالِ عابد بیمار و ناتواں
اپنے قدم کا اس کو اُٹھانا تھا حد گراں ہر آبلہ تھا پانو کا نشتر کے واسطے

بے اشک اس مریض کی اک دم نہ تھی پلک کہتا غمِ پدر میں وہ جاتا تھا جوں ملک
مجھ سا شکستہ دل تو نہ ہوگا کوئی فلک شیشے بنے ہیں اور بھی پتھر کے واسطے

آتش کدوں میں آگ جو ماتم رسیدہ تھی ہر موج شعلہ ماہیِ درخوں طپیدہ تھی
اخگر جو تھی سو صورتِ اشکِ چکیدہ تھی مژگانِ گریہ ناک سمندر کے واسطے

1۔ ناؤ نوش = عیش و طرب، رنگ رلیاں، رنگ و نغمہ

ریگِ رواں میں مل کے جو واں بحرِ خوں بہا ۔ طوفاں بلا کے لاتی رہی دمبدم ہوا
روزِ ازل بہ گریہ کفِ خاکِ کربلا ۔ لاشوں کے تھے جزیرے سمندر کے واسطے

ہوتا نہ غرق وہ تنِ خستہ جو جوں شفق ۔ کپڑے سیاہ رنگ پہنتے نہ نہ طبق
آیا جو اپنے جوش میں ان پر عتابِ حق ۔ یک قطرہ بس تھا ظلم کے اخگر کے واسطے

نیزے پہ چرخ زن سرِ ابن بتول ہو ۔ جنت میں کیوں نہ روحِ پیمبر ملول ہو
پیشانیِ مبارکِ سبطِ رسول ہو ۔ صبحِ مراد شام کے لشکر کے واسطے

غم میں پھر اس کے روئے نہ کیوں خلق زار زار ۔ جو اس طرح سے راہِ خدا میں ہوا نثار
دو چار آنسوؤں سے تو نکلے ہے کب بخار ۔ دریا ہی چاہیے مژۂ تر کے واسطے

یا مرتضیٰ علیؑ مری عرضی کو لیجیے ۔ مدّاحِ اہلِ بیت کا اک کام کیجیے
مضطر ہے مصحفی غمِ دنیا سے دیجیے ۔ آزادی اس غلام کو قنبر کے واسطے

رہتا ہے بازپرسِ قیامت کا اس کو ڈر ۔ روزِ عمل ہے اس کا جو سب سے سیاہ تر
ہرگز نہ تم گناہوں پر اس کے کرو نظر ۔ بخشاؤ اس کو شافعِ محشرؐ کے واسطے

☆☆☆☆